اُردو لسانیات

(تاریخ و تنقید کی روشنی میں)

تحقیقی مقالہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اُردو)

۱۹۹۵ء

مقالہ نگار:۔

نعمت الحق

اسسٹنٹ پروفیسر، اردو

نگران:۔

پروفیسر خلیل صدّیقی

معاون نگران:۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

بہاءُ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

اس مقالے کی منظوری ایڈوانسڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ بورڈ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

Gen/Ph.D.-Adv-77/770 مورخہ 22-3-89 کے تحت دی گئی۔

اُردو لسانیات

(تاریخ و تنقید کی روشنی میں)

تحقیقی مقالہ

برائے

پی ایچ۔ ڈی (اُردو)

۱۹۹۵ء

مقالہ نگار:-

نعمت الحق

اسسٹنٹ پروفیسر، اردو

نگران:-

پروفیسر خلیل صدیقی

معاون نگران:-

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

بہاءُ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

اس مقالے کی منظوری ایڈوانسڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ بورڈ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے مراسلہ نمبر Gen/Ph. D.-Adu-77/779 مورخہ 22-3-89 کے تحت دی گئی۔

ترتیب | صفحہ

* * * * * * * *
* * * * * *
* * * *
* *
*

انتساب

ملتان کی دو شخصیتوں کے نام،

جن کی انسان دوستی اور علم دوستی مثالی ھے۔

1۔ علامہ عتیق فکری (مرحوم)

2۔ جناب ابن حنیف ۔

ہے مشقِ سخن جاری ......

.=.=.=.=.=.=.=.=

لسانیات ایک ایسا موضوع ہے جسے پاکستان میں اب بھی خشک ترین موضوع قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جب کہ دنیا میں لسانیات پر اتنی ہی توجہ دی جا رہی ہے جتنی دوسرے سائنسی و سماجی علوم پر۔ ہمارے یہاں ابھی تک زبانوں کے مطالعے کی اہمیت و افادیت کا شعور پیدا نہیں ہوا ہے اس لئے لسانیات پر توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ۔ لسانیات میں میری دلچسپی یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوئی ۔ پروفیسر خلیل صدیقی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں لسانیات پر لیکچر دینے کے لیے کوئٹہ سے تشریف لاتے ہیں۔ مجھے ان کے لیکچروں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا، اور میں نے لسانیات کی مبادیات، مسائل و مباحث اور مناہج مطالعہ کے بارے میں بہت کچھ آگاہی حاصل کی ۔ ایم ۔ اے کے بعد میں نے زیادہ توجہ سے لسانیات کا مطالعہ شروع کیا اور لسانیات میں میری دلچسپی بڑھتی گئی ۔ استاد محترم ڈاکٹر پروفیسر ڈاکٹر اے بی اشرف نے مجھے اردو لسانیات پر تحقیقی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ کسی بھی موضوع سے دلچسپی رکھنا اور کچھ جاننے یا علمی ذوق کی تسکین کے لیے مطالعہ کرنا اور بات ہے اور اس موضوع پر تحقیق کرنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس کے لیے نہ صرف اپنے موضوع کا وسیع مطالعہ ضروری ہے بلکہ مناسب تربیت اور راہنمائی بھی اشد ضروری ہے۔ میں نے اردو لسانیات پر تحقیقی کام کے لیے استاد محترم جناب پروفیسر خلیل صدیقی سے راہنمائی کی درخواست کی ۔ ان کی ہدایات کی روشنی میں اردو لسانیات کا از سرنو مطالعہ کیا اور " اردو لسانیات ۔ تاریخ و تنقید کی روشنی میں " کے عنوان سے پی ایچ ۔ ڈی کے مقالے کے لیے خاکہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان میں پیش کر دیا۔ " رجسٹریشن " اور " کنفرمیشن " کے مراحل طے ہوتے رہے اور میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس دوران میں اپنے موضوع کو اپنے مزاج کے عناصر سے ہم آہنگ کرنے کے مسلسل عمل سے گزرتا رہا، اس لئے کہ جب تک موضوع اور محقق کا مزاج ہم آہنگ

نہ ہوں، تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ مطالعے اور سوچ بچار کا مسلسل عمل ہے جس سے محقق کا موضوع اس کے مزاج کے عناصر سے گھل مل کر ایسی ترکیب پاتا ہے جس سے محقق کو اپنے موضوع پر گرفت حاصل ہوتی ہے اور دریافت کا عمل شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے تو موجود علم کو محض معلوم کرنے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ علم کی نئی دنیاؤں کو دریافت کرنے کا مرحلہ تب شروع ہوتا ہے جب محقق کا مزاج اس کے موضوع سے ہم آہنگ ہو جائے۔

میں استاد محترم جناب پروفیسر خلیل صدیقی کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری راہ نمائی بھی کی اور تربیت بھی۔ میں لسانیات کی مبادیات اور مسائل و مباحث کے بارے میں جتنا کچھ بھی جانتا ہوں، یہ سب انہی کا فیض ہے۔ ان سے علمی مباحثوں کے نتیجے میں مجھے لسانیاتی شعور حاصل ہوا، اور ان سے ہی میں نے لسانیاتی تحقیق کی تربیت حاصل کی۔ میں محترم جناب ابن حنیف کا بھی شکرگزار ہوں انہیں علمی سرگرمیوں میں مصروف دیکھ کر مجھ میں تحقیق کی لگن اور شوق پیدا ہوا۔ محترم جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری جب بھی ملتان تشریف لائے مجھ سے میرے تحقیقی مقالے کے بارے میں دریافت کیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی باز پرس اور کبھی کبھی سرزنش نے میرے تحقیقی کام کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ وہ خود بھی تصنیف و تالیف کا عمل مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں، جو میرے لئے ایک مثال ہے۔ میں پروفیسر ڈاکٹر اے بی اشرف پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد، پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ اور پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ان کی راہنمائی اور شاباش نے ہمیشہ مہمیز کا کام کیا اور میرا تحقیقی کام تکمیل کو پہنچا۔ میرا علمی ذوق، تحقیق کی لگن اور مطالعے کا شوق ان اصحاب کی دین ہے۔ میرے اساتذہ اس نہج پر میری تربیت نہ کرتے تو میں مدرسی کے روایتی چکر میں پھنس کر رہ جاتا۔

اپنے تحقیقی کام کے دوران مجھے ایسی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو اس معاشرے میں رہنے والے کسی بھی محقق کو درپیش ہو سکتی ہیں۔ بھارت سے اردو لسانیات کی کتب کا منگوانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر لطیف الزماں خاں نے میری بہت مدد کی۔ پروفیسر

(بیکن بکس، ملتان) نے بھی میری ضرورت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ میرے عزیز و اقارب جو بھارت گئے وہاں سے میری فرمائش پر کتابیں لائے۔ محترم جناب پروفیسر نصیرالدین صدیقی (مرحوم) نے اپنی نجی لائبریری سے مجھے کتب فراہم کیں۔ میں ان تمام اصحاب کا احسان مند ہوں۔ محمد جمیل قریشی نے پوری توجہ سے میرا مقالہ ٹائپ کیا، میں ان کا شکرگزار ہوں۔

لسانیات کی جولاں گاہ بہت وسیع ہے۔ پاکستان میں اردو زبان میں لسانیات پر کچھ کام ہوا تو ہے لیکن اب نہیں ہو رہا۔ بھارت میں دیگر زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی لسانیات پر کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں لسانیات کے موضوع پر کام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ یہاں کی علاقائی زبانوں اور بولیوں کا لسانیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اردو پاکستان میں رابطے کی زبان کی حیثیت سے تقریباً تمام ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ علاقائی زبانوں سے میل جول کے نتیجے میں اردو اور علاقائی زبانوں میں تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ ذرائع مواصلات بھی اس سلسلے میں خاصا موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ اب ان پڑھ اور جاہل آدمی کی زبان پر بھی انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ آ جاتا ہے۔ کسی ایک شہر میں بھی لسانی اختلاط کی مختلف صورتوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور اہم ہو گا۔ ادبی تنقید نے لسانیات سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا ہے۔ دنیا میں ادب کا اسلوبیاتی اور ساختیاتی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں گوناں گوں لسانیاتی مسائل کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ میرا یہ مقالہ اس سلسلے کا پہلا قدم ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ "ٹیم ورک" کی صورت میں یہاں کی زبانوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔ اس کے لیے انفرادی کوشش بھی کی جا سکتی ہے اور فی الحال یہی میرے اختیار میں ہے۔

نعمت الحق

پہلا باب

" زبان کے مطالعہ کے عمومی محرکات "

زبان کیا ہے؟ اس کا آغاز کب اور کیوں ہوا؟ کیا زبان عطیہ خداوندی ہے؟ مختلف اشیاء کو ان کے یہ نام کس نے دئیے ہیں؟ انسانوں کا ایک گروہ ایک ہی زبان کیوں بولتا ہے اور دوسرے گروہ دوسری زبانیں کیوں بولتے ہیں؟ سب کی زبان ایک جیسی کیوں نہیں ہے؟ زبانوں میں یہ فرق کس نے اور کیوں پیدا کیا ہے؟ جس طرح ہم زبان بولتے ہیں اس طرح کیوں بولتے ہیں، کسی اور طرح کیوں نہیں بولتے ہیں؟ انسان نے ان سوالوں پر یا ان جیسے کچھ سوالوں پر اس وقت سے سوچنا شروع کیا ہو گا جب سے اس نے حیات و کائنات کے دیگر مسائل پر دھیان دیا ہو گا۔ ابتدا میں اس نے ان سوالوں کا جواب اپنے محدود علم کی روشنی میں تلاش کیا اور زبان کو بھی عطیہ الہی یا دیوتاؤں کا انعام سمجھا۔ قدیم مذہبی کتابوں میں زبان کے بارے میں مختلف تصورات کی توضیح اسی انداز میں کی گئی ہے۔ جیسے انجیل میں آدم، شیطان اور خدا کی گفتگو کا ذکر آیا ہے یا قدیم مصری عقائد کے مطابق " تھوتھ " نامی خدا بول چال اور تحریر کا بانی تھا۔ یا جیسے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق برھما نے آریہ تہذیب کو لکھنے کا علم دیا(۱)

> " تورات میں زبانوں کے اختلاف کی یہ توجیہہ کی گئی ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اس کی پاداش میں اس کی نسل میں زبانوں کے اختلاف پیدا کر دئیے گئے ہیں۔ " (۲)

انسانی شعور نے جوں جوں ترقی کی، انسان کے سوچنے کا انداز بھی بدلتا گیا اور اس نے حیات و کائنات کے مسائل کی توجیہہ وتوضیح کرنا شروع کر دی۔ وہ مذہبی تصورات و

شروع کیا۔ قدیم یہودیوں نے بھی زبان کے مسائل پر توجہ دی۔ جن کے بارے میں پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں،

" قدیم یہودی ان شخصی ناموں یا اسمائے خاص کی لفظی حیثیت، ان کی تشکیل اور معنویت پر بھی توجہ دیتے اور تفسیر و توجیہہ کرتے رہے ہیں جن میں اظہاریت نہ ہوتی تھی۔" (3)

علم نے مزید ترقی کی تو انسان نے حیات و کائنات کی ماہیت اور خصوصیات پر غور کرنا شروع کیا۔ زبان کے مسائل پر بھی اسی حوالے سے غور کیا گیا۔ قدیم یونانی اور لاطینی عالموں نے زبان کے مختلف پہلوؤں پر فلسفیانہ نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ افلاطون نے " کرے تائی لس" (KRATYLOS) میں زبان کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس نے پہلی بار الفاظ اور ان کے معانی کے تعلق کے حوالے سے مباحث پیش کئے ہیں کہ الفاظ ان خیالات کا لازمی اور فطری مظہر ہیں، جن خیالات کی وہ ترجمانی کرتے ہیں یا وہ ان خیالات کی محض روایتی علامات ہیں۔ (4) یا لفظ اور معنی کے درمیان اختیاری تعلق قائم کیا گیا ہے۔ اس نے زبان کی ابتدا پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے کہ کیا زبان کی ساخت میں باضابطگی کے عمومی اصول وضع کئے جا سکتے ہیں یا وہ بے قاعدگی کی طرف ہی مائل رہتی ہے۔ اس کے یہاں اسم اور فعل کی درجہ بندی کے سلسلے میں منطقی تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ (5)
یونان میں ان مسائل پر مسلسل بحثیں ہوتی رہیں ۔ ارسطو نے سب سے پہلے زبان کی قواعد کی طرف توجہ دی اس نے یونانی زبان کی ماہیت اور خصوصیات پر فلسفیانہ انداز میں نظر ڈالی اور اس کی قواعد کا تجزیہ کیا اور اجزائے کلام، حالت، تعداد، زمانہ اور جنس کی درجہ بندی کی۔ (6)
ڈیونی سیس تھریکس (دوسری صدی قبل مسیح) نے یونانی گرامر پر باقاعدہ ایک مستقل کتاب تالیف کی جس میں صوتیات اور صرف و اشتقاق سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اپولونیس ڈسکولس، (دوسری صدی عیسوی) کی یونانی گرامر، ڈونٹس (چوتھی صدی عیسوی) اور پرشین(چھٹی صدی عیسوی) کی لاطینی گرامر کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔(7) اگرچہ ان یونانی اور رومن فلسفیوں کے

تصورات نے دور رس اثرات مرتب کئے تاہم زبان کے حوالے سے ان کے فلسفیانہ خیالات کو لسانیات نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال کے مطابق " سائنس جس تعمق نظر، دقیق مشاہدے، حقائق نفس الامر کی باقاعدہ گروہ بندی اور ترتیب کی متقاضی ہے، اس کی پرچھائیاں قدیم یونانیوں کے یہاں برائے نام ہی ملتی ہیں " (8) یونانی اور رومن مفکرین کے زبان کے حوالے سے فلسفیانہ خیالات یورپ میں لسانیات کی روایت کے ابتدائی نقوش قرار دئیے جا سکتے ہیں۔

لسانیات کی روایت کے مطالعے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں مختلف زمانوں میں، زبانوں کے مطالعے کے محرکات مختلف نوعیتوں کے حامل رہے ہیں۔ یونانیوں نے اپنی زبانوں کا مطالعہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کیا جس کا اجمالی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔ قدیم ہند میں لسانی مطالعے کے محرکات مذہبی نوعیت کے تھے اسی طرح مسلمانوں نے عربی زبان کی صرف و نحو کی تدوین اس نقطۂ نظر سے کی کہ قرآن مجید کی زبان کی، جو غیر عرب مسلمانوں کے لئے اجنبی تھی، قرأت اور تفہیم میں آسانی ہو۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ میں لسانی مطالعے کے محرکات مذہبی ہی تھے۔ برصغیر میں انگریزوں کے عہد میں، مستشرقین نے یہاں کی مقامی زبانوں پر توجہ دی اور لغات اور قواعد مرتب کیں تاکہ حاکموں کو مقامی زبانیں سیکھنے میں آسانی ہو۔ عیسائی مشنریوں نے بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مقامی زبانوں پر توجہ دی۔ اس طرح برصغیر میں سیاسی اور مذہبی محرکات کے زیر اثر لسانی مطالعے ہوئے یہ اور بات ہے کہ بعد میں کچھ مستشرقین کے مقاصد سیاسی نہ رہے اور انہوں نے لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہاں کی زبانوں کا مطالعہ کیا، اس حوالے سے تفصیلی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

قدیم ہند میں

لسانیات کی قدیم ترین روایت قدیم ہند میں نظر آتی ہے، جہاں ویدوں کی زبان کی تفہیم کے لیے لغات مرتب کی گئیں۔ ویدوں کی زبان بول چال کی زبان نہ رہی تھی اور

رفتہ رفتہ متروک ہوتی جا رہی تھی ۔ اس لئے اس کی تفہیم کے لئے لغت کی ضرورت محسوس کی
گئی ۔ قدیم ترین لغت جو دستیاب ہوئی ہے، " نگھنٹو "(NIGHANTU) ہے، جو کسی ایک
شخص نے مرتب نہ کی تھی بلکہ کئی منیوں کی کاوش کا نتیجہ تھی ۔ اس طرح ہند آریائی لسانیات
کا آغاز ویدک زبان کی فرہنگ کی تدوین سے ہوتا ہے (9) یہ لغت ایک اعتبار سے نامکمل تھی کیوں
کہ اس میں بہت کم کلموں کی تشریح کی گئی تھی ۔ یاسک منی نے نگھنٹو کی شرح کی اور اس پر
اضافے بھی کئے، اس کی لغت " نرکت " مستند قرار پائی اور اسے " ویدانگ " یعنی وید کے انگ
یا وید کے اعضا کہا گیا ۔ اس میں ویدک ادب سے بہت سے اقتباس بھی دئیے گئے ہیں جو یاسک سے
پہلے کی ویدی زبان کی نمائندگی کرتے ہیں اس طرح یاسک کے اشتقاقی انداز سے نرکت کی اہمیت
بڑھ گئی ہے۔ (10)

اردو لسانیات میں یاسک اور " نرکت " کے بارے میں ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں ، ڈاکٹر
ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے یہاں جو بیانات ملتے ہیں وہ درست نہیں ہیں ۔ پروفیسر
خلیل صدیقی نے اس امر کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر ابواللیث
صدیقی کے بیانات یاسک کو قواعد داں اور " نرکت " کو " گریمر " قرار دیتے ہیں ۔(11) اور
ڈاکٹر سہیل بخاری نے یاسک منی کی کتاب کو رگ وید کا ترجمہ قرار دیا ہے ۔(12) جب کہ حقیقت
یہ ہے کہ یاسک قواعد نویس نہیں ہے بلکہ اس نے ویدک زبان کی لغت " نرکت " ترتیب دی
تھی اور " نرکت " رگ وید کا ترجمہ نہیں ، فرہنگ ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی " نرکت " کے
بارے میں لکھتے ہیں ۔

" نرکت ، نہ گریمر ہے اور نہ رگ وید کا ترجمہ ، بلکہ مشکل ویدک الفاظ کی
فرہنگ ہے۔ رگ وید کو پڑھنا اور سمجھنا مشکل تھا اس لئے منیوں اور
پنڈتوں نے فرہنگ تیار کرنا ضروری سمجھا ۔ نرکت نام کی سترہ فرہنگوں
اور مصنفوں کے حوالے ملتے ہیں ۔ یہ فرہنگیں ناپید ہیں ۔ جو دستیاب
ہوئی ہے اس کا نام " نگھنٹو " (NIGHANTU) ہے ۔ جس کے

> متعلق روایت ہے کہ پنڈتوں کی کئی نسلوں نے ویدک لغات جمع کر دیے تھے تاکہ وید کے مطالعے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ یاسک کی "نرکت" اس پر ایک طرح کا تبصرہ اور اضافہ ہے اور نسبتاً زیادہ جامع ہے اس لئے نگھنٹو سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ پہلا حصہ مترادفات پر مشتمل ہے اور "نگھنٹو" پر منحصر، دوسرے حصے میں ویدوں کے مخصوص الفاظ معنی ہیں اور تیسرے حصے میں دیوی دیوتاؤں اور قربانی اور اس کے رسوم کے متعلق الفاظ یاسک نے مشتقات بھی دئیے ہیں اور ویدوں، سمہتوں اور براہمنوں سے اقتباس بھی۔ "نرکت" اپنی قدامت اور مشکل ویدک الفاظ کی فرہنگ ہونے کی وجہ سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ اقتباسات کی وجہ سے قدیم ہند آریائی کے ارتقاً کی کچھ منزلوں کے نمونے مل جاتے ہیں جن کہ "نرکت" سے ویدوں کی تفہیم میں مدد ملتی ہے، اس لئے اسے "وایدانگ" (وید کا انگ، عضو یا حصہ) بھی کہا جاتا ہے۔" (13)

اس توضیح کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر سہیل بخاری کا یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کہ "نرکت" ویدک زبان کی قواعد ہے یا یہ رگ وید کا ترجمہ ہے۔

لغات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ویدک زبان کی قواعد مرتب کرنے کی طرف بھی توجہ دی گئی کیوں کہ قدیم بھجنوں کی روایت سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی لیکن اب ان بھجنوں اور اشلوکوں کی زبان متروک ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ ان بھجنوں کو پڑھتے ہوئے یا دہراتے ہوئے کہیں غلطی نہ ہو جائے یا ان میں کوئی تصرف نہ ہونے پائے۔ زبان کی صحت کا خیال مقدم تھا کیوں کہ مقدس زبان میں تحریف یا بھجنوں کی غلط ادائیگی جہنم کا ایندھن بنا سکتی تھی اس لئے ویدک زبان کی قواعدیں مرتب کی گئیں تاکہ بھجنوں کی خواندگی صحیح تلفظ کے ساتھ ہو سکے۔ اس نقطۂ نظر سے "قدیم ہند کے نحویوں نے پہلی بار لسانیاتی مشاہدے اور لسانی درجہ بندی کی اہمیت محسوس کی۔" (14) قدیم ہند میں لسانیات کی روایت کا آغاز مذہبی محرکات ہی کے زیر اثر

ہوا۔ پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں،

" ویدک یا سنسکرت قواعد کی تدوین کے محرکات مذہبی تھے۔ برہمنوں کے لئے گریمر کی تعلیم لازمی تھی۔ پتن جلی (ویاکرن " (گریمر) کی تعلیم کو مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے عہد سے پہلے برہمن بچوں کو گریمر کی تعلیم پہلے دی جاتی تھی پھر وید پڑھائے جاتے تھے۔" (15)

ڈاکٹر نصیر احمد خاں قدیم ہند میں لسانی مطالعے کے محرکات کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" مذہب سے زبان کے اس گہرے رشتے نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ زبان پر خاص توجہ دے۔ زبان کو محفوظ کرنے کے لئے قواعدیں لکھی گئیں جیسے ویدک سنسکرت کی قواعد جو پانینی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی اور یہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ بھگوان کی " وانی " کا تلفظ اور قواعد نہ بگڑنے پائے۔" (16)

پانینی نے ویدک زبان کی قواعد پر پہلی بار توجہ نہیں دی تھی بلکہ اس سے پہلے بھی ویدوں کی مقدس زبان کی قواعد مدوّن کی جا رہی تھیں۔ پانینی نے اپنے پیش رو چونسٹھ قواعد دانوں کے نام گنوائے ہیں۔ ان قواعدوں میں ویدوں سے ادبی سنسکرت تک کی قدیم ہند آریائی زبان کی صوریات اور تشکیلیات کے مباحث ملتے ہیں۔(17) لیکن قدیم ہند آریائی قواعد دانوں میں پانینی (پانچویں صدی قبل مسیح) سر فہرست ہے۔ ہندو قواعد دانوں نے پانینی کو عظیم ترین قرار دیا ہے۔ پانینی کی قواعد " پانینیم" کہلاتی ہے۔ اسے " اشٹ ادھیائے" بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں آٹھ (اشٹ) ابواب (ادھیائے) ہیں۔ یہ قواعد 3996 سوتروں پر مشتمل ہے۔ پانینی کے مرتب کردہ یہ قواعد پیچیدہ ہیں، اصولوں کی کثرت ہے اور مستثنیات بھی بہت زیادہ ہیں۔ ان وجوہ کی بناد پر انہیں سمجھنے کے لئے مطالعے اور تربیت کی ضرورت ہے اس لئے اس کی بہت زیادہ شرحیں اور تفسیریں لکھی گئیں اکثر ہندو ماہرین سنسکرت اور مستشرقین

بھی " اشٹ ادھیائے" کی تعبیر و تفسیر اور تشریح و توضیح میں شدید اختلاف کرتے ہیں (18)
ڈاکٹر نصیر احمد خاں پانینی کی قواعد " اشٹ ادھیائے" کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

" چوتھی صدی ق۔م کی اس اشٹا دھیائے نامی قواعد میں سنسکرت زبان کی ساخت سے متعلق چار ہزار مقولے ملتے ہیں۔ اس طرح مختلف صوتی اور صرفی و نحوی اصول سامنے آئے اور طریق کار، قواعدی اصول و تصورات سے متعلق رجحانات کا ارتقاء ہوا جن میں سے بعض جدید لسانیات میں آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔" (19)

رگ وید کی زبان کی پیچیدگی اور پانینی کی گرامر میں اشکال و ابہام ہی کا نتیجہ تھا کہ اس سلسلے میں نہ صرف پانینی سے پہلے بیسیوں گرامریں مرتب ہوئیں بلکہ پانینی کی گرامر کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور " اشٹ ادھیائے" کی تفسیریں اور شرحیں مدوّن کی گئیں لیکن اس ذیل میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نقطۂ نظر مختلف ہے بلکہ ایک اعتبار سے ان کے یہاں تضاد کا اشتباہ بھی ہوتا ہے۔ وہ رگ وید کے قواعد اور پانینی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" رگ وید کی زبان نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے لیکن اس کے قواعد صرف و نحو نہایت واضح اور متعین ہیں۔ جناں چہ مشہور قواعد نویس پانینی نے چوتھی صدی قبل مسیح میں سنسکرت کی پہلی قواعد مرتب کی تھی۔" (20)

پانینی کی " اشٹ ادھیائے" چار ہزار کے قریب سوتروں پر مشتمل ہے اور اس قواعد کی تشریح و تفسیر کے لیے بعد میں شرح در شرح کا سلسلہ جاری رہا۔ کاتیاین نے " وارتک" میں " اشٹ ادھیائے" کی شرح بیان کرنے کے ساتھ اس پر تنقید کی اور پانینی سے اختلاف بھی کیا۔ پتن جلی نے " مہا بھاشا" میں " وارتک" پر تنقید کی اس طرح ویدک زبان کی تفہیم کے لئے قواعد مرتب کئے گئے۔ ان کی شرحیں بھی لکھی گئیں اور " اشٹ ادھیائے" میں اصول و قواعد کے حوالے سے جو پیچیدگی اور ژولیدگی پیدا ہو گئی تھی اس کی تصریح بھی کی گئی اور یہ سلسلہ

بہت عرصے تک چلتا رہا۔ اس روایت کے پس منظر میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رگ وید کی زبان کے قواعد صرف و نحو نہایت واضح اور متعین ہیں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے اسی بیان میں پانینی کو سنسکرت کا پہلا قواعد دان قرار دیا ہے جب کہ یہ درست نہیں ہے، پانینی نے " اشٹ ادھیائے" میں اپنے چونسٹھ پیش رووں کا ذکر کیا ہے اور اس امر کا حوالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی دیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

" پانینی نے اپنے اس قواعد میں کم از کم اپنے چونسٹھ پیش رووں کا ذکرکیاھے۔"(21)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے پہلے پانینی کو سنسکرت کا اولین قواعددان قرار دیا ہے اور پھر اس کے پیش رووں کا ذکر بھی کیا ہے، جس سے تضاد کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔

پانینی کے عہد کا قطعی تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ گولڈ اسٹکر اور روبنس نے پانینی کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح قرار دیا ہے۔ ہیم چندرائے پانچویں صدی ق۔م اور بھنڈارکر ساتویں صدی ق۔م کو پانینی کا عہد قرار دیتے ہیں۔ بلوم فیلڈ نے 350 ق۔م تا 250 ق۔م کا درمیانی عہد پانینی کے لئے مخصوص کیا ہے اور ہندو کلاسیکل ڈکشنری میں یہ چوتھی قبل مسیح ہے۔ (22)

پانینی نے مروجہ زبان کے لئے " لوکا " اور ادبی زبان کے لئے " چاندس" کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ اس نے ویدک زبان کی جزئیات کی تفصیل دی ہے اور اس کی صرف و نحو سے بحث کی ہےاور مستثنیات کی نشان دھی کی ہے۔ اس نے جغرافیائی مقامات اور ان کے باشندوں کے ناموں کی تشکیل کے بھی کچھ اصول بتائے ہیں۔ جن ناموں پر ان کا اطلاق ممکن نہیں ان کے الگ زمرے بنائے ہیں۔ ان کی مدد سے اس کے دور کے کچھ شہروں قبیلوں اور گروھوں کے تعین میں کسی قدر مدد مل سکتی ہے۔ (23) پانینی کی " اشٹ ادھیائے" ابتداء سے لے کر جدید عہد تک سنسکرت کی اہم قواعد تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ قدیم دور میں ویدک زبان کی تفہیم اور مذہبی علوم کی تحصیل کے لئے " اشٹ ادھیائے" بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ پانینی کا شمار منیوں اور رشیوں میں ہوتا تھا اور اسے " مہا اچاریہ" کہا جاتا تھا اور اس کی گرییمر

کو " شیو دیوتا " کا فیضان قرار دیا جاتا تھا۔ پانِنی کی " اشٹ ادھیائے " میں اشکال و ابہام ہے اور بیان میں پیچیدگی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ جدید دور کے ماہرین لسانیات نے پانِنی سے اختلاف بھی کیا ہے اور " اشٹ ادھیائے " پر تنقید بھی کی ہے لیکن اسے شاندار الفاظ میں خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی بلوم فیلڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بلوم فیلڈ نے اشٹ ادھیائے کو انسانی ذہن کا عظیم الشان کارنامہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سنسکرت صرف و نحو اور اشتقاق کی جتنی تفاصیل اور جزئیات اس گریمر میں جمع ہو گئی ہیں اس کی مثال ناپید ہے۔ آج تک کسی زبان کی اتنی بھرپور وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ (24)

پروفیسر خلیل صدیقی کی یہ رائے صائب ہے کہ

" اشٹ ادھیائے، اپنی ژولیدگی کے باوجود نہایت مکمل اور جامع گریمر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ یورپی ماہرین لسانیات کے لئے شمع راہ ثابت ہوئی تھی۔" (25)

کاتیائین سنسکرت قواعد کے عالموں میں پانِنی کے بعد دوسرا بڑا قواعد دان شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی قواعد " وارتِک " ہے۔ میکس ملر نے اس کا عہد چوتھی صدی ق۔م کا نصف آخر بتایا ہے اور گولڈ اسٹکر دوسری صدی ق۔م کا نصف اوّل قرار دیتا ہے جب کہ ڈیھرنر 25 ق م قرار دیا ہے۔ (26) کاتیائین کی قواعد " وار تک " پانِنی کی . " اشٹ ادھیائے " کی تفسیر بھی ہے اور اس میں اس کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس نے پانِنی کے کچھ اصولوں کی تردید بھی کی ہے اور تصحیح بھی، اس لئے "وارتِک " کو اشٹ ادھیائے کا تکملہ قرار دیا گیا ہے۔ (27) کاتیائین کی دو تصانیف " سروت سوتر " اور بجروید پراتی ساکھیہ " بھی ہیں لیکن زیادہ اہمیت "وارتِک " ہی کی ہے۔

پتن جلی سنسکرت کے قواعد دانوں میں پانِنی اور کاتیائین کے بعد عظیم قواعد دان شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی گریمر کا نام " مہا بھاشیا " ہے۔ اس کے خیال میں گریمر کو زبان پر تقدم حاصل ہے۔ اس لئے وہ گریمر کی سختی سے پابندی کرنے کی تلقین کرتا ہے اور گریمر کی تحصیل کو زبان کو سمجھنے کے لئے لازمی قرار دے کر مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے کیوں کہ ویدوں کی مقدس

زبان میں غلطی گناہ عظیم کے مترادف ہے۔ پتن جلی نے پاننی اور کاتیائین کے اصول و قواعد کی تشریح بھی کی ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان کی قواعدوں سے زبان کی جن جزئیات کی توضیح نہیں ہوتی تھی پتن جلی نے ان کے لئے نئے اصول و قواعد بھی مرتب کئے۔ اپنے پیش رو دونوں قواعددانوں میں سے اس نے پاننی کا تتبع کیا اور کاتیاین نے پاننی کے جن اصولوں کی تردید کی تھی ان کی وضاحت کرتے ہوئے کاتیاین سے اختلاف کیا۔ اس لئے اسے پاننی کا بہترین شارح قرار دیا جاتا ہے۔ پتن جلی کا عہد دوسری صدی عیسوی قرار دیا جاتا ہے۔ (28) پتن جلی کے بعد بے شمار قواعددانوں نے پاننی، کاتیاین اور پتن جلی کی قواعدوں کی شرحیں لکھیں لیکن پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق " قدیم ہند آریائی دور میں جتنی بھی قواعدیں مرتب ہوئیں، کم و بیش ان سب کی اساس " اشٹ ادھیائے" پر ہی ہے اور وہی مستند ترین سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس میں سنسکرت الفاظ کی تشکیل، تصریفی نوعیتوں، گردان، مشتقات کی جو جزئیات اور تفصیل پیش کی گئی ہیں، وہ کسی زبان کی گریمر میں نہیں ملتیں۔" (29)

ویدوں کے ضبط تحریر میں آنے سے پہلے بھجن، اشلوک اور منتر صدیوں تک سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہے اس عرصے میں زبان میں تغیرات رونما ہونے لگے تھے۔ اس لئے ویدوں کی زبان کو اس کی اصل حالت میں محفوظ رکھنے کے لئے قواعدیں مدوّن کی گئیں لیکن ابھی تک آریا فن تحریر سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اکثر مستشرقین کا خیال ہے کہ پاننی تحریری نظام سے نا آشنا تھا۔ میکڈانل آریاؤں کے فن تحریر سے واقف ہونے کا دور چھٹی صدی قبل مسیح اور ڈاکٹر چٹرجی دسویں صدی قبل مسیح قرار دیتے ہیں۔ (30) اس لئے ویدوں کے بھجن، اشلوک اور منتر اور ان کے ساتھ ویدک زبان کی قواعدیں بھی سینہ بہ سینہ زبانی منتقل ہوتی رہیں اس لئے تلفظ کی صحت کے پیش نظر ان قواعدوں میں صوتیاتی مباحث بھی ملتے ہیں اور اس مقصد کے لئے متعدد رسالے بھی مدوّن کئے گئے۔ انہیں دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک زمرہ " پراتشاکھیوں" کا ہے اور دوسرا " شکشاؤں" ہے۔ پراتشاکھیوں میں چاروں ویدوں کے متون (TEXTS) کے تلفظ، آوازوں کے مخارج اور ان کی درجہ بندی

کے مباحث ہیں اور شکشاؤں میں عموماً پراتشاکھیوں کی تفسیر کی گئی ہے۔ پراتشاکھیوں میں رک، واجسنی اور اتھرو زیادہ اہم ہیں۔ پراتشاکھیوں اور شکشاؤں میں ابہام اور اشکال سے پیچیدگی اور ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے لیکن ان سب کے مطالعے سے ایسا صوتیاتی مواد اخذ کیا جا سکتا ہے جس کی مدد سے سنسکرت صوتیات اور فونیمیات کی تفہیم ممکن ہو سکتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی پراتشاکھیوں اور شکشاؤں کی صوتیاتی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں،

> " ان میں گویائی کے مناھج ، آوازوں کے مخارج اور طریقۂ ادا، درجہ بندی اور صوتی تجزیے کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں " فونیمیات " اور "صوتیات" کا اچھا خاصا حق ادا ہو جاتا ہے۔ قدیم ہند کے ماہرین صوتیات کی کاوشیں جدید صوتیات کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ گویا قبل مسیح ادوار ہی میں ہند آریائی لسانیات، تشکیلیات اور صوتیات کے مباحث کے اعتبار سے اس علمی سطح پر پہنچ چکی تھی جو یورپ لسانیات کو سینکڑوں سال بعد نصیب ہوئی۔" (31)

پانِنی کی " اشٹ ادھیائی " ، پتن جلی کی " مہا بھاشا "، پراتشاکھیوں اور شکشاؤں میں جو صوتی مباحث ملتے ہیں ان میں کلموں کے تلفظ ، حروف کے مخارج اور طریقۂ ادا کی ذیل اختلافات بھی ہیں لیکن ان کے مجموعی مطالعے سے سنسکرت قواعددانوں کے صوتی تجزیوں اور توضیحات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سنسکرت قواعدداں جملے کو لسانی اکائی قرار دے کر اس کی اساس پر لسانی تجزیہ کرتے تھے۔ بہتر ہری صوتی توضیحات کے لئے " ایک پران بھاؤ" کو بنیادی اکائی قرار دیتا ہے۔ " ایک پران بھاؤ" ویدک منتر کی پوری سطر یا مصرعہ ہے، ہر سطر زنجیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف قواعددانوں نے " ایک پران بھاؤ" کی تقطیع کے سلسلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے، جس سے کلموں کی ہیئتوں اور معانی میں اختلاف بھی پیدا ہوا ہے۔ (32)

قدیم ہند کے قواعددانوں نے صوتیاتی اصطلاحات بھی وضع کی تھیں جن کے مطابق

" ورنٌ " حرف یا صوتی اکائی کے لئے " ستھان " مخرج کے لئے " کرن "، مجہول عضو صوت اور " کاجی " ، عامل عضو صوت کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ عموماً زبان کے کسی نہ کسی حصے کو " کاجی " قرار دیا گیا ہے، جیسے " جہوا مولا " ، زبان کی جڑ، " جہوا مدھیہ "، زبان کا درمیانی حصہ، " جہوا گر" زبان کا پچھلا حصہ " کاجی " قرار دیا گیا ہے۔ ان کے متقابل " کرن " ، " ہنو مولا " (جبڑے کی جڑ یا نرم تالو) " تالو " اور " دنت یا دنت مولا " (دانت) کو کہا گیا ہے۔ دولبی آوازوں کا " ستھان " اوپر کا ہونٹ اور " کرن" نچلا ہونٹ بتائے گئے ہیں اور حلقی آواز کا " کرن " حلق کا نچلا حصہ ہے۔ (33)

" پاننیہ شکشا " میں عمل نطق کی توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ " روح عقل کی مدد سے اشیاء کو سمجھتی اور ذہن کو اظہار کے لئے اکساتی ہے۔ ذہن جسمانی حرارت کو تیز کرتا ہے جو سانس کو ڈھیلتی ہے۔ سانس پھیپھڑوں سے گزرتی ہوئی اوپر اٹھتی ہے۔ سر سے ہوتی ہوئی اعضائے صوت تک پہنچتی اور تشکیلی آوازیں پیدا کرتی ہے۔ ان آوازوں کو پانچ طریقوں سے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے ـــ تان ، امتداد ، مخارج اداء طریقہ اداء اور ثانوی خصوصیات کی بنیاد پر ـــ ماہرین صوتیات نے اسی طرح بتایا ہے اس پر پوری توجہ دینی چاہیئے" (34)

آوازوں کو، اجرائے آواز کے عمل کے حوالے سے دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) " ابھینتر پریتن " یعنی داخلی ۔ اس میں وہ اصوات شامل ہیں جو منہ بند کرنے، کھولنے اور ضوستی یا تنگی سے تشکیل پاتی ہیں۔

(2) باھیہ پریتن " اس میں حلقی (باصدا اور بے صدا) ھائیہ اور انفی آوازیں شامل ہیں۔

" اشمن " کی اصطلاح جاریہ کے لئے استعمال کی گئی ہے اور اس کا اطلاق /س/ش/-/ تھ/-/کھ/-/ ھ/ اور ھائیہ مصدودوں پر کیا گیا ہے۔ ھائیہ مصدودوں کے لئے " سوشمن " کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ آوازوں کو " گھوش وت " یعنی با صدا اور " اگھوش وت " یعنی بے صدا میں تقسیم کیا ہے۔ حلقی آوازوں کے لئے کنٹھی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ ھائیہ

اور غیر ھائیہ مسدودوں کے لئے " مہا پران " اور " الپ پران " اصطلاحیں ھیں۔ انفی مصمتوں کو " انوناسک " کہا گیا ھے اور اس کا اطلاق /م/-/ن/-/ن/-/ڻ/- اور نیم مصوتوں ی،ل،و پر ھوتا ھے۔ (35)

آوازوں کو مخرج یا طریق ادا کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کیا گیا ھے۔

" کا ، ورگے " کے حروف ک،کھ،گ،گھ کا مخرج " جھو مولا " ھے۔

" چا ، ورگے " کے حروف چ،چھ،ج،جھ کو مخرج کے لحاظ سے تالوئی قرار دیا ھے۔

مور دھنیہ ٹ،ڈ،ڑ،ٹھ،ڈھ کو کہا گیا ھے۔

حرف /ہ/ کو طریق ادا کے لحاظ سے جاریہ اور مخرج کے اعتبار سے کنٹھی کہا گیا ھے۔ ان کے علاوہ بقیہ مصمتی زمروں کے لیے دنتی، اوشٹھی (لبی) ، اوشٹھ دنتی (لب دندانی) کی اصطلاحیں وضع کی گئی ھیں۔(36) سنسکرت صوتیات کے ماہرین نے ستھان (مخرج) اور کرن (عامل عضو صوت) کی وضاحت عمدگی سے کی ھے۔

" سندھی " کی اصطلاح سنسکرت صوتیات کے ماھرین نے آوازوں کے ادغام کے لیے استعمال کی ھے۔ یہ اصطلاح آج بھی انھی معنوں میں مستعمل ھے۔ ویدوں کی خواندگی میں آوازوں، مصوتوں اور کلموں کے اتصال و ادغام کا احتمال رھتا تھا اس لئے سنسکرت ماھرین صوتیات نے ان مباحث کو بڑی اھمیت دی ھے۔ ان کے یہاں ان مباحث میں اختلاف بھی ملتے ھیں۔

" پراتشاکھیوں " اور " شکشاؤں " میں صوتیات کے مباحث میں پیچیدگی اور اشکال ھے۔ لیکن اس کے باوجود سنسکرت ماھرین صوتیات نے جو صوتیاتی مباحث پیش کئے وہ سینکڑوں سال بعد جدید لسانیات کے لئے مشعل راہ بن گئے۔ پروفیسر خلیل صدیقی سنسکرت کے ماھرین صوتیات کے صوتیاتی کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ھیں۔

" قدیم ھند کی صوتیات کے مختلف تجزیوں کی تعمیم سے جو صوتیاتی خاکہ تیار ھوتا ھے، اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ھے کہ آوازوں کا تجزیہ ان کے مخارج، طریقۂ ادا کی وضاحت اور گروہ بندی، لہجہ

اور آہنگ (PROSODY) کا جائزہ جدید صوتیات اور فونیمیات سے فرو تر نہیں۔ اسی لئے مغربی ماہرین لسانیات نے قدیم ہند کی صوتیات کو، صوتیات کی تاریخ میں سنگ میل قرار دیا ہے۔ (37)

قدیم ہند کے لسانیاتی کارنامے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں کی بدولت منظر عام پر آئے اور مغرب نے ان سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔ جس کا اعتراف بیشتر مغربی ماہرین لسانیات نے کیا ہے۔ مثلاً دراوڑی کی فرہنگ کے مؤلف ایم۔ بی۔ ایمینو (M.B.EMENEAU) نے امریکن اورینٹل سوسائٹی کے 1955ء کے ایک اجلاس میں اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے

" اس سوسائٹی کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ مغربی دنیا کی لسانیات کا اصل اور براہ راست سر چشمہ دو ہزار سالہ قدیم ہند کی لسانیات میں ہے۔ " (38)

عربی میں :

لسانیات کی تاریخ میں زبان کے آغاز کے مسائل خاصی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ عربی علماء نے بھی ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری نے دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں آغاز زبان کا الہیاتی نظریہ پیش کیا اور بعد میں سعید ابن جبیر ، جلال الدین سیوطی ، ابن حاجب، ابن زید اور ابن فارس و دیگر علماء نے بھی آغاز زبان کے الہیاتی نظریے کو اپنے اپنے طور پر پیش کیا۔ ان کے خیال کے مطابق

" الفاظ کی وضع ایجاد و توقیف سے ہوئی یعنی اللہ تعالی نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی تو انہیں گفتگو کے لیے الفاظ بھی بتائے ۔ پھر جب وہ اس خاکدان عالم میں آئے تو حسب ضرورت الفاظ کی وحی بھی ان کی جانب ہوتی رہی یہاں تک کہ مجموعہ الفاظ نے ایک زبان کی صورت اختیار کر لی ۔ " (39)

ابو ہاشم معتزلی (1933ء) نے آغاز زبان کے الہیاتی نظریے کو رد کرتے ہوئے یہ

خیال ظاہر کیا کہ کلمے انسان نے خود وضع کئے ہیں، "الفاظ وضع کرنے والا خود انسان ہے۔ اپنے نفس اور ماحول کی تحریکات سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ اس نے الفاظ کا ذخیرہ جمع کر لیا جس نے ایک زبان کی صورت پھر اختیار کر لی۔" (40) ابو ہاشم معتزلی کے متبعین نے اس نظریے کی تشریح کرتے ہوئے مختلف موقف اختیار کئے پہلا یہ کہ انسان نے ابتداء میں حیوانوں کی آوازیں سنیں اور مختلف موقعوں پر ان کی آوازوں میں فرق کو بھی محسوس کیا اس طرح اس نے آوازوں میں ترہیب اور ترغیب کا اختلاف سیکھا رفتہ رفتہ مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے تغیرات کا اندازہ کیا اس کے ساتھ ہی مظاہر فطرت کی آوازیں سنیں جیسے بادلوں کا گرجنا، برسنا، ہوا کی سرسراہٹ، پتوں کا گرنا، آہستہ آہستہ وہ ان آوازوں کی نقالی کرنے لگا اس طرح رفتہ رفتہ کلموں کی تعمیر شروع ہوئی۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں وضع اصوات کی قابلیت موجود ہے۔ انتہائی رنج یا خوشی یا تکلیف کے عالم میں فطری طور پر اس کے منہ سے کچھ آوازیں نکلتی ہیں اس طرح اکتساب سے نہیں بلکہ فطری جبلت کے تحت انسان نے رفتہ رفتہ کلمے وضع کئے۔ تیسرا موقف یہ ہے کہ قوائے مدرکہ پر جب مختلف خیالات کی ضرب پہنچتی ہے تو اس تصادم سے دماغ میں ایک آواز پیدا ہوتی ہے جو زبان پر آ کر کلمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ (41) آغاز زبان کے بارے میں ان خیالات سے ملتے جلتے نظریات اٹھارویں صدی میں پیش کئے گئے جب کہ عرب علماء دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہی ان مسائل پر یہ مباحث پیش کر چکے تھے۔ ہرڈر نے 1772ء میں آغاز زبان کے الہیاتی نظریے کو رد کر کے حکائی نظریہ پیش کیا جو معتزلہ کے متبعین کے پہلے موقف سے مماثل ہے اسی طرح آغاز زبان کے فجائیہ نظریہ اور ڈنگ ڈانگ نظریہ (میکس ملر 1823 - 1900ء) معتزلیوں کے دوسرے اور تیسرے موقف سے مماثل ہے۔ (42)

تاریخ لسانیات میں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ کلمے صوتی رمزیت یا صوتی اظہاریت کے حامل ہوتے ہیں۔ کلموں کی آوازوں اور ان کے معنی و مفہوم میں مطابقت ہوتی ہے اور ایسے کلموں کو سنتے ہی ان کی آوازوں میں مخفی معنی ظاہر ہونے لگتے ہیں یعنی کلمے کی آوازیں اپنے معنی و مفاہیم کی ترجمانی کرتی ہیں البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان میں

تمام کلمے صوتی رمزیت کے حامل نہیں ہوتے اکثر کلمات ایسے ہوتے ہیں جن صوتی رمزیت نہیں ہوتی ہے۔ عربی کے نحویوں نے کلموں کی صوتی رمزیت کی طرف صدھا سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ اس حوالے سے انہیں اوّلیت حاصل ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق :

> " آواز اور معنی کی مناسبت اور مطابقت کا تصور سب سے پہلے مسلمان علماء ہی نے آٹھویں صدی میں پیش کیا تھا۔ مغربی دنیا میں یہ تصور (Sound Symbolism) سترھویں صدی عیسوی میں پہلی بار گویا 900 سال بعد منظر عام پر آ سکا۔ ان مسلمان علماء میں خلیل بن احمد، سیبویہ، ابن جنی اور سیوطی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے موقف اور طریق استدلال سے ہر چند اختلاف کیا جائے صوتی رمزیت (Sound Symbolism) کے تصور کے سلسلے میں انہیں پیش رو تسلیم کرنا چاہیے۔" (43)

پروفیسر خلیل صدیقی عرب نحویوں کی تصانیف میں صوتی رمزیت کے مباحث کی نشان دہی کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ " عربوں نے حروف کی کیفیات و صفات اور کلموں میں ان کی اظہاریت سے کھل کر بحث کی ہے یہی نہیں بلکہ مختلف حروف کے باہمی میل سے پیدا ہونے والی معنویت اور آواز کے ربط پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عرب علماء کے یہاں دو حرفوں کے اتصال و انضمام کی اظہاریت اور ثلاثی اور اس کے مشتقات کی معنوی صفات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ مادے میں اعراب یا حروف کے اضافے سے جتنے بھی کلمے بنائے جائیں گے سب میں معنوی بنیاد وہی رہے گی مثلاً " اشار" مادے سے جتنے کلمے بنیں گے ہر ایک میں نشان کے معنی کا ہونا لازمی ہے۔ " ق ط ع" میں جدائی کا مفہوم ہے " س ل م" میں سلامتی کا۔" (44)۔

مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری نے اسی ذیل میں بہت سی مثالیں دی ہیں ان کے خیال میں اگر لفظ کا تلفظ ادا کرنے میں اس کی ہیئت صوتی کی صحت پر خاص خیال رکھا جائے

اور سامع بھی غور سے اس لفظ کے تلفظ کی صحیح سماعت کرے تو معنی کا ایک خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ عربوں کے نزدیک حرف "ش" تفشی کا حرف ہے اور جس کلمے میں یہ حرف پایا جاتا ہے اس میں پھیلاؤ، وسعت یا پراگندگی کا مفہوم ضرور پایا جائے گا۔ مثلاً شباب، شبر، شجر وغیرہ اسی طرح "ر" حرف مکررہ ہے۔ اور اگر کوئی کلمہ اس حرف سے شروع ہو گا تو اس میں تکرار فعل کی طرف اشارہ ہو گا جیسے رقص، رقز، رکض، رقوف، رعدہ وغیرہ (45)

خلیل بن احمد اور سیبویہ (وفات 793ء) نے کلموں کی آوازوں اور ان کے معنوں و مفاہیم میں مطابقت کی طرف اشارے کئے ہیں جس کے حوالے سے مولانا سلیمان اشرف لکھتے ہیں کہ "ٹڈی جسے عربی میں جندب کہتے ہیں اس کی آواز میں درازی پائی جاتی ہے اور باز کی آواز میں انفصال و انقطاع محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے ٹڈی کی آواز کے لیے لفظ "صرّ" اور باز کی آواز کے لئے صرصر اہل عرب نے وضع کیا۔ سیبویہ و خلیل نے بس یہی دو لفظ کہہ کر اس نادر نکتہ کی طرف رہ نمائی کی کہ حرف صاد کی صفت یہ ہے کہ وہ صفیرہ ہے۔ چھوٹے پرند کی آواز کے لئے لفظ کا حرف صفیرہ سے شروع ہونا عجیب معنی خیز ابتدا ہے۔ دوسرا حرف را ہے جو ایک جگہ مشدد آ کر دراز ہو گیا اور دوسرے کلمہ میں ساکن ہو کر درازی کو اسی طرح منقطع کر دیا جیسا کہ باز کی آواز میں تقطیع پائی جاتی ہے پھر یہ کہ را حرف تکرار ہے آواز کے لئے اس کی مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔" (46) ان حوالوں سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عرب نحویوں اور قواعد نویسوں نے حرف کی صوتی ماہیت، نوعیت، کیفیت، صفت اور معنی و مفہوم کی مطابقت اور تعلق پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔

عربی زبان کے قواعد نویسوں کا اصل لسانیاتی کارنامہ حروف (آوازوں) کے مخارج اور ان کی درجہ بندی کے مسائل پر سیر حاصل مباحث ہیں۔ انہوں نے عربی زبان کی صحیح قرأت اور تفہیم کے لئے زبان کے مطالعے پر خاص توجہ دی اور عربی کے اصول و قواعد منضبط کئے۔ اشاعت اسلام کے ساتھ قرآنی تعلیمات سر زمین حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پھیلیں تو دوسری زبانیں بولنے والوں کو قرآن، جو عربی زبان میں ہے، کی قرأت اور تفہیم میں دقت پیش آنے لگی۔

جس کے پیش نظر عربی زبان کی صرف و نحو کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوا۔ ابوالاسود دؤلی نے ایک قاری کو قرآن کی آیت غلط پڑھتے ہوئے سنا تو اسے سب سے پہلے عربی کی صرف و نحو کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوا، اور اس کی تحریک پر حضرت علی نے نحو کا پہلا قاعدہ بتایا کہ " سارا کلام اس سے خالی نہیں کہ یا تو اسم ہو گا یا فعل یا حرف" چناں چہ اس پر سے ابوالاسود نے اوّل اوّل قواعد فن لسان کی تدوین کی۔ (47)

عربی زبان کے مطالعے کے محرکات بھی مذہبی ہی تھے۔ ابوالاسود نے بھی مذہبی تقاضوں ہی کے پیش نظر عربی قواعد کی تدوین کی۔ ابن الندیم اور سیوطی کی کتابوں میں ابتدائی قواعد نویسوں کے متعلق مذکور ہے کہ انہوں نے صرف، نحو، لغات، معنی، اشتقاق لحن و اصوات سے بحث کی ہے۔ ابوالاسود کے شاگردوں میں یحییٰ بن عمر، ابن ابی اسحاق شامل ہیں۔ جنہوں نے عربی قواعد کی تدوین کی ہے۔ مذہبی تقاضوں کے تحت قرآن مجید کی قرأت کی صحت پر توجہ دی گئی تو ترتیل اور تجوید کا آغاز ہوا۔ اس کی روایت صحابیِ رسول عبد اللہ ابن مسعود نے قائم کی۔ تجوید رفتہ رفتہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس کا مقصد الفاظ کی صحت کو محفوظ رکھنا بھی تھا اور قرأت کی خوبصورتی بھی، قرأت بالتحقیق میں ہر صوتیے کی پوری پوری صوتی قدر کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ " اشباع المد "، " تحقیق الهمزة " اتمام الحرکات، اعتماد الاظہار و تشدیدات، توفیۃ الغنۃ، قصر، اختلاس، ادغام، تخفیف، تسکین، بدل، وغیرہ اصطلاحات کے پردوں میں اور ان کی تشریح میں صوتیات کے خاصے مباحث سمٹ آئے ہیں۔ مخارج کے اعتبار سے حروف مستعلیۃ اور حروف مستفلۃ، ادغام کبیر اور ادغام صغیر، تلفظ بہ تحقیق، بہ تخفیف، بہ تسہیل کے مباحث عربی صوتیات کے ایک مخصوص رخ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آوازوں کی باریکی، نرمی، صلابت، توانائی وغیرہ کے اعتبار سے ترقیق، تفخیم، تلیین جیسی اصطلاحات کے ذریعے کیفیت و صفات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ (48) ان مباحث سے اندازہ ہوتا ہے مجودین نے آوازوں کے مخارج کے ساتھ ان کی صوتی کیفیات و صفات کے لحاظ سے درجہ بندی پر خاص توجہ دی ہے۔ یہ مباحث صوتیات کی ذیل میں خاص اہمیت کے حامل ہیں

الخلیل بن احمد (719 - 790ء) عربی کا پہلا مستند قواعدداں اور عالم لسانیات ہے۔ اس کی تصنیف " کتاب العین " عربی صرف و نحو اور تلفظ حروف کے مباحث میں سند کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی کتاب " العروض" عربی صرف و نحو کی روایت میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ الخلیل بن احمد کے عربی لغت اور صرف و نحو پر گہرے اثرات ہیں۔ " کتاب العین " عربی کی پہلی لغت ہے جس میں حروف کی ترتیب مخارج کے لحاظ سے ہے۔ اس نے عربی زبان کی آوازوں کی صوتیاتی اور لسانیاتی درجہ بندی بھی کی ہے جو خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ عربی کے دیگر نحویوں نے جن میں سیبویہ بھی شامل ہے اس کی لسانیاتی درجہ بندی سے استفادہ کیا ہے۔ (49)

عمر بن عثمان بن قنبر المعروف بہ سیبویہ (وفات 793ء) الخلیل بن احمد کا تربیت یافتہ تھا، سیبویہ عربی صرف و نحو اور صوتیات کا ممتاز ترین اور اہم ترین عالم ہے۔ اس کی تصنیف " الکتاب " کے ایک باب " الادغام " میں عربی آوازوں کا نہایت جامع صوتی تجزیہ کیا ہے اس نے پہلی بار عربی آوازوں کی باقاعدہ درجہ بندی کرتے ہوئے انہیں دو زمروں (1) حروف اصول اور (2) حروف فروع میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے اصول کے تحت عربی کی بنیادی آوازوں اور فروع کے تحت ذیلی آوازوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کی یہ تقسیم جدید صوتیات کے صوتیوں (PHONEMES) اور ہم صوتوں (ALLOPHONES) کی تقسیم سے ملتی جلتی ہے۔ اگرچہ سیبویہ نے اصول اور فروع کی جامع تعریف اور توضیح و تشریح نہیں کی ہے۔(50) سیبویہ نے عربی حروف کے سولہ مخارج بتائے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔(51)

1- اقصاء الحلق : ھمزہ/ء/ہ/ ، /ہ/ اور الف

2- اوسط الحلق : /ع/ اور /ح/ — حلق

3- ادنیٰ مخرج من الفم (حلق کا سامنے کا حصہ) : /غ/ اور /خ/

4- من اقصاء اللسان و مافوق الحنک الاعلی۔ زبان کا پچھلا اور اس کے اوپر متقابل تالو کا حصہ : /ق/

5- زبان کا وہ حصہ جو/ق/کے مخرج سے ذرا نیچے اور اس کے متقابل تالو کا حصہ :/ک/

6- وسط زبان اور متقابل تالو کا حصہ :/ج/-/ش/ اور /ی/

7- زبان کا ابتدائی کنارہ اور متقابل کی داڑھ :/ض/

8- کنارہ زبان کا نچلا حصہ اور مقابل تالو کا حصہ :/ل/

9- زبان کے درمیان وہ حصہ جو اوپر کے اگلے دانتوں سے ذرا اوپر ہے: /ن/

10- /ن/ کے مخرج سے/ل/ کے مخرج کی طرف زبان کا انحراف :/ر/

11- نوک زبان اور اوپر کے اگلے دانتوں کے درمیان : /ت/-/د/-/ط/

12- اوپر کے اگلے دانتوں اور متقابل زبان کے حصے کے درمیان:/س/-/ص/-/ز/-

13- اگلے دانتوں کے کنارے اور متقابل حصہ زبان کے درمیان :/ث/-/ذ/-/ظ/

14- نچلے ہونٹ کے پچھلے حصے اور اوپر کے اگلے دانتوں کے درمیان : /ف/-

15- دونوں ہونٹوں کے درمیان : /ب/-/م/-/و/

16- خیشوم یا ناک کا اندرونی حصہ (بانسا) / نون غنّہ/

اس صوتی تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیبویہ عامل اور مجہول اعضائے صوت کے کردار کی اہمیت سے باخبر تھا اور اجرائے آواز کے عمل میں زبان کے اہم کردار سے بھی واقف تھا۔ آوازوں کی درجہ بندی میں اس نے اعضائے صوت کے کردار کی اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ جو اس کی درجہ بندی کو جدید صوتیات کی درجہ بندی سے قریب تر کر دیتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی سیبویہ کے اس لسانیاتی کارنامے کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " (سیبویہ نے) آوازوں کے درجوں کو مجہول عضو صوت کی نسبت ہی سے موسوم کیا ہے، جیسا کہ جدید صوتیات میں کیا جاتا ہے۔ اس نے صوتیاتی تجزیے کی رو سے عربی کی بنیادی آوازوں کو خصوصاً بنیادی مصمتوں کو حلقی ،لہوی، حنکی، لثوی، غشائی لثوی، اسنانی اور شفوی میں تقسیم کیا ہے۔جدید صوتیات بھی درجہ بندی میں انہی اصطلاحات کے انگریزی مترادفات استعمال کرتی ہے۔ اس کی یہ تقسیم مخارج کے لحاظ سے ہے۔ اسے آواز کی ادائی میں وتران الصوت کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ تاہم وہ

آوازں کو مجہورہ (VOICED) اور مہموسہ (UN-VOICED) میں بھی تقسیم کرتا ہے ------ اس نے عربی آوازوں کی نہج کو ملحوظ رکھ کر بھی درجہ بندی کی ہے اور منحرفہ، غنّہ، مکررہ، منطبقہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، جن کے انگریزی مترادفات LATERAL, VELARIZED, TRILL, NASAL جدید صوتیات میں مستعمل ہیں۔" (52)

سیبویہ نے آوازں کو شدیدہ اور رخوہ کے زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے یہ تقسیم اجرائے آواز کے دوران منہ کی ہیت اور جوف دہن کے حجم یا عامل اور مجہول عضو صوت کے اضافی فاصلے کے لحاظ سے کی ہے۔ بقول پروفیسر خلیل صدیقی " مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیبویہ نے عربی کی بنیادی آوازوں (صوت مصمتوں) کی ماہیت و کیفیت اور خاصیت کے تعین اور تشخص کے لئے چار قسم کی درجہ بندی کی ہے۔ گویا اس نے آواز کو پہچاننے کے لئے چار لیبل لگائے ہیں۔ مخرج، صوت، نہج اور ہیت و حجم دہن کے لیبل ۔ جدید صوتیات اس مطلب کے لئے عموماً پہلے تین لیبل لگاتی ہے۔" (53) سیبویہ نے عربی کی تکلمی آوازوں کی جو درجہ بندی آٹھویں صدی عیسوی میں کی تھی وہ بیسویں صدی عیسوی میں گارڈنر اور جونز کی درجہ بندی کے مطابق ثابت ہوتی ہے۔ کے ۔ آئی ۔ سمان نے اس امر کی نشان دہی کرتے ہوئے سیبویہ اور گارڈنر اور جونز کا تقابل کیا ہے۔ (54) سیبویہ عربی صوتیات کی تاریخ میں بلاشبہ ایک اہم مقام اور حیثیت کا حامل ہے۔ اس نے آٹھویں صدی عیسوی میں عربی زبان کے مطالعے کی ذیل میں صوتیات کے جو مباحث پیش کئے وہ جدید دور کی صوتیات کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔

ابوالقاسم محمود بن عمر المعروف بہ الزمخشری (1075 - 1144ء) سیبویہ کے بعد اہم ماہر صوتیات ہے۔ اس کی کتاب " المفصل " عربی صرف و نحو کی اہم کتاب ہے، جس میں عربی صوتیات کے مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ الزمخشری حروف کی درجہ بندی ، اجراء کے مخارج اور کشادگی دہن کے مدارج کے سلسلے میں سیبویہ سے متفق ہے۔ اس نے صوتیاتی تجزیے کے ذیلی عنوانات قائم کرتے ہوئے سیبویہ کی " الکتاب " کی پیروی کی ہے۔ الزمخشری آوازوں کی تقسیم کرتے ہوئے مجہورہ اور مہموسہ آوازوں کے سلسلے میں سیبویہ سے قدرے اختلاف کرتا ہے۔ اسی طرح

جس طرح سنسکرت قواعد نویسوں نے مذہبی تقاضوں کے تحت زبان کا مطالعہ کیا اور ان کی لسانیاتی کاوشیں بعد میں علمی درجے پر پہنچ گئیں اور مغرب نے ان سے خوب استفادہ کیا اسی طرح عربی نحویوں نے بھی زبان کے مطالعے کا آغاز مذہبی محرکات کے زیر اثر کیا اور اسے علم کا درجہ دیا لیکن مغرب نے عربی لسانیات سے استفادہ نہ کیا۔ البتہ اردو لسانیات پر اصطلاحات کے حوالے سے عربی لسانیات کے کسی قدر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ عربی لسانیات کو اس کی علمی حیثیت اور لسانیاتی کارناموں کی وجہ سے تاریخ لسانیات میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

یورپ میں

یورپ میں لسانی مطالعے کی قدیم روایت کی نوعیت فلسفیانہ رہی ہے جس کا تعلق یونان اور اسکندریہ سے ہے۔ یونان کے فلسفیوں نے زبان کی ماہیت کا فلسفیانہ انداز سے تجزیہ کیا۔ اس ذیل میں اس باب کے ابتدائی صفحات میں اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے، یہاں یورپ میں اس کے بعد کی لسانی روایت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ یونانی رواقیین (STOICS) نے ارسطو اور اس کے مقلدین کے لسانی نظریات سے راہنمائی حاصل کی اور یونانی زبان کی گرامر کی بنیاد رکھی انہوں نے ارسطو کے بتائے ہوئے تین اجزائے کلام یعنی مبتدا، خبر اور کلمات ربط میں چوتھے کا اضافہ کیا اور اسے تنکیر (ARTICLE) کی اصطلاح سے موسوم کیا۔ انہوں نے بنیادی کلمے سے انحراف اور مشتقات کو بھی محسوس کیا۔ انہوں نے فعل کے صیغوں اور طور کے فرق و امتیاز کو بھی پہچانا اور فعل کی لسانیاتی توضیح کی اور یہ بھی دریافت کیا کہ بعض کلمے معنوی لحاظ سے اسم اور فعل دونوں زمروں میں شریک کئے جا سکتے ہیں اور انہیں PARTICIPLE سے موسوم کیا۔ اسکندریہ کے علماء میں ڈائنوسیس تھریکس (دوسری صدی قبل مسیح) کی یونانی گریمر ایک ہزار سال تک اہل یورپ کے لئے نمونے کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ (60) حقیقت یہ ہے کہ قدیم یونانیوں ہی سے مغرب میں گرائمر اور لسانیات کی ابتدائی روایت کا آغاز ہوتا ہے اور یہ روایت لاطینی سے ہوتی ہوئی یورپ کی دیگر زبانوں تک پہنچتی ہے۔ یونانی کے قواعدی نظام اور یونانی اصطلاحات یا ان کے لغوی ترجمے یورپی زبانوں میں اختیار کئے گئے ہیں۔

یونانیوں نے زبان کے مطالعے کی ذیل میں صرف اپنی زبان کو ہی پیش نظر رکھا اور دیگر زبانوں پر توجہ نہ دی اور انہیں یونانی سے کم تر سمجھا۔ انہوں نے یونانی کی ماہیت پر توجہ دی اور گرامر کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش بھی کی لیکن صوتیات کی ذیل میں قابل قدر کارنامہ سر انجام نہ دے سکے۔ انہوں نے آوازوں کے مخارج، گویائی کے مناہج اور آوازوں کی درجہ بندی پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس طرح انہوں نے یونانی کے دیگر زبانوں سے تعلق پر بھی غور نہیں کیا، حالاں کہ فتوحات کے سلسلے میں انہیں دنیا کی دوسری زبانوں کے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہوں گی لیکن ان سے وہ کوئی استفادہ نہ کر سکے۔ اس طرح ان کا مطالعہ یونانی زبان تک ہی محدود رہا۔ اسی لئے ان کے لسانی مباحث میں موضوعات کے اعتبار سے وسعت نہیں ہے۔

رومن ایمپائر میں رومن شہنشاہوں نے عیسائی مذہب قبول کیا تو عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا، اور بائبل کے لاطینی زبان میں ترجمے ہونے لگے۔ رومن فتوحات کے ساتھ عیسائیت کی وسیع علاقے میں اشاعت و تبلیغ شروع ہوئی تو لاطینی زبان سیکھنے اور سکھانے پر توجہ دی جانے لگی اور اس ضرورت کے تحت لاطینی گرامریں مدوّن کی گئیں۔ گویا یورپ میں بھی لسانی مطالعے کے محرکات مذہبی نوعیت ہی کے تھے۔ لاطینی کسی علمی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مذہبی دستاویزات کی تفہیم کے لئے سیکھی جاتی تھی۔ عبرانی بھی عہد نامہ عتیق کی زبان تھی۔ اس لئے عبرانی کی طرف بھی توجہ دی گئی لیکن عبرانی کے لسانی مطالعے کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ اس حوالے سے لاطینی ہی توجہ کا مرکز رہی کیوں کہ وہ شہنشاہوں کی زبان بھی تھی اسی لئے بائبل کے لاطینی زبان میں ترجمے بھی ہوئے اور دیگر زبانوں کے بولنے والوں نے لاطینی ہی کے توسط سے عیسائیت کے اثرات قبول کئے۔ مذہبی تقاضوں کے تحت لاطینی کے مطالعے کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر نصیر احمد خاں لکھتے ہیں:

"چرچ کی مدد سے ایک طرف لاطینی کو فروغ ملا تو دوسری طرف قواعد سے متعلق خیالات پروان چڑھے۔ روم میں شروع کے ایّام سے ہی لاطینی کو پڑھانے کے لئے زبان کے مطالعے پر کافی زور دیا جاتا رہا۔ اس کی اچھی

مثالیں چوتھی صدی عیسوی میں VARRO اور A CLIUS DONATUS اور چھٹی صدی عیسوی میں PRISCIAN کے یہاں ملتی ہیں۔ جنہوں نے لاطینی پڑھانے کے سلسلے میں مختلف رسائل لکھے۔ اس عہد میں تلفظ پر خاص زور دیا گیا۔ قواعد کی تعریف یہ کی جاتی تھی کہ "یہ اچھی طرح بولنے اور لکھنا سکھانے کا فن ہے۔" (61)

ڈونٹس (چوتھی صدی عیسوی) اور پرشین (چھٹی صدی عیسوی) نے لاطینی کی گرامریں مدوّن کیں اگرچہ ان پر یونانی گرامر نویسوں کے گہرے اثرات ہیں تاہم انہوں نے اپنی گرامروں میں جو اصطلاحات استعمال کیں وہ لاطینی کے توسط سے یورپ کی دیگر زبانوں کے مطالعے کی ذیل میں رائج ہو گئیں۔ یورپ کے دیگر علاقوں میں، جہاں لاطینی مادری زبان کی حیثیت سے رائج نہ تھی، لاطینی کا مطالعہ لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ جب لاطینی بول چال کی زبان نہ رہی تب بھی لاطینی کا سیکھنا اور اس کی گرامر پر عبور حاصل کرنا لازمی بلکہ باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم و تدریس پر کلیسا کی اجارہ داری تھی۔ طلباء کو لاطینی پڑھائی جاتی تھی اور اس کی گریمر سکھائی جاتی تھی تاکہ وہ بائبل کے لاطینی ترجمے کی صحیح تفہیم کر سکیں اور گمراہ نہ ہوں۔ علمی دنیا میں بھی لاطینی مرکزی اہمیت کی حامل تھی اور قدیم لاطینی گریمر، خطابت اور منطق کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔ (62) یونان میں عیسائیت روس کے توسط سے پہنچی اس لئے وہاں بھی بائبل کی تفہیم کے لئے لاطینی کا سیکھنا اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے لاطینی گرامر کی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہو گیا۔ اس زمانے میں زبانوں کے آپس کے رشتوں پر توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی زبانوں کی تاریخ یا ان کے ارتقاء میں دلچسپی لی گئی۔ محض لاطینی زبان کی گرامر پر ہی توجہ دی گئی یا لاطینی گرامر کی روشنی میں دوسری زبانوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ دوسری زبانوں کے قواعد دانوں نے زبانوں کی قواعد مدوّن کرنے میں لاطینی گریمر کے نمونوں ہی کو پیش نظر رکھا جس کے اثرات آج بھی یورپی زبانوں کی گرامروں میں نظر آتے ہیں۔ لاطینی گرامر کی پیروی سے کچھ مضر اثرات بھی مرتب ہوئے جن کی نشان دہی کرتے ہوئے، پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں،

" لاطینی گرامر کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ لاطینی کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دی جانے لگی اور لاطینی ہی کے حوالے سے جدید یورپی زبانوں سے متعلق محاکمے ہونے لگے۔ زبانوں کے اپنے صفی و نحوی قاعدوں اور لاطینی قواعد سے اختلاف کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ لاطینی گرامر کی تعلیم منطق کی تعلیم سے کسی طرح کم نہیں سمجھی جاتی تھی یہ خیال تھوڑا بہت درست بھی تھا کیوں کہ اجنبی زبان کی گرامر کی پابندی منطقی نقطۂ نظر پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اس کا مضر اثر یہ بھی ہوا کہ زبان کے منطقی پہلو پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور لاطینی مستعملات سے تصدیق کر کے اجزائے کلام کو منطقی ٹھہرایا جانے لگا۔ ستم یہ ہوا کہ گرامر کے اصول غیر مربوط جملوں کی مثالوں سے سمجھانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ " (63)

اس دور میں لاطینی کے مطالعے سے مجموعی طور پر لسانی مطالعے کی ذیل میں علمی سطح پر کچھ پیش رفت بھی ہوئی جس کی طرف ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اشارہ کیا ہے۔

" اس دور میں زبان پڑھانے کے طریقے وضع ہوئے۔ ادبی معیار قائم کئے گئے۔ زبان کی ابتداء سے متعلق نظریات کو فروغ ملا۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر جو یونانیوں کا خاصہ ہے اس پر بھی زبان کے مطالعے میں زور دیا گیا۔ لفظ اور معنی کی بحث کو نئی جہتیں ملیں۔ فاعل اور فعل کے فرق کو واضح کیا گیا وغیرہ ۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں زبان کا مطالعہ فلسفیانہ انداز فکر کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا۔ " (64)

قدیم ہند میں سنسکرت قواعد نویسوں نے اور عرب میں نحویوں نے مذہبی محرکات کے زیر اثر سنسکرت اور عربی زبانوں کا مطالعہ کیا اور ان زبانوں کی قواعد مدوّن کیں اور ان لسانی

مباحث میں صوتیات کے حوالے سے آوازوں کے مخارج اور آوازوں کی درجہ بندی بھی کی۔ لیکن یورپ میں یونانی یا رومن قواعد نویسوں کی لسانی تصانیف میں صوتیات کے حوالے سے لاطینی یا یونانی زبان کی آوازوں کے مخارج، گویائی کے مناھج اور آوازوں کی درجہ بندی ایسے مسائل پر سرسری مباحث نظر آتے ھیں۔ مغرب میں کئی صدیوں کے بعد قدیم ھند کے سنسکرت قواعد نویسوں سے استفادے کے نتیجے میں صوتیات کی طرف توجہ دی گئی۔ پروفیسر خلیل صدیقی اس حوالے سے لکھتے ھیں:

" قدیم یونانی اور لاطینی صوتیات کی روایتیں برائے نام ھیں۔ افلاطون نے باصدا اور بے صدا آوازوں میں تفریق ضرور کی ھے اور ارسطو اور تھریکس نے باصدا یا مجھورہ (SONANT OR VOICED) اور نیم باصدا (HALF VOICED) آوازوں کا تذکرہ بھی کیا ھے۔ تھریکس اور بعض لاطینی عالموں نے جاریہ (LIQUID) اصوات کی مثالیں بھی دی ھیں۔ لیکن ان سب نے زبان کا صوتیاتی تجزیہ کر کے مخارج اصوات اور طریق اجرا کی توضیح و تشریح اور درجہ بندی نہیں کی ھے۔ گویائی کے سلسلے میں زینو اور ارسطو نے جن ذھنی اعمال کا ذکر کیا ھے وہ سرسری اور مبہم ھیں۔ اس لئے یہ کہنا درست ھے کہ اس قدیم مغربی روایت سے مغربی صوتیات کوئی قابل ذکر استفادہ نہیں کر سکی۔ "(65)

قدیم ھند کی لسانی روایت مستشرقین کے توسط سے مغرب میں متعارف ھوئی اور مغرب کے ماھرین لسانیات نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ قدیم اور متوسط ھند آریائی ادوار میں سنسکرت قواعد دانوں اور لغت نویسوں کے لسانیاتی کارنامے منظر عام پر نہ آ سکے تھے اور مخطوطوں کی شکل میں بکھرے ھوئے تھے۔ وہ لوگ فن طباعت اور نشرو اشاعت سے ناواقف تھے۔ اس لسانیاتی مواد سے وہ اپنے مقاصد یعنی ویدوں کی تفہیم، تو پوری کرتے تھے لیکن برصغیر سے باھر کی دنیا اس سے استفادہ نہیں کر سکی تھی۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں یورپی تاجروں نے برصغیر کا رخ کیا اور ان کے ساتھ عیسائی مبلغ بھی یہاں پہنچے، رفتہ رفتہ ان کے سیاسی اور

تجارتی مقاصد اس علاقے سے وابستہ ہوتے گئے جب انہیں سیاسی غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے یہاں کی زبانوں، تاریخ، مذہب اور کلچر میں دلچسپی لینا شروع کی۔ عیسائی مبلغین نے بھی یہاں کی زبانوں میں دلچسپی لی۔ اس طرح ان کی رسائی سنسکرت کے لسانیاتی خزانوں تک بھی ہوئی ان میں سے بیشتر نے سنسکرت سیکھی، سنسکرت گرامروں کا مطالعہ کیا خود سنسکرت گرامریں اور لغات مرتب کیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے ان مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں کی نشان دہی کی ہے۔

" سولہویں اور سترھویں صدی ہی میں بعض یورپی پادریوں نے سنسکرت میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ مثلاً حسیوٹ رابرٹو دی نوبلی (1577 - 1658ء) نے سنسکرت میں جعلی وید لکھے۔ جرمن جیسوٹ نادر روتھ پہلا یورپی تھا، جس نے سنسکرت گریمر لکھی۔ اس کا انتقال 1668ء میں آگرہ میں ہوا۔ ایک اور جرمن جیسوٹ ارنسٹ ہینگس لیڈن نے جو ہندوستان میں 1699ء سے 1730ء تک قیام پذیر رہا، سنسکرت گریمر مرتب کی۔ فادر پالی نس 1774ء سے 1788ء تک ہندوستان میں رہ کر سنسکرت سیکھتا رہا۔ اس نے سنسکرت زبان و ادب روایات اور کلچر سے متعلق زیادہ سے زیادہ مستند معلومات حاصل کیں۔ امر سنگھ کی مشہور سنسکرت ڈکشنری کے لاطینی ایڈیشن کا ڈول ڈالا اور دو سنسکرت گریمروں کو لاطینی میں منتقل کیا۔ فرانسیسی جیسوٹ، جین فرانکوئس پونس نے اپنے ایک طویل جائزے میں سنسکرت گریمر، فرہنگوں، رسالوں، شاعری، تاریخ اور ویدوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور یہ واضح کیا کہ سنسکرت گریمر، بہترین علوم میں سے ایک علم ہے۔ اطالوی پادری فلپو سے سیتی (1540 - 1588ء) آٹھ سال ہندوستان میں رہ کر سنسکرت میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اور زبان اور منہ کی حرکات کی بنیاد پر سنسکرت کے حروف ابجد کے 53 عناصر کی درجہ بندی کر چکا تھا۔ " (66)

یورپی مستشرقین نے سنسکرت کو اپنے علمی کارناموں کے توسط سے مغربی علماء سے متعارف کرایا جس سے مغرب کے ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور لسانیاتی مطالعے کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ ایک فرانسیسی پادری "کورڈو" نے 1767ء میں " فرنچ انسٹی ٹیوٹ " کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں سنسکرت اور لاطینی کے ایسے الفاظ کی نشاندھی

کی گئی تھی جن میں گہری مماثلت پائی جاتی تھی ۔ اس نے سنسکرت لفظ " اسمی " کی تصریف
کا تقابل لاطینی تصریف کی ملتی جلتی شکلوں سے کیا تھا۔ جس سے سنسکرت اور لاطینی مماثلتوں
کی نشان دہی ہوتی تھی لیکن اس کا یہ مراسلہ چالیس سال بعد شائع ہوا ، جب دیگر ماہرین
لسانیات لاطینی اور سنسکرت کی مماثلت کو منظر عام پر لا چکے تھے۔ مشہور مستشرق ہنری ٹامس
کولبروک 1783ء میں ہندوستان پہنچا۔ اس نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور سنسکرت، قدیم
کلچر اور رسوم پر مضامین لکھے۔ اس نے ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کے 1801ء کے اجلاس میں
" سنسکرت اور پراکرتیں " کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس میں فنی طور پر ہندی، متھیلی ، اڑیا ،
تامل ، کنڑی، مراٹھی ، پنجابی اور برج بھاشا کی خصوصیات بھی بیان کی گئیں تھیں۔ 1805ء
میں اس کی کتاب " سنسکرت زبان کی گریمر " شائع ہوئی۔ اس نے 1801ء میں رگ وید کے مکمل
نسخے اور سائین اچاریہ کی مشہور تفسیر کا مطالعہ شروع کیا اور تین سال کی سخت محنت کے بعد
اپنا مقالہ مکمل کیا جس میں ویدوں کے زمانہ تخلیق اور رگ وید کے مصنفین کی لسانی و ادبی
خصوصیات کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ ایشیاٹک سوسائٹی کے 1804ء کے ایک اجلاس میں
پڑھا گیا اور " ایشیاٹک ریسرچز " کی آٹھویں جلد میں شائع ہوا۔ اس کی بدولت " ہندیات " کے
شائقین کے لئے تحقیق کی نئی راہیں کھل گئیں اور یورپ خصوصاً جرمنی میں ویدک لٹریچر پر
تحقیق و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علمی دنیا میں سنسکرت کے احیاء اور نشاۃ الثانیہ کا سہرا
کولبروک ہی کے سر باندھا جاتا ہے۔ میکس ملر نے اسے عظیم ترین برطانوی مستشرق قرار دیا ہے۔(67)

سر ولیم جونز مستشرقین اور سنسکرت کے ماہرین میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ وہ
ستمبر 1783ء میں سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے کلکتہ پہنچا۔ اسے مشرقی علوم و ادبیات سے
گہری دلچسپی تھی وہ نوجوانی ہی میں اٹھائیس زبانیں سیکھ چکا تھا جن میں عربی اور فارسی
بھی شامل تھیں ۔ ہندوستان پہنچ کر اس نے سنسکرت سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس
نے ہندوستان کی قدیم زبان ، تاریخ اور کلچر پر منظم تحقیقات کی ضرورت محسوس کی اور اس کی
تحریک پر جنوری 1784ء میں ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی

کے سالانہ جلسوں میں اس نے اور دیگر مستشرقین نے ہندوستان کی زبانوں، تاریخ اور کلچر پر تحقیقی مقالات پیش کئے جس سے علم و ادب میں تحقیق کے نئے باب کھل گئے۔ اس سوسائٹی کی منصوبہ بندی کے تحت آثار قدیمہ، سکوں اور مخطوطات کی تلاش، چھان بین اور تحقیق و تدوین کی طرف توجہ دی گئی۔ تحقیقی کاوشیں " Asiatic Miscellany " (اجراء 1786ء) "Asiatic Researches" (اجراء 1789ء) اور "The Journal of the Asiatic Society Calcutta" (اجراء 1832ء) میں شائع ہوتی رہیں۔ اس ادارے کی شاخیں بمبئی اور مدراس میں بھی قائم ہوئیں جن کا الحاق بعد میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن، لندن سے ہو گیا۔ ان شاخوں نے بھی " ہندیات " کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔(68) ایشیاٹک سوسائٹی کی تحقیقی سرگرمیوں کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ یورپ کے علماء، خصوصاً جرمن علماء نے خود کو سنسکرت کے مطالعے کے لئے وقف کر دیا اور ہندوستان، نیپال، سیلون، برما، سیام سے سنسکرت مخطوطات کو اکٹھا کیا اور ان قلمی نسخوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ان کی تدوین کی۔ ویدوں کا مطالعہ کیا اور سنسکرت اور پراکرتوں کی گرامریں اور لغات مدوّن کیں۔ اس طرح ایک علمی و تحقیقی سرگرمی اور بحث و مباحثے کا آغاز ہو گیا۔ اس ضمن میں پروفیسر روتھ، گولڈ اسٹکر، میکس ملر، ویبر، گیل ہورن، راس ڈیوڈ، ڈاکٹر میور، کوہین اولڈن برگ، لڈوگ، ونڈش، جیکوبی، ڈاکٹر ہال، وہٹنے، میکڈانل، ڈاکٹر بوھر ہیورنلے، ڈاکٹر ہیگلنگ، ڈاکٹر روسٹ وغیرہ کی کاوشیں ممتاز نظر آتی ہیں۔" (69)

سر ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے اجلاس میں اپنے تیسرے سالانہ خطبے (فروری 1786ء) میں سنسکرت کی لسانی پختگی، اس کی عظمت و شکوہ اور یونانی، لاطینی اور فارسی سے سنسکرت کی گہری مماثلت اور ان زبانوں کے مشترکہ لسانی ماخذ کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے یہ خطبہ جدید لسانیات کے فروغ کا باعث بن گیا اور اس سے زبانوں کے تقابلی مطالعے کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی ولیم جونز کے اس خطبے کے اہم نکات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" اس نے 1786ء میں یہ تحریر کیا تھا کہ سنسکرت کی قدامت کے متعلق وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ساخت تعجب خیز ہے، جو یونانی کے مقابلے پر زیادہ مکمل ہے اور لاطینی سے زیادہ لطیف۔ سنسکرت اپنے افعال، مادوں اور صرف و نحو کے قاعدوں کے اعتبار سے یونانی اور لاطینی سے اتنی قریب ہے کہ تینوں کو ہم اصل کہا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس متحد ماخذ کا اب وجود نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گاتھک اور کیلٹک زبانیں بھی اس سر چشمے سے سیراب ہوئی ہیں، جو سنسکرت کا ماخذ ہے۔ قدیم فارسی کو بھی زبانوں کے اسی خاندان میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سر ولیم جونز نے زبانوں کا تقابل بالتفصیل پیش نہیں کیا، ہاں تقابلی لسانیات کی ایک نئی راہ ضرور کھول دی۔" (70)

مستشرقین کی لسانیاتی تحقیق کی بدولت مغربی ماہرین لسانیات سنسکرت اور قدیم ہند کے لسانیاتی کارناموں سے روشناس ہوئے تو مغربی لسانیات کی روایت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ مغربی ماہرین لسانیات کو سنسکرت گرامر کے مطالعے کے نتیجے میں لسانیات کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوئیں تو لسانی مطالعے کے رجحان میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق " سنسکرت گرامر کی صوریات اور اشتقاق و تصریف کے مطالعہ سے لسانی ہیتوں کے ارتقاء پر غور کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ اس طرح یورپ میں صوریات کا ارتقاء بہت کچھ سنسکرت گرامر کے مرہون منت ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ یورپ میں سنسکرت کی دریافت، تاریخ لسانیات میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔" (71) سنسکرت اور یورپی/زبانوں میں مماثلتوں کی نشان دھی سے تقابلی لسانیات کو فروغ حاصل ہوا اور ھند یوریی زبانوں کے خاندان میں لسانی رشتوں کا تعین کیا گیا۔ ھند یوریی زبانوں کے متحدہ ماخذ کے تصور نے قدیم ترین متحدہ ماخذ کی استخراجی تشکیل کی طرف توجہ دلائی۔

فریڈرک فان شلیگل نے پیرس میں سنسکرت کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے سنسکرت سے متعلق اپنی تصنیف (1808ء) میں سنسکرت، یونانی ، لاطینی اور جرمانی زبانوں کی مماثلت پر بحث کرتے ہوئے ان زبانوں کے مماثل کلموں کی طویل فہرست دی ہے اور اس بنیاد پر ان زبانوں کو متحد الماخذ قرار دیا ہے اور زبانوں کی اندرونی ساخت کی مماثلت کو ہم نسبی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس نے بہت سی زبانوں کے مطالعے کے بعد انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک گروہ کو سنسکرت اور اس سے مماثل زبانوں پر مشتمل قرار دیا ہے اور دوسرے گروہ میں بقیہ زبانیں شامل کی ہیں۔

ریسمز ریسک نے برصغیر کا سفر کر کے یہاں کی زبانوں کا براہ راست مطالعہ کیا تھا۔ وہ هند یورپی خاندان کی زبانوں کی بنیادی خصوصیات کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے هندیورپی زبانوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے وہ زبانوں کے رشتوں کا تعین کرنے کے لئے محض سرمایہ الفاظ کا تقابل کرنا کافی نہیں سمجھتا بلکہ زبانوں کے نظام کے مطالعے کو ضروری خیال کرتا ہے اور ادو زبانوں کی گرامر کی مماثلت کو ان کے ہم نسب اور متحد الماخذ ہونے کی سند قرار دیتا ہے۔ فرانسز بوپ (1791 - 1867ء) نے پیرس میں سنسکرت کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی پہلی تصنیف " سنسکرت اور یونانی ، لاطینی ، فارسی اور جرمانی کے تصریفی نظام یا گردان کا تقابل " (1816ء) کو تقابلی لسانیات کا نقطہ آغاز خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری تصنیف " سنسکرت، زند ، یونانی ، لاطینی ، گاتھک اور جرمانی زبانوں کی تقابلی گرامر " ہے۔ اسی دور میں ولیم فان همبولٹ (1727 - 1835ء) نے لسانیات عامہ کے موضوعات، زبان کی ماهیت ، زبان کا ارتقاء اور زبانوں کی تشکیلیاتی تقسیم پر اظہار خیال کیا۔ جیکب گرم نے 1819ء میں جرمانی زبانوں ۔ گاتھک، اسکنڈی نیوین، انگریزی، فریسین، ڈچ اور جرمن کی تقابلی گرامر کی پہلی جلد اور 1822ء میں دوسری جلد مکمل کی ۔ آگسٹ فریڈرک پاٹ (1802- 1887ء) کی جرمانی (هندیورپی) تقابلی گرامر شائع ہوئی جس میں وہ سنسکرت مادوں کو بنیادی اهمیت دیتا ہے اور سنسکرت کو قدیم ترین هند یورپی کی نمائندہ زبان قرار دیتا ہے۔

آگسٹ شلیخر کی تصنیف " ہند یورپی زبانوں کی تقابلی گرامر" 1861ء میں شائع ہوئی۔ اس نے زبانوں کو تشکیلیاتی بنیادوں پر اور ہند یورپی زبانوں کو نسبی بنیادوں پر تقسیم کیا ہے۔ اس نے قدیم ترین پروٹو ہند یورپی زبان کی استخراجی تشکیل کی اور ہند یورپی کا " نسبی شجر" تیار کیا۔ (72) یہ ماہرین لسانیات مغربی لسانیات کی روایت میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں، جنہوں نے سنسکرت کے مطالعے کے زیر اثر مغربی لسانیات کی روایت کو سائنٹفک خطوط پر آگے بڑھایا۔

برصغیر میں مستشرقین کی لسانی دلچسپی کے محرکات ابتداء میں مذہبی، تجارتی اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی میں عیسائی مبلغین یورپی مہم جوؤں کے ساتھ برصغیر میں پہنچنا شروع ہوئے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے یہاں کے مقامی باشندوں کی زبانیں سیکھنا اور ان کے رسوم و رواج، رہن سہن، کلچر اور تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عیسائی مشنریوں نے یہاں کی زبانوں میں دلچسپی لینا شروع کی اور مقامی زبانوں کی قواعد اور لغات مرتب کیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی اس ذیل میں یورپین کے مذہبی اور تجارتی اغراض و مقاصد کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> " پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں پرتگالی مہم جو، واسکوڈی گاما ہندوستان کے ساحل پر پہنچا اور پرتگالی مقبوضات بڑھنے لگے۔ اس کے بعد ڈچ اور فرانسیسی اور برطانوی تجارتی کمپنیوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ تجارتی مفادات اور مسیحیت کے تبلیغی جذبات، مشرق شناسی کے محرک ہوئے۔" (73)

یورپ کے تاجر یہاں پہنچے تو انہوں نے تجارت کو فروغ دینے کے لئے مقامی باشندوں سے میل جول بڑھایا اور رفتہ رفتہ اپنی تجارت کو ہندوستان میں پھیلاتے گئے انہوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں بھی قائم کر لیں، اور اپنے تجارتی مفادات کے پیش نظر یہاں کی زبانوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ڈاکٹر ابواللیث کے خیال میں " ہندوستان کی سیاست

اور زبانوں سے دلچسپی کے اور بھی محرکات تھے ان میں تجارت سب سے اہم تھی ۔" (74)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی مفادات رفتہ رفتہ سیاسی ریشہ دوانیوں میں بدلتے گئے اور اسے ہندوستان میں سیاسی غلبہ حاصل ہوتا گیا تو سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کی مقامی زبانوں، تاریخ، رسوم و رواج اور کلچر میں دلچسپی بھی بڑھتی گئی ۔ ڈنکن فاربس کے قواعد ہندوستانی کے مقدمے کے آغاز کی عبارت سے ان اغراض و مقاصد اور ہندوستانی زبانوں میں دلچسپی کے محرکات کا اندازہ ہوتا ہے۔ فاربس لکھتا ہے۔

"اس تالیف کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام حضرات جو ہندوستان کے لئے آمادۂ سفر ہوں ان کے لئے یہاں کی سب سے مفید اور علاقے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کا حصول آسان ہو سکے۔ پچھلے چند سالوں سے ہندوستانی زبان کے مطالعے کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے اب کمپنی کی ملازمت میں ہر جونیر افسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس زبان کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے جس کے بغیر نہ اسے سپاہ کی کمان سپرد کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی اعلیٰ افسری کا عہدہ دیا جا سکتا ہے۔" (75)

ان اغراض و مقاصد کے تحت مستشرقین نے برصغیر کی زبانوں اور یہاں کے مذہب و کلچر اور تاریخ میں دلچسپی لی اور تحقیقی کارنامے سر انجام دئیے لیکن ان کی علمی سرگرمیوں کے اغراض و مقاصد ابتداء میں بنیادی طور پر سیاسی ہی تھے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق،

"ولیم جونز کے مقاصد بنیادی طور پر سیاسی ہی تھے۔ ایک کامیاب جج جسٹس کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم و نسق کو مثالی بنا کر سلطنت کو مستحکم کرنا۔ اس کے مقامی قوانین کے سر چشموں، مذہب، کلچر وغیرہ سے مکمل واقفیت ضروری تھی اور اسی کے لئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام اور "ہندیات" کا گہرا مطالعہ لازمی تھا ۔" (76)

برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے استحکام کے لئے ضروری تھا کہ مقامی لوگوں کی اکثریت

سے ذہنی فاصلے کم کئے جائیں اور ان کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ انگریز ان کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں اور جذباتی سطح پر انہیں مطمئن رکھنے کے لئے بھی ضروری تھا کہ ان کے مذہب ، کلچر اور تاریخ میں دلچسپی ظاہر کی جائے۔ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی ۔ ان کی تحقیقی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں ،

" مغربی دنیا کے تجارتی اور سیاسی مفادات ہندوستان سے سولہویں صدی ہی سے وابستہ ہو گئے تھے اور اٹھارویں صدی کے وسط میں سیاسی اقتدار حاصل ہونے لگا تھا۔ اس اقتدار کے تحفظ اور فروغ کے لئے انگریزوں نے قدیم ہند کی زبانوں اور تہذیب کے مطالعے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی تاکہ اپنی رعایا کی اکثریت کو ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے سے قریب تر کر سکیں اور خالص مشرقی علوم کی نشرو اشاعت اور (PURE ORIENTALISM) کے فروغ سے ذہنی جمود و سکوت طاری کر سکیں۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام، اس کے جرنل اور " انڈین اینٹی کیوری " کے اجراء کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ضمنی طور پر سنسکرت زبان اور کلچر پر علمی تحقیق کی راہیں بھی ہموار ہو گئیں اور ان سے مغرب نے علمی استفادہ بھی کیا۔ " (77)

سولہویں صدی میں عیسائی مشنری ہندوستان پہنچے اور اپنے مذہبی مشن کی ضرورت کے پیش نظر یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں اور ان کے قواعد و لغت مرتب کئے۔ انہوں نے اردو کو جسے وہ ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے تھے، بھی ذریعہ اظہار بنایا کیوں کہ یہ زبان برصغیر کے وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جانے لگی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس زبان کی قواعد اور لغات مرتب کیں۔ سولہویں صدی کے ان عیسائی مبلغین میں ایک نام جیرونیمو زاویر (JERONIMO XAVIER) کا ہے جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں (COMPANIONS OF JESUS) کی تنظیم

سے متعلق تھا اور جہانگیر کے دربار میں بھی پیش ہوا تھا۔ وہ 1586ء اور 1615ء کے درمیان آگرہ میں مقیم رہا۔ اس نے ہندوستانی ، فارسی کا ایک لغت مرتب کیا۔ یہ کتاب 1599ء سے قبل کی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کا عنوان " Vocabularium Portugalico Hindutano-persicum " ہے۔ یہ کتاب اردو کی قدیم لغات اور قواعد میں شمار کی گئی ہے۔ 1600ء اور 1699ء کے درمیان مختلف مشنریوں نے بنگالی ، کنڑی ، کونکنی مالاباری ، سنسکرت ، تامل اور سنگھالی (سنہالی) زبان میں مختلف رسالے لکھے۔ اس دور کے ایک مشنری مصنف انتونیو دی سلدانھا (Antonio de Saldhana) (وفات 1663ء) نے دعاؤں کا ایک مجموعہ کے نام سے ہندوستانی زبان میں لکھا اور کونکنی کی لغات کا ایک رسالہ مرتب کیا۔ اگناسیو آرکامونے (Igmacio Arcamone) (1615 - 1683ء) ایک مشنری مبلغ تھا اس نے کونکنی اور دکھنی (یعنی اردوئے قدیم) کا ایک لغت لکھا اور اس میں لاطینی مترادفات بھی درج کئے۔ اس کے رسالے میں قواعد بھی ہے۔ جاحان دی پیڈروزا (Joao de Pedroza) (1640 - 1672ء) نے اعتراف کے لئے ہدایات لکھیں۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں گیساپے ماریادی برنینی داگاگنانو (Guisappe Maria de Bernini) (1709 - 1761ء) نے ہندوستانی میں کئی کتابیں لکھیں۔ " ہندی ، لاطینی ، اطالوی لغت " اور " اطالوی ہندی لغت " اس کی دو لغت کی کتابیں ہیں۔ اٹھارویں صدی میں فادر کا سیانو دی ماسیراتا (Fr.Cassiano de Macerata) (1708 - 1785ء) نے ہندوستانی زبان کی ایک قواعد Grammatica Hindustana کے نام سے مرتب کی۔ اسی دور میں فرانسس ماری دا تورس (Francois Marie de Tours) نے مترادفات زبان ہندوستانی مرتب کی۔ یوجین تری گوئرس (Eugino Trigueiros) (1686 - 1741ء) نے دو لغات ، " ہندوستانی فارسی لغت " اور " لغت زبان ہندوستانی " مرتب کیں۔ اسٹیفانس پیڈرو (وفات 1766ء) نے ہندوستانی کے حروف تہجی اور اس کے قواعد پر کتاب لکھی اور اطالوی ، ہندوستانی ، ہندوستانی۔ اطالوی لغت مرتب کی۔ مار تینو دا میلو کاسترو (Martino de Meloe Castro) نے ہندوستان کی

مختلف زبانوں کے حروف تہجی پر کتاب لکھی ۔ (78)

ان عیسائی مبلغین نے نہ صرف ہندوستان کی مقامی زبانوں کی قواعد اور لغات مرتب کیں اور مذہبی لٹریچر کی تصنیف و تالیف اور ترجمے کئے بلکہ ان کی نشرو اشاعت کے لئے برصغیر کے مختلف علاقوں میں چھاپے خانے بھی قائم کئے جہاں سے مذہبی لٹریچر بھی شائع ہوتا تھا اور مقامی زبانوں کی قواعد اور لغات کی اشاعت بھی ہوتی تھی ۔ کئی اہم قواعد اور لغات کی اشاعت انہی چھاپہ خانوں کے ذریعے سے ہوئی ۔ (79)

مولوی عبدالحق "جان جوشوا کیٹیلر" کو ہندوستانی زبان کا پہلا یورپین قواعد نویس تسلیم کرتے ہیں اور اس کا سن تصنیف 1715ء قرار دیتے ہیں ۔ (80) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی اس امر سے متفق ہیں ۔ (81) کیٹیلر نے لاطینی زبان میں (Grammatica Indostanica) کے نام سے اردو کی قواعد لکھی ۔ اس کی اشاعت 1743ء میں ہوئی (82) ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری نے میر اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ کیٹیلر کی قواعد اصلاً ڈچ زبان میں تھی جو بعد ازاں لاطینی میں ترجمہ ہوئی ۔ (83) کیٹیلر کی قواعد کے بعد ایک مشنری شلز (Benjamin Schulzino) نے 1741ء میں ہندوستانی زبان کی قواعد (Grammatica Indostanica) کے نام سے مرتب کی ۔ یہ قواعد لاطینی زبان میں ہے ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق انگریزی میں اردو کی قدیم ترین قواعد کا مؤلف مسٹر گلشن ہے اس کا ذکر جان گلکرسٹ نے کیا ہے اس کے بعد مسٹر ہیڈلے نے اردو زبان کی قواعد 1765ء میں لکھی مولوی عبدالحق نے اس کی اشاعت کا سال 1772ء قرار دیا ہے لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا سن اشاعت 1770ء قرار دیتے ہیں ۔ (84)

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو اردو زبان کی لسانی اور ادبی تحقیق کے حوالے سے بہت اہمیت حاصل ہے ۔ 1796ء میں ان کی اردو قواعد A Grammar of the Hindoostani Languages کے نام سے شائع ہوئی ۔ یہ ان کی مجوزہ کتاب ہندوستانی لسانیات کی پہلی جلد کا تیسرا حصہ تھی ، اس کا پہلا حصہ انگریزی ہندوستانی لغت A Dictionary

English and Hindostanic تھی ۔ دوسرا حصہ بطور مقدمہ قواعد و لغت 1798ء میں شائع ہوا ۔ (85) اٹھارویں صدی میں شائع ہونے والی دیگر قواعد میں فرگوسن کی ایک کتاب ہے جو دراصل ہندوستانی زبان کی لغت تھی اور اس میں ہندوستانی قواعد پر ایک مقالہ بھی شامل تھا ۔ ہنری ہیرس کی ہندوستانی قواعد Analysis, Grammar and Dictionary of Hindostany Language 1791ء میں مدراس سے شائع ہوئی ۔ (86)

انیسویں صدی میں شائع ہونے والی ہندوستانی (اردو) زبان کی چند اہم قواعد کی فہرست مولوی عبدالحق (قواعد اردو، مقدمہ) اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (جامع القواعد، مقدمہ ۔ ہندوستانی گرامر، مقدمہ) نے دی ہے ۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (کتابیات قواعد اردو) نے بھی اردو زبان کی قواعد کی ایک طویل فہرست دی ہے جن میں چند اہم قواعد درج ذیل ہیں ۔

1 ۔ ڈف، گرمیسم، بی ۔ بی ۔ (323) ہندوستانی خالص اور ملی جلی بولیوں کی قواعد، س : 1801ء (پہلا ایڈیشن)

2 ۔ روبک، ٹی ۔ (327) انگریزی ہندوستانی لغت مع ہندوستانی زبان کی قواعد، س : 13-1811ء (پہلا ایڈیشن)

3 ۔ شیکسپیر، جون (335) اے گرامر آف ہندوستانی لنگویج، س : 1813ء (پہلا ایڈیشن)

4 ۔ پرائس، کیپٹن ولیم ۔ (314) ۔ ہندوستانی زبان کی نئی قواعد، س : 1828ء (پہلا ایڈیشن)

5 ۔ بری ٹن، ڈبلیو ۔ (308) رسالہ قواعد ہندوستانی، س : 1830ء

6 ۔ ارنات، اسٹینڈفورڈ ۔ (301) جدید خود آموز قواعد ہندوستانی (A New Self Instructing grammar of Hindustanie Tongue) س : 1831ء (پہلا ایڈیشن)

ارنات، اسٹینڈفورڈ ۔ (302) ہندوستانی زبان کی قواعد، س : 1831ء (پہلا ایڈیشن)

7 ۔ بیلنٹائن، جے ۔ آر ۔ (310) ہندوستانی زبان کی قواعد، س : 1838ء (پہلا ایڈیشن)

8 ۔ [illegible] آر ۔ [illegible] (347) ہندوستانی گرامر، س : 1844ء (پہلا ایڈیشن)

9- اسپرینگر- (297) انگریزی ہندوستانی گرمر (قواعد انگریزی ہندوستانی) ، س 1845ء

10- فوربز، ڈنکن- (338) ہندوستانی گرائمر، س 1846ء، پہلا ایڈیشن

11- اسمال، ریورنڈ جارج- (298) گرامر اردو یا ہندوستانی زبان، س 1847ء پہلا ایڈیشن

12- مونیر، ولیمز (358) ، ہندوستانی قواعد ، س 1862ء، پہلا ایڈیشن

13- ڈاسن، جان (Jhon Dowson) ، (322) اردو یا ہندوستانی کی قواعد (قواعد اردو یا ہندوستانی) س : 1872ء (پہلا ایڈیشن)

14- پلیٹس، جان تھامسن- (315) اے گرائمر آف ہندوستانی اور (OR) اردو لنگوئج ، س : 1873ء

15- فان کیو ، پروفیسر (336) ہندوستانی زبان کی گرائمر ، س : 1882ء

16- کیگن ، پادری ڈبلیو (347) ، ہندوستانی گرائمر، س : 1882ء

17- ڈی- اے- سی- (324) ہندوستانی قواعد ، س : 1893ء (87)

اردو (ہندوستانی) قواعد کی تالیف کا مقصد ہندوستان آنے والے اور یہاں سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایسی زبان سکھانا تھا جو یہاں کی عام بول چال کی زبان تھی۔ اس غرض و غایت کا اظہار ڈنکن فوربس نے اپنی تالیف قواعد ہندوستانی کے مقدمے کے آغاز میں کیا ہے۔ جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا گیا ہے۔ اردو (ہندوستانی) کی یہ قواعد اردو زبان میں نہیں ہیں۔ بلکہ پرتگالی ، ولندیزی، لاطینی ، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، مقصد ہی ان زبانوں کے بولنےوالوں کو اردو (ہندوستانی) سکھانا تھا۔ ان قواعد پر لاطینی گرائمر کے اثرات بھی ہیں کیوں کہ ان کے مؤلفین کے سامنے لاطینی گرائمر کے نمونے تھے۔ اس عہد میں یورپ میں لاطینی گرامر کے گہرے اثرات تھے۔ عیسائی مذہب کی کتابیں لاطینی زبان میں تھیں۔ عیسائی مشنری لاطینی پر عبور رکھتے تھے۔ اس لئے اردو (ہندوستانی) قواعد میں سے اکثر پر لاطینی گرائمر کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں قواعد کی کتاب لاطینی میں تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔ بعد ازاں کسی اور زبان میں لکھی بھی گئیں تو لاطینی تلفظ بھی ساتھ دیا

، مثلاً کیٹلر کی قواعد ڈچ زبان میں ہے۔ اس کا لاطینی ترجمہ کیا گیا۔ اس میں ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں، شلز کی قواعد میں ہندوستانی الفاظ عربی اور فارسی خط میں ہیں لیکن ان کا تلفظ لاطینی میں دیا گیا ہے۔ کتاب بھی لاطینی زبان میں ہے۔ ہیڈلے قواعد کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔

" ہیڈلے نے اپنی قواعد میں اصطلاحات صرف انگریزی میں دی ہیں اور ان کے اردو یا فارسی مترادفات درج نہیں کئے ہیں۔ اس زمانے میں انگریزی زبان کے قواعد نویسوں پر لاطینی کے اصولوں اور توضیحات کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اکثر و بیشتر قواعد کی کتابوں میں انہی کو بطور نمونہ پیش نظر رکھا جاتا تھا اور اصطلاحات بھی وہی استعمال ہوتی تھیں۔ چناں چہ بحیثیت مجموعی ہیڈلے کی قواعد بھی انگریزی قواعد نویسی کی روایت کا نمونہ ہے۔" (88)

یہ رجحان صرف ہیڈلے کی قواعد ہی میں نہیں بلکہ اس دور میں یورپین قواعد نویسی کی بیشتر اردو (ہندوستانی) قواعد میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں لکھی گئیں ہندوستانی زبان کی قواعد پر لاطینی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔

" لاطینی اختیار کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت تک یورپ میں لاطینی کی علمی حیثیت اور اہمیت قائم تھی، دوسرے مشنریوں کو اپنی تعلیم و تربیت کے لئے لاطینی کا مطالعہ لازمی طور پر کرنا پڑتا تھا۔ تیسرے جیسا کہ اشارتاً پہلے لکھا جا چکا ہے لاطینی کی قواعد اور اس کے اصول صرف و نحو یورپ کی دوسری زبانوں کے صرف و نحو کی قواعد اور اصولوں کی ترتیب و تدوین کے لئے بطور نمونہ یا معیاری مثال اختیار کئے جاتے تھے۔ اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اس میں اردو کی اصطلاحات کی بجائے لاطینی کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔" (89)

یورپین قواعد نویسوں نے مذہبی ، تجارتی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر اردو (ہندوستانی) اور دیگر مقامی زبانوں کی جو قواعد لکھیں وہ محض یہاں کی زبانیں سیکھنے اور یورپ سے آنے والے عیسائی مشنریوں ، تاجروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو یہاں کی زبانیں سکھانے کے لئے لکھی گئی تھیں ، اس لئے ان قواعدوں کی حیثیت علمی نہیں مدرسانہ ہے اور چوں کہ یہ اردو زبان میں نہیں ہیں اس لئے اردو جاننے والے ان سے استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں قواعد کی تدوین کے ساتھ ساتھ ہندوستان پہنچنے والے یورپین نے لغات بھی مرتب کیں ان میں اردو (ہندوستانی) زبان کی لغات بھی شامل ہیں۔ لغت نویسی کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے جو قواعد نویسی کے تھے یعنی عیسائیت کی اشاعت ، تجارت کے فروغ اور سیاسی استحکام کے لئے مقامی زبانوں پر دسترس حاصل کرنا۔ ابتدائی طور پر لغات کے ساتھ چند صفحات قواعد کے بارے میں شامل کر دئیے جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں مرتب کی گئی ان قدیم ترین لغات کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی دیگر چند اہم لغات درج ذیل ہیں۔

1- فرگوسن ، جے : (163) ڈکشنری آف دی ہندوستانی لنگویج ، (A Dictionary of the Hindustani Language) س : 1773ء لندن

2- گل کرسٹ ، جے۔ بی : (176) اے ڈکشنری۔ انگلش اینڈ ہندوستانی - (A Dictionary, English and Hindustani) س : 1787ء تا 1796ء

3- ہیرس ، ڈاکٹر ہنری : (183) ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی - (Dictionary English and Hindustani) س : 1790ء

4- ہنٹر ، ڈبلیو : (182) اردو انگریزی لغت ، س : 1808ء

5- ٹیلر ، کیپٹن جوزف : (135) ڈکشنری۔ ہندوستانی اینڈ انگلش (Dictionary, Hindustani and English) س : 1808ء

6- میکال اسمتھ ، کارل : (179) ، اردو انگریزی لغت (Urdu-English Dictionary) س : 1820ء

7- کار مائیکل : (173) اردو انگریزی لغت (
س : 1820ء

8- شیکسپیر، جان : (154) ڈکشنری۔ ہندوستان اینڈ انگلش ،
(Dictionary of Hindustani and English) س : 1834ء

9- ڈی روزاریو، پی۔ ایس : (142) صوبہ بنگال میں بولی جانے والی زبانوں کی ڈکشنری
، س : 1837ء

10- آدم، ڈاکٹر ایم۔ ٹی : (104) ، ہندی ، انگلش ڈکشنری (Dictionary
Hindi and English) س : 1838ء

11- تھامسن ، جے۔ ٹی (جوزف) : (132) اردو انگریزی لغات (A Dictionary in
Oordoo and English) س : 1838ء

12- پرائس ناتھے : (115) ہندوستانی انگریزی لغات (Dictionary Hindustani
and English) س : 1847ء

13- یٹس، ڈبلیو : (187) ڈکشنری ہندوستانی اینڈ انگلش (A Dictionary
Hindustani and English) س : 1847ء

14- فیلن، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو : (109) انگریزی اردو قانونی و تجارتی لغات
(An English - Hindustani Law and Commercial Dictionary) س : 1858ء

15- فیلن، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو : (171) نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری (A New
Hindustani - English Dictionary) س : 1879ء

16- ہنٹرل گروو، جی۔ بی : (184) ، انگلش، ہندوستانی ڈکشنری ، (A Vocabulary
English and Hindustani) س : 1865ء

17- فاربس، ڈنکن : (162) ڈکشنری ہندوستانی۔ انگلش ، انگلش ۔ ہندوستانی
(A Dictionary, Hindustani-English, English-Hindustani) س : 1866ء

18- بورڈیلی، جی۔ ای، کیپٹن : (120) اے ووکیبلری انگلش اینڈ ہندوستانی ، س : 1868ء

19- بیٹ، جی۔ ڈی۔ (121) هندی زبان کا لغت (A Dictionary of the Hindi Language) س : 1875ء

20- چارلس، جیمز، لائل :(140) نیو هندوستانی انگلش ڈکشنری ، س : 1879ء

21- فیلن ، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو :(174) اردو، لاطینی اور انگریزی ذخیرۂ الفاظ (A Vocabulary in Urdu, Zatin and English) س : 1882ء

22- فیلن ،ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو :(170) نیو انگلش هندوستانی ڈکشنری (A New English, Hindustani Dictionary) س : 1883ء

23- پلیٹس، جان ٹی ،(123) اے ڈکشنری آف اردو، کلاسیکل هندی اینڈ انگلش ۔ (A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English) س : 1884ء

24- وائٹ ورتھ، جارج کلیفورڈ : (181) اینگلو انڈین ڈکشنری ، س : 1885ء

25- فلوٹ،ڈی۔سی : (184) انگریزی ، هندی ذخیرۂ الفاظ (An Eng-Hind Vocabulary) س : 1911ء (89)

ان لغات میں سے بیشتر میں اردو (هندوستانی) الفاظ کے مترادف دے دئیے گئے هیں اردو الفاظ رومن رسم الخط میں لکھے گئے هیں تاکہ جن کے لئے یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے یورپین ملازمین ، لغات مرتب کی گئی وہ ان سے استفادہ کر سکیں۔ چوں کہ ان لغات کی تدوین کا مقصد علمی نہ تھا اس لئے فن لغت نویسی کے تقاضوں کا اکثر لحاظ نہیں کیا گیا۔ اکثر لغات میں بول چال کی زبان کو سامنے نہیں رکھا گیا۔ بیشتر لغت نویسوں نے اپنے پیش روؤں کی لغات کی کورانہ تقلید کی هے اور خود تحقیق و جستجو نہیں کی جس کے نتیجے میں ان کی لغات میں ان معائب اور غلطیوں کا اعادہ هوتا رہا جو ان کے پیش روؤں کی لغات میں موجود تھیں۔ مثلاً ڈبلیو ییٹس ، ایم۔ٹی۔ آدم، جے۔ ٹی۔ ٹامسن ، رابرٹ شیکسپئر ، این براٹن، ڈبلیو کیگان ، جے۔ ڈی۔ بیٹ کی لغات میں مذکورہ نقائص نظر آتے هیں۔

یورپین لغت نویسوں کی اردو (هندوستانی) لغات میں سے چند ایسی بھی هیں جو بلاشبہ فن لغت نویسی کے تقاضوں کو پورا کرتی هیں۔ جان گلکرسٹ کی انگریزی هندوستانی

لغت دیگر لغات میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے اس کی طباعت 1787ء تا 1796ء لکھی ہے لیکن مولوی عبدالحق اس کا سن اشاعت 1787ء تا 1790ء قرار دیتے ہیں۔ 1796ء گریرسن نے لکھا تھا جس سے مولوی عبدالحق نے اختلاف کیا ہے۔ (90) گلکرسٹ نے انگریزی الفاظ کے معنی رومن اور اردو رسم الخط میں دئیے ہیں، اردو معانی کے ساتھ انگریزی مترادف بھی دیا ہے۔ اس کی نظر میں اردو لغت کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ لغت کی ترتیب میں اس نے دیسی منشیوں سے بھی مدد لی۔ اس نے بول چال کی زبان پر توجہ دی اور ٹکسالی اور معیاری زبان تک محدود نہیں رہا۔ لیکن اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ جن کی نشان دہی پروفیسر خلیل صدیقی نے کی ہے۔(91)

شیکسپئیر، فیلن اور پلیٹس کی لغات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ شیکسپئیر نے اپنی لغت کے پہلے حصے میں اردو الفاظ حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر انگریزی زبان میں تشریحات لکھی ہیں۔ اس نے جوزف ٹیلر کی لغت سے استفادہ کیا ہے لیکن اپنی کاوش سے اسے ٹیلر کی لغت سے بہتر بنا دیا ہے اس نے فن لغت نویسی کے اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ فیلن نے اپنی لغت میں بول چال کے الفاظ پر زیادہ توجہ دی ہے لیکن ادبی زبان کو مصنوعی قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے۔ پلیٹس کی لغت ان سب میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اپنے پیش رؤں سے استفادہ کیا ہے لیکن کورانہ تقلید نہیں کی اس نے لفظوں کا اندراج اردو دیوناگری اور رومن رسم الخط میں کیا ہے۔ معنی و مفہوم کی تشریح انگریزی زبان میں ہے۔ الفاظ جن زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نشان دہی کرنے کے ساتھ اشتقاقیاتی تحقیق بھی کی ہے۔ اس کی لغت اپنی خصوصیات کی وجہ سے زیادہ با اصول، کامل، جامع اور منفرد نظر آتی ہے۔(92)

مولوی عبدالحق فیلن اور پلیٹس کی لغات کو اپنے عہد کی لغات میں نمایاں ترین مقام کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں فیلن نے الفاظ و محاورات کی سند عوام کے گیتوں، زبان زدعام ضرب الامثالوں، اور فقیروں اور اساتذہ کے اشعار سے دی ہے۔ لیکن اس نے ادبی الفاظ سے بے اعتنائی برتی ہے اور لفظ کی اصل اور اشتقاق کی تحقیق پر توجہ نہیں دی۔

پلیٹس کی لغت فیلن سے زیادہ وقیع ہے اس نے الفاظ کے معنوں میں زیادہ تفصیل دی ہے اور ان کے ماخذ اور اصل کی تحقیق بھی کی ہے۔ (93)

یورپین لغت نویسوں کی مقاصد کچھ بھی رہے ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ لغت نویسی کی ذیل میں چند ایسی لغات بھی مدوّن ہوئیں جو فن لغت نویسی کے حوالے سے معیاری لغات کہلائے جانے کی مستحق ہیں جن میں شیکسپیر، فیلن اور پلیٹس کی لغات نمایاں ہیں۔ البتہ ان لغات سے انگریزی داں طبقہ ہی استفادہ کر سکتا ہے۔ لغت نویسی کے اس سلسلے کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ نہ صرف ان کی تقلید میں اردو میں لغات مرتب کی گئیں بلکہ ان لغت نویسوں میں سے چند کے معاونین نے اردو لغت نویسی میں کارہائے نمایاں سر انجام دئیے۔ جن میں فیلن کے معاون سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نمایاں ترین ہیں۔

برصغیر میں مستشرقین نے مخصوص مذہبی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت ایسے لسانیاتی کارہائے نمایاں بھی سر انجام دئیے جو جدید لسانیات کی بنیاد بن گئے۔ یہ لسانیاتی کارنامے منظر عام پر آئے تو مغربی ماہرین لسانیات کے نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور زبانوں کے مطالعے میں سائنٹیفک رجحانات پیدا ہوئے۔ جن کے زیر اثر مغرب میں علم لسانیات نے تیزی سے ترقی کے منازل طے کر کے سائنس کا درجہ حاصل کر لیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق،

> " ہندوستانی زبانوں کے مطالعے اور تحقیق کی طرف یورپین محققین کی توجہ اگرچہ تبلیغی، تجارتی اور سیاسی اغراض و مقاصد کی بنا پر تھی، لیکن اس کے بعد خاص علمی پہلو اور نتائج بھی قابل لحاظ ہیں۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ فن جسے جدید لسانیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں مختلف موضوعات اور مباحث کے علاوہ زبانوں کے تقابلی مطالعہ کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے اس کی داغ بیل ہندوستان میں سنسکرت کے مطالعے سے پڑی۔ " (94)

ولیم جونز کی سنسکرت میں دلچسپی اور اس کے مراسلے کے یورپ میں اثرات، رائل اشیاٹک سوسائٹی کی علمی سرگرمیوں اور مستشرقین کی سنسکرت اور "ھندیات" میں تحقیقی کاوشوں کا اجمالی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ ولیم جونز اور کولبروک کی لسانیاتی تحقیقات کے بعد مستشرقین نے عظیم لسانیاتی کارنامے سر انجام دئیے۔ ھوفر (Hoefer) پہلا مستشرق تھا جس نے 1836ء میں پراکرت گرامر لکھی۔ لے سین (Lassen) کی کتاب "Instiutiones Linguage Pracriticas" جو پراکرتوں کی گرامر تھی، 1837ء میں شائع ہوئی۔ لے سین نے ناقص اور مسخ پراکرتی دستاویزات کے متن کو سمجھا اور انہیں اصل صورت میں مدوّن کیا۔ اس کی یہ تصنیف پراکرت پر متنوع خصوصیات کی حامل اوّلین کتاب ہے۔ 1839ء میں اس کا تکملہ لکھا گیا۔ ویبر نے مہاراشٹری اور ماگدھی زبانوں کی گرامر پر، ایڈورڈ ملر نے اردھ ماگدھی پر اور جیکوبی نے جین مہاراشٹری کی قواعد پر کتابیں لکھیں، سنسکرت قواعدیں بھی مرتب کی گئیں۔ وھٹنے، ویکرینگل، میکڈانل، رینو، ڈبلیو۔ ایسٹ، اسٹیزلر کی قواعدیں نمایاں حیثیت کی حامل ھیں۔ وھٹنے کی "سنسکرت گریمر" 1879ء میں شائع ہوئی جو قدیم ھند آریائی ۔ ویدک زبان، براھمنڈ اور کلاسیکی سنسکرت کی تاریخی گرامر ہے۔ وھٹنے نے اس کے تکملے کے طور پر ایک کتاب "سنسکرت زبان کے مادے، افعال کی ھیئتیں، ابتدائی مشتقات" بھی تالیف کی۔ میکڈانل کی "ویدک گرامر" 1910ء میں شائع ہوئی۔ ویکرینگل کی گرامر کی تین جلدیں بالترتیب 1896ء، 1905ء، اور 1930ء میں شائع ہوئیں۔ "Bothlink" اور روتھ کی سنسکرت زبان کی شہرہ آفاق ڈکشنری، "Petersburg Lexicon" 1855ء اور 1875ء کے درمیان شائع ہوئی۔ اکثر مستشرقین اس ڈکشنری سے استفادہ کرتے رہے ھیں۔ اسی دور میں بوھلر نے قدیم ھند آریائی زبان کے متعلق "انسائیکلو پیڈیا آف انڈو ایرین فلولوجی" مرتب کیا۔ آر۔ پشل کی پراکرت گریمر " Grammatic der Prakrit Sprachen " 1890ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئی جس کا انگریزی میں سبھدر الجھانے ترجمہ کیا۔ انگریزی میں اس کتاب کا نام Comparative Grammar of the Prakrit Language ہے۔

یہ پراکرتوں کی بہترین تقابلی گرامر تسلیم کی جاتی ہے کیوں کہ اس میں پراکرتوں کی اصوات اور تشکیلات کا تفصیل سے تجزیاتی اور تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اے۔ سی۔ وولنر (A.C.Woolner) کی کتاب "پراکرت کا تعارف" (Introduction to Prakrit) میں پراکرتوں کی بنیادی لسانی خصوصیات کا جائزہ لینے کے ساتھ پراکرتوں کے ادبی شاہکاروں سے اقتباس دئیے گئے ہیں۔ ٹی۔ برو (T.Burrow) نے "نیا" سنسکرت (Niya) پر ایک کتاب The Language of Kharoshti Documents کے نام سے لکھی جو 1937ء میں شائع ہوئی۔ Hultzeh کی " Inscription of Asoka " 1935ء میں شائع ہوئی۔ ایم۔ اے۔ مہیندل نے اشوکی کتبوں اور رقعوں کی تقابلی گرامر لکھی۔ (95)

جان بیمز کا عظیم لسانیاتی کارنامہ "جدید ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر" " A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India " کی تین جلدیں 1872ء، 1875ء، اور 1879ء میں شائع ہوئیں۔ اس کی یہ تصنیف سات جدید ہند آریائی زبانیں، ہندی، پنجابی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، اڑیا اور بنگالی زبانوں کی تقابلی گرامر پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ان زبانوں کی لسانی خصوصیات، اشتقاقات اور ارتقائی مدارج پر سیر حاصل مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ ہیورنلے کی "گوڑین زبانوں کی تقابلی گرامر" (A Comparative Grammar of Goudian Languages) 1880ء میں شائع ہوئی۔ ارنسٹ ٹرمپ کی سندھی زبان کی گرامر 1872ء میں شائع ہوئی اس کتاب کا عنوان " A Grammar of the Sindhi Language compared with the Sanskrit - Prakrit - and the Cognate Indian Vernacular " تھا۔ ایس۔ ایچ۔ کیلاگ کی "ہندی زبان کی گرامر" (A Grammar of Hindi Language) 1875ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ادبی ہندی، برج بھاشا اور مشرقی ہندی (اودھی) کی قواعد کے مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ آر۔ کالڈویل کی "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" Comparative Grammar of the Dravidan " 1875ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراوڑی زبانوں پر اس کا

عظیم لسانیاتی کارنامہ ہے۔ ان زبانوں پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں لکھی گئی ۔ اس نے تیس سال کا عرصہ دراوڑی زبانوں کو سمجھنے اور ان کے ادب و دیگر دستاویزات کے مطالعے پر صرف کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف کی ۔ اس میں دراوڑی زبانوں کی لسانی خصوصیات، صوتیات، اشتقاقیات اور ان کے ارتقائی مدارج کا سیر حاصل جائزہ لینے کے ساتھ قدیم دراوڑی ادب کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کا عظیم ترین لسانیاتی کارنامہ گریرسن کا " لسانیاتی جائزہ ہند " ہے۔ (Linguistic Survey of India) ہے جو 1903ء میں شائع ہوا۔ گریرسن نے ایک طویل عرصے تک برصغیر کی زبانوں کے لسانی مطالعے کے بعد ہندوستان کی تمام اہم زبانوں اور بولیوں کا جائزہ اس تصنیف میں پیش کیا ہے جو جدید ہند آریائی زبانوں کی تاریخ اور ارتقائی جائزے اور گروہ بندی پر محیط ہے۔ یہ لسانیاتی کارنامہ گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ " لسانیاتی جائزہ ہند " اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ آج بھی مستند حیثیت کا حامل ہے۔

فرانسیسی ماہر لسانیات " جیولز بلاک نے ہندوستان پہنچ کر مراٹھی زبان اور سنسکرت رزمیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد مراٹھی زبان پر " Formation de la Langue Marathae " تصنیف کی جو 1914ء میں مکمل ہوئی اور 1920ء میں شائع ہوئی ۔ یہ جدید ترین لسانیاتی نقطہ نظر سے لکھی ہوئی پہلی جدید ہند آریائی گرامر تھی ۔ اس کی دوسری تصنیف " ہند آریائی ۔ وید سے جدید زمانے تک " (L'indo-aryan du ved aux temps modernes) 1934ء میں شائع ہوئی ۔ یہ ہند آریائی زبانوں کی جامع تاریخ ہے۔ جیولز بلاک نے جدید لسانیاتی نقطہ نظر سے ہند آریائی زبانوں کا جائزہ لیا ہے۔ آر۔ ایل۔ ٹرنر کی " ہند آریائی زبانوں کی تقابلی لغت (A Comparative Dictionary of Indo Aryan Languages) 1966ء میں شائع ہوئی۔ اسے گریرسن کے " لسانیاتی جائزہ ہند " کا تکملہ قرار دیا جاتا ہے۔ ٹرنر نے اس ڈکشنری کی تالیف کا کام 1916ء میں شروع کیا تھا۔ اس ڈکشنری میں پندرہ ہزار ایسے سنسکرت الفاظ درج کئے ہیں۔

جنہوں نے پالی ، پراکرت اور جدید زبانوں میں مختلف روپ دئے۔ اس طرح اس ڈکشنری میں ہند آریائی کے کم و بیش تین ہزار سال کے ارتقاء کا عکس نظر آ جاتا ہے۔ ٹرنر کی "نیپالی زبان کی اشتقاقیاتی ڈکشنری" 1932ء میں شائع ہوئی۔ یہ ڈکشنری نیپالی زبان میں ملنے والے چھ ہزار ہند آریائی الفاظ کی تقابلی اشتقاقیات پر مشتمل ہے۔ (96)

ہند آریائی زبانوں کے لسانی مطالعے کی ذیل میں لسانیاتی جائزوں اور تصانیف میں اردو زبان کا لسانیاتی جائزہ بھی لیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مستشرقین نے اردو کو زیادہ تر ہندی یا ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چند ماہرین لسانیات نے اردو اور ہندی یا ہندوستانی میں فرق و امتیاز بھی کیا ہے۔ مثلاً جان بیمز نے اپنی تصنیف "جدید ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر" میں ہندی پر جو مباحث پیش کئے ہیں وہ اردو کا احاطہ بھی کرتے ہیں۔ ہندی سے اس کی مراد اردو ہی ہے۔ اس نے اس کتاب کے مقدمے میں اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے اردو کو ہندی کی ادبی بولی قرار دیتے ہوئے اردو اور ہندی میں فرق و امتیاز کی نشان دہی کی ہے (97) ہورنلے نے "گوڑین زبانوں کی تقابلی گرامر" کے مقدمے میں ہند آریائی زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین کرتے ہوئے زبانوں کی گروہ بندی کی ہے۔ اس میں ہندی یا ہندوستانی کی ذیل میں اردو کا لسانی جائزہ بھی لیا ہے۔ کیلاگ نے "ہندی زبان کی گرامر" میں اردو کا ذکر نہیں کیا اور ہندی اور اردو میں فرق و امتیاز کی نشان دہی نہیں کی بلکہ ہندی کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ جو اردو کا احاطہ کرتا ہے۔ گریرسن نے "لسانیاتی جائزہ ہند" کی جلد نہم حصہ اول میں اردو کا ذکر کیا ہے اور اسے ہندوستانی کی ادبی زبان قرار دیا ہے البتہ ہندوستانی کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے جو اردو کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ ٹرنر کے یہاں ہندی سے مراد اردو ہی ہے اس نے "نیپالی زبان کی اشتقاقیاتی ڈکشنری" کے مقدمے میں ہندی کی جو توضیح کی ہے وہ اردو کا احاطہ کرتی ہے۔ "ہند آریائی زبانوں کی تقابلی لغت" میں بھی وہ ہندی سے اردو ہی مراد لیتا ہے۔ جیولز بلاک نے اپنی تصانیف میں ہندی یا ہندوستانی سے اردو ہی مراد لی ہے۔

مستشرقین کے ان لسانیاتی کارناموں سے مغربی ماہرین لسانیات اور ہند و ماہرین لسانیات نے بھرپور استفادہ کیا اور لسانیاتی تحقیق کی ذیل میں کارہائے نمایاں سر انجام دئیے لیکن اردو داں طبقے نے ان لسانیاتی کارناموں سے چنداں استفادہ نہیں کیا۔ اردو کے حوالے سے اردو میں چند ماہرین لسانیات نے ہند آریائی لسانیات سے استفادہ کیا ہے لیکن اس ذیل میں بھی تحقیق کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کسی قدر اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہند آریائی لسانیات سے قابل قدر استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ہند آریائی لسانیات کو اردو داں طبقے سے روشناس کرانے میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔

حواشی ، حوالہ جات : پہلا باب : زبان کے مطالعہ کے عمومی محرکات

1- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات ، (دھلی ، اردو محل پبلی کیشنز، 1990ء) ص 15

2- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ، (مستونگ ، قلات پبلشرز، 1964ء) ص 24

3- ایضاً ، ص 24

4- ایضاً، ص 24

5- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات ، (ایضاً) ص 17

6- ایضاً ، ص 18

7- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 26

8- ایضاً ، ص 25

9- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث، (کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز، 1991ء) ص 111

10- ایضاً ، ص 7

11- ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، (علی گڑھ، سرسید بک ڈپو، 1958ء) ص 29
اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (حصہ صرف) ، (لاھور، مرکزی اردو بورڈ ،
1971ء) ص 17

12- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کی کہانی ، (لاھور، مکتبہ عالیہ، 1975ء) ص 4

13- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث، (ایضاً) ص 144، 145

14- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 25

15- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث، (ایضاً) ص 9

16- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات (ایضاً) ص 15

17- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 112

18- ایضاً ، ص 7-8

19- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات (ایضاً) ص 15

20- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف)، (ایضاً) ص 16

21- ایضاً، ص 17

22- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 146

23- ایضاً، ص 149

24- ایضاً، ص 148

25- ایضاً، ص 149

26- ایضاً، ص 150

27- ایضاً، ص 112

28- ایضاً، ص 113

29- ایضاً، ص 113

30- ایضاً، ص 147

31- ایضاً، ص 114

32- پروفیسر خلیل صدیقی، آواز شناسی، (ملتان، بیکن بکس، 1993ء) ص 126

33- ایضاً، ص 127

34- ایلی، صوتیات قدیم ہند میں، بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی، آواز شناسی (ایضاً) ص 127

35- پروفیسر خلیل صدیقی، آواز شناسی، (ایضاً) ص 128، 129

36- ایضاً، ص 130، 131

37- ایضاً، ص 132

38- ایم۔بی۔ایمینو، "ہندوستان اور لسانیات" جرنل آف دی امریکن اورینٹل سٹڈیز جلد 75 ۔ صفحہ 145 بحوالہ لسانی مباحث، پروفیسر خلیل صدیقی (ایضاً) ص 115

39- مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری، المبین، (لاہور، مکتبہ قادریہ، 1978ء) ص 55

40- ایضاً ، ص 56

41- ایضاً ، ص 56، 57

42- پروفیسر خلیل صدیقی ، مغربی لسانیات کا منفی رویہ مشمولہ سہ ماہی " اردو " شمارہ 2۔ 1982ء (انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی) ص 158 تا 160

43- ایضاً ، ص 163

44- ایضاً ، ص 164

45- مولانا سید سلیمان اشرف بہاری ، المبین ، (ایضاً) ص 70، 71

46- ایضاً ، ص 83

47- مولوی عبدالحق ، قواعد اردو ، (اورنگ آباد ، دکن ، انجمن ترقی اردو ، 1936ء)ص 7، 8

48- پروفیسر خلیل صدیقی ، مغربی لسانیات کا منفی رویہ، مشمولہ سہ ماہی اردو (ایضاً)ص 166، 167

49- ایضاً ، ص 167

50- ایضاً ، ص 167

51- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی (ایضاً) ص 133، 134

52- پروفیسر خلیل صدیقی ، مغربی لسانیات کا منفی رویہ (ایضاً) ص 168

53- ایضاً ، ص 168

54- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی (ایضاً) ص 137

55- ایضاً ، ص 136

56- ایضاً ، ص 137

57- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 17، 18

58- پروفیسر خلیل صدیقی ، مغربی لسانیات کا منفی رویہ(ایضاً) ص 171

59- ڈاکٹر نصیر احمد خاں ، اردو لسانیات (ایضاً) ص 15

60- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 12، 13

61- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات (ایضاً) ص 18

62- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 15

63- پروفیسر خلیل صدیقی، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 30

64- ڈاکٹر نصیر احمد خاں ، اردو لسانیات (ایضاً) ص 19

65- پروفیسر خلیل صدیقی، آواز شناسی (ایضاً) ص 14

66- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 119، 120

67- ایضاً ، ص 152 تا 154

68- ایضاً ، ص 120

69- ایضاً ، ص 122

70- پروفیسر خلیل صدیقی، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 38

71- ایضاً ، ص 37

72- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث، (ایضاً) ص 28.

73- ایضاً ، ص 120

74- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد " مقدمہ " (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، 1971ء) ص 148

75- A grammar of the Hindustani Language - Duncan Forbes L.L.D.
Wm. H.Allen & Co. Booksellers to the Honorable the East India Company,
7, Leaden Hare Street - 1859.

بحوالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ہندوستانی گرامر، مقدمہ (لاہور، مجلس ترقی ادب، 1977ء) ص 7

76- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 25

77- پروفیسر خلیل صدیقی، آواز شناسی (ایضاً) ص 15، 16

78- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ہندوستانی گرامر، مقدمہ، (ایضاً) ص 3، 4

79- ایضاً ، ص 5

80- مولوی عبد الحق، قواعد اردو ۔ (ایضاً) ص 10

81- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (ایضاً) ص 154

82- ایضاً، ص 154

83- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات قواعد اردو، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1985ء) ص 57

84- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (ایضاً) ص 156

85- ایضاً، ص 160

86- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ہندوستانی گرامر (ایضاً) ص 9، 10

87- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات قواعد اردو (ایضاً) ص 52 تا 63
(قوسین میں کتابیات قواعد اردو کے نمبر شمار دئیے گئے ہیں)

88- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ہندوستانی گرامر (ایضاً) ص 9

89- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (ایضاً) ص 155، 156

90- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات لغات اردو، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 37 تا 59 (قوسین میں کتابیات لغات اردو کی نمبر شمار دئیے گئے ہیں)

90- مولوی عبد الحق، لغت کبیر (جلد دوم، حصہ اوّل) مقدمہ، (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1977ء) ص 17

91- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 331، 332

92- ایضاً، ص 334 تا 338

93- مولوی عبد الحق، لغت کبیر (ایضاً) ص 26

94- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد، مقدمہ (ایضاً) ص 149

95- پروفیسر خلیل صدیقی، لسانی مباحث (ایضاً) ص 122، 123، 124

96- ایضاً، ص 127 تا 130

97- جان بیمز، جدید ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر، (دہلی، منشی رام، منوہر لال 1966ء) ص 31،

دوسرا باب

اردو دنیا میں لسانیات کا شعور

اردو دنیا میں، اٹھارویں صدی تک لسانیات سے علمی دلچسپی کا فقدان نظر آتا ہے۔ سترھویں صدی میں جب اہل مغرب/برصغیر میں سنسکرت کے لسانیاتی خزانوں سے فیض یاب ہو رہے تھے اور اٹھارویں صدی میں مستشرقین ہندوستان کی زبانوں کے عمیق مطالعے کے نتیجے میں لسانیاتی کارہائے نمایاں سر انجام دے رہے تھے اور ہندو ماہرین لسانیات بھی اس لسانی مطالعے میں ان کے شریک کار تھے، تو اردو داں طبقہ اس لسانیاتی سرگرمی سے یکسر بے خبر تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اردو داں طبقے کی لسانیات سے عدم دلچسپی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> " افسوس یہ ہے کہ خود برصغیر پاک و ہند میں فارسی اور اردو کے قواعد نویس پانڈنی کے نام اور اس کے کارناموں سے قطعاً نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نظر فارسی اور عربی کے نحویوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ انہی کے افکار و خیالات اور ان کی صرفی و نحوی تشریحات کو وہ اپنے لئے راہ نما قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے قواعد نویس سنسکرت سے واقف نہ تھے اور نہ پراکرتوں اور ان کے ارتقاء کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ نہ انہیں ہند آریائی زبانوں کی اصل و نسل کی تحقیق سے دلچسپی تھی۔ " (۱)

لسانیات سے اردو داں طبقے کی عدم دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ مقامی زبانوں، کلچر، تاریخ اور سنسکرت زبان و ادب سے ذہنی فاصلے رکھتے تھے اور ایرانی تہذیب و ثقافت

اور فارسی زبان و ادب اور اسی کے توسط سے عربی زبان و ادب سے تعلق قائم رکھے ہوئے تھے۔ فارسی عربی کے نحویوں کے علمی کارناموں سے ان کی واقفیت سطحی نوعیت کی تھی اس لئے کہ اگر وہ عربی زبان کے نحویوں کی شہرۂ آفاق تصانیف کا بغائر مطالعہ کرتے تو ان کے لسانیاتی کارناموں سے، جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے، ضرور واقف ہوتے اور اس سے استفادہ کر کے اردو لسانیات کی روایت کو آگے بڑھاتے، تو اردو لسانیات کی روایت، ہندی اور مغربی لسانیات کی روایت کے مقابل آ سکتی تھی۔

سراج الدین علی خان آرزو فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان کی تصانیف فارسی زبان میں ہیں لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق وہ برصغیر کے پہلے مسلمان عالم ہیں، جنہوں نے اپنی تصانیف میں، جستہ جستہ ہی سہی، اردو زبان کی خصوصیات اور سنسکرت اور فارسی زبانوں میں مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے "نوادر الالفاظ"، "سراج اللغات" اور "مثمر" میں قواعد زبان اور سنسکرت اور فارسی میں لسانی مشابہتوں پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے مطابق

"آرزو کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی، ہندوستانی فیلالوجی کے ابتدائی قواعد وضع کئے۔ اور زبانوں کی مماثلت کو دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔ یہ اصول ان کی کتاب مثمر میں بہ تفصیل ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ لغت کی کتابوں میں بھی جہاں موقع ملتا ہے وہ قواعدزبان کی بحثیں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔" (2)

سراج الدین علی خان آرزو نے اپنی لغات اور دیگر تصانیف میں سنسکرت اور فارسی لسانی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ نوادر الالفاظ میں انہوں نے سنسکرت اور فارسی زبانوں کے مماثل الفاظ کی فہرست دی ہے اور مماثل ذخیرۂ الفاظ کی بنیاد پر لسانی رشتوں کے اصول وضع کرتے ہوئے سنسکرت اور فارسی کو ہم نسب زبانیں قرار دیا ہے۔ محض مماثل ذخیرۂ الفاظ کی

بنیاد پر لسانی رشتوں کا تعین کرنا محل نظر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس امر کی نشان دھی کرتے ہوئے لکھتے ھیں ،

" ان میں سے کون سے الفاظ ایسے ہیں جو اصولی اور بنیادی طور پر اس قدیم آریائی زبان سے متعلق ھیں ، جو دو حصوں اور دو شاخوں میں بٹ جانے سے پہلے کی زبان تھی ۔ کیوں کہ اس فہرست میں کچھ ایسے الفاظ بھی مل جائیں گے جو سنسکرت اور ھندی کے ذخیرے میں بعد کی فارسی سے داخل ہوئے۔ اسی طرح وہ الفاظ بھی ھیں جو بعد کی ھندوستانی زبانوں سے فارسی کے خلط ملط کا نتیجہ ھیں ۔ آرزو نے اپنی ساری تحقیق کے باوجود اس امتیاز کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا بلکہ اپنی دریافت کے جوش مسرت سے مغلوب ہو کر عربی الفاظ میں بھی توافق کا اصول جاری کر دیا حالاں کہ اس زبان کے ساتھ ھندی یا سنسکرت کا کوئی رشتہ و پیوند قائم نہیں کیا جا سکتا ۔" (3)

زبانوں کے مماثل ذخیرہ الفاظ کو لسانی اشتراک کی بنیاد نہیں بنانا چاھیے، یہ غیرلسانی نقطہ نظر ھے جس کے نتیجے میں آرزو نے دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبانوں عربی (سامی) اور سنسکرت (آریائی) میں بھی لسانی رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی ۔ یہ الگ بات ھے کہ آرزو نے فارسی اور سنسکرت میں جس لسانی مشابہت کی نشان دھی کی وہ حسن اتفاق سے مستشرقین کی لسانیاتی تحقیق کے مطابق درست ثابت ہوا ، لیکن آرزو نے محض لفظی مماثلت پر دھیان دیا تھا ۔ فارسی اور سنسکرت کا لسانیاتی جائزہ نہیں لیا تھا ۔ جب کہ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے وسط میں کورڈو اور ولیم جونز نے سنسکرت اور دیگر آریائی زبانوں ، جن میں قدیم فارسی زبان بھی شامل ھے، کے لسانی مطالعے کے بعد ان زبانوں میں لسانی رشتوں کی وضاحت کی تھی ۔ آرزو فارسی کے بے مثل عالم تو تھے ھی ، لیکن سنسکرت سے ان کی علمی واقفیت اتنی نہ تھی جتنی مذکورہ مستشرقین کی تھی ، ڈاکٹر سید عبداللہ آرزو کی سنسکرت شناسی کے بارے میں

لکھتے ھیں۔

" آرزو کو سنسکرت زبان میں کہاں تک دسترس تھی اس کا صحیح اندازہ
میں نہیں کر سکا۔ گمان غالب یہ ھے کہ ان کی واقفیت سرسری اور
معمولی تھی۔" (4)

جب کہ اس کے برعکس ولیم جونز سنسکرت کا مستند عالم تھا۔ ان تمام امور کے باوجود یہ تسلیم کرنا چاھیے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اردو اور فارسی داں طبقے میں سنسکرت اور فارسی زبانوں میں لسانی اشتراک کی نشان دھی کرنے کے معاملے میں سراج الدین علی خان آرزو کو اوّلیت کا شرف حاصل ھے اور ان کی فارسی تصانیف میں زبانوں کے حوالے سے جو مباحث ملتے ھیں وہ ان کے لسانی شعور کا پتہ دیتے ھیں، جیسے وہ اردو میں دخیل الفاظ کے بارے میں اس رائے کا اظہار کرتے ھیں کہ وہ الفاظ جو دوسری زبانوں سے اردو میں رائج ھو جائیں انہیں اس صورت میں صحیح تسلیم کرنا چاھیے جیسے وہ عوام و خواص میں مروّج ھیں اور ان کی اصل کی پیروی نہیں کرنا چاھیے ڈاکٹر سید عبد اللہ، دخیل الفاظ کے متعلق آرزو کے وضع کردہ قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ھیں۔

" دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں آرزو کی رائے یہ ھے کہ اس
معاملے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو
اھل زبان (عوام و خواص دونوں) میں رواج پا چکی ھو۔ ایسے لفظوں کے
لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں البتہ یہ ضرور ھے کہ نئی زبان میں
اس کی وہ صورت سامنے رھنی چاھیے جو محض عوام ھی میں مروّج نہ ھو
بلکہ عام و خاص سب کے نزدیک مسلّم ھو چکی ھو۔" (5)

سراج الدین علی خان آرزو کی یہ رائے جدید لسانیاتی نقطہ نظر سے صحیح ھے اور آرزو کی زبانوں کے مطالعے میں دلچسپی اور ان کے لسانی شعور کی پختگی کی دلیل ھے۔

انشا اللہ خاں انشا نے، دخیل الفاظ کے بارے میں آرزو کے قاعدے سے مماثل ایک اصول وضع کیا، بلکہ ان کا اصول امر کی پوری طرح وضاحت کرتا ھے کہ دخیل الفاظ اپنی اصل صورت میں یا

تبدیلیوں کے بعد ، زبان کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں اور قبول عام کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں تو وہ اردو کے ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے انشا لکھتے ہیں۔

> " جاننا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی ، ترکی ہو یا سریانی ، پنجابی ہو یا پوربی ، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح ، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح ۔ اس کی صحت اور اس کی غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیوں کہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو، اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔" (6)

انشا کا یہ اصول اگرچہ ان کے اپنے عہد کے اہل زبان اور فصحا کی نظر میں قابل گرفت ہو گا کیوں کہ اس وقت کے فصحا دخیل الفاظ کو ان کے اصل تلفظ اور معانی کے مطابق استعمال کرنے پر مصر رہتے تھے۔ تاہم جدید لسانیات کی رو سے انشا کا یہ اصول صحیح اور درست ہے اور اس میں تشقیح و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

انشا اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت 1802ء میں تصنیف ہوئی اور 1935ء میں پنڈت دتاتریہ کیفی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں اردو زبان کی قواعد کے علاوہ اردو سے متعلق دیگر اہم مباحث بھی شامل ہیں جو لسانیاتی نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ انشا نے " دریائے لطافت " کے ابتدائی ابواب میں اردو کی مختلف بولیوں میں فرق و امتیاز کی نشان دہی کی ہے۔ ان مباحث میں انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے مختلف طبقوں ، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں ، دہلی میں باہر سے آ کر آباد ہونے والے کشمیریوں ، پنجابیوں ، افغانیوں اور پوربیوں کے لب و لہجے اور روزمرہ و محاورے میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بول چال کی زبان سے مثالیں دی ہیں۔ عورتوں کی زبان ، مردوں کی زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ عورتوں کا سماجی

دائرہ محدود ہوتا ہے۔ جس کا اثر ان کی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ انشا نے عورتوں کی زبان میں اس فرق کی نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کی اردو میں اور پڑھے لکھوں اور ان پڑھوں کی زبان میں امتیاز کیا ہے۔ دہلی کی زبان پر بیرون دہلی کی زبانوں کے اثرات اور مضافات دہلی کی زبانوں پر دہلی کی اردو کے اثرات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ یہ تمام مباحث جدید لسانیات میں " جغرافیائی بولیوں " یا " علاقائی بولیوں " (Area Dilectology) کی ذیل میں آتے ہیں۔ انشاء نے ان مباحث میں دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے اردو کی مختلف بولیوں کا براہ راست مطالعہ کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ دریائے لطافت کے یہ مباحث لسانیاتی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کے حامل ہیں اور جدید لسانیاتی اصول و قواعد کی رو سے درست ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق ،

" یہ اردو کی واحد کتاب ہے جس میں اردو کے مقامی محاوروں کے فرق اور ان کی اہمیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ زبانوں کے مطالعے میں کسی زبان کی مختلف علاقائی بولیوں کا تجزیہ اب لسانیات کا ایک مخصوص موضوع ہے، جسے Area Dilectology کا نام دیا گیا ہے۔ انشا نے دہلی اور لکھنؤ میں اردو بولنے والوں کو ان کی بولیوں اور مخصوص محاوروں کے اعتبار سے الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس ساری بحث سے محسوس ہوتا ہے کہ صوتی اور ترکیبی سطح پر انشا اللہ خاں کا یہ تجزیہ حیرت انگیز حد تک جدید لسانیاتی تجزیے کے مطابق ہے۔ اس سے اس وقت کی رائج اردو کے معیاری نمونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مختلف علاقوں میں بولیوں کے آپس کے اختلافات کی نوعیت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ " (7)

" دریائے لطافت " میں حروف تہجی کے مباحث صوتیات نقطہ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ ان مباحث میں آوازوں کے بجائے حروف سے بحث کی گئی ہے تاہم اس دور میں زبان کے

مطالعے کی ذیل میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جانی چاہیے۔ مغرب میں بھی انیسویں صدی کے ابتدا میں ریسک اور بوپ نے صوتیاتی مباحث کی ذیل میں آوازوں کے بجائے حروف سے ہی بحث کی تھی۔ انشا نے حروف تہجی کی بحث میں مخلوط ہائے ہوز یا ہائیہ آوازوں کو مستقل حیثیت دی ہے یہ تعداد میں سترہ ہیں، اسی طرح انہوں نے فرعی یا ذیلی آوازوں (ایلو فون) کی وضاحت تو نہیں کی، اس دور میں ان سے اس کی توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی، تاہم ذیلی آوازوں کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اردو کے حروف تہجی کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق

"اردو دنیا میں اس طرح کی غیر محسوس صوتی تبدیلی کو پہلی بار انشا اللہ خاں انشا نے بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے اس کی توجیہہ تو نہیں کی، (اس دور کے اردو ادیب یا شاعر سے اس کی توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی) تاہم انہوں نے اسی بنیاد پر اردو کے حروف تہجی کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔" (۶)

گفتگو کے دوران مختلف آوازوں کو ادا کرتے ہوئے عامل عضو صوت کے فنکشن میں خفیف سے فرق کی وجہ سے آوازوں کے مخارج پر اثر پڑتا ہے جس سے آوازوں کے اجراء میں غیر محسوس سا فرق رونما ہوتا ہے، جسے عموماً بولنے اور سننے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا اور یہ تبدیلی "سپیکٹو گراف" ہی کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اصل آواز سے خفیف سی بدلی ہوئی صورت کو فرعی یا ذیلی آواز (ایلو فون) کہتے ہیں۔ انشا نے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ جس سے ان کے غائر لسانی مطالعے اور ذہن کی رسائی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ اردو کو انہوں نے مخلوط زبان قرار دیا ہے۔ زبان کے آغاز کے بارے میں ان کی یہ رائے غیر لسانیاتی ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے اردو کے قواعد کی تدوین کے سلسلے میں انہوں نے بول چال کی زبان کو بھی مدنظر رکھا اور پختہ لسانیاتی شعور سے کام لیتے ہوئے اردو زبان کے حوالے سے جو مباحث پیش کئے وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں اور جدید

لسانیاتی نقطۂ نظر سے درست قرار دئیے جا سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد (1832 - 1910ء) نے اپنے عہد کے مروّجہ قیاسی تصوّرات کے برعکس، اردو کو مخلوط زبان قرار دینے کے بجائے، اسے برج بھاشا کی بیٹی قرار دیا۔ انھوں نے برج اور اردو میں لسانی مماثلتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا۔ انہیں اس امر کا شعور ہے کہ ہر زبان کی اپنی مخصوص ساخت ہوتی ہے البتہ وہ ہمسایہ زبانوں کے اثرات قبول کرتی رہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

" سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اردو کا پتلا بنا ہے باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔۔۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اردو میں آئے تو ان کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیسی کر صورت بدل لی۔ " (9)

اردو کے آغاز کے بارے میں محمد حسین آزاد کے نظریے کو بعد میں اردو کے ماہرین لسانیات نے رد کر دیا۔(10) لیکن یہ حقیقت ہے کہ آزاد نے ملواں زبان کے تصور سے ہٹ کر پہلی بار اردو کا ماخذ کسی دوسری زبان کو قرار دیا اور اردو زبان کی ساخت میں اس کے ماخذ کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں زبانیں میں لسانی روابط کا شعور تھا۔

محمد حسین آزاد کے لسانی شعور کا بھرپور اظہار " سخندان فارس " (1887ء) میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عمومی لسانیات کے مسائل سے تفصیلی بحث کی ہے۔ زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" وہ اظہار خیال کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں ..... زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے رستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے

ہیں ۔۔۔۔ تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے
ہوا پر کھینچی ہے۔" (11)

آزاد نے اردو میں پہلی بار زبانوں کے آپس کے رشتے کو محسوس کر کے انہیں ماں،
بیٹی اور بہنوں کے نام دئیے۔ وہ ایرانی اور ہندی زبانوں کو بہنیں قرار دیتے ہیں جو ایک ماں
کی دو بیٹیاں ہیں۔ (12) وہ ایرانی اور ہندی کو متحد الماخذ قرار دینے کے بعد ان میں
مماثلتوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور لسانی اشتراک کی ذیل میں قریبی رشتہ داروں کے
ناموں اور گنتی کے اعداد کے ناموں میں مماثلت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی
انہوں نے دونوں زبانوں میں لسانی تغیر و تبدل کی صورتوں سے بحث کرتے ہوئے اس حوالے سے
اصول و ضوابط بھی وضع کئے ہیں اور ان کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ عربی زبان کے فارسی
پر اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ہی ہندوستان کی زبانوں پر فارسی کے اثرات کا جائزہ لیا
ہے اور فارسی پر یہاں کی زبانوں کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے خیال میں فارسی کے
اثر سے ہندوستان میں ایک نئی زبان اردو پیدا ہوئی۔ (13)

لسانی تغیرات کی ذیل میں محمد حسین آزاد نے صوتی تبادل کو اہمیت دی ہے۔
انہوں نے صوتی تبادل کی اصطلاح تو استعمال نہیں کی، نہ ہی نطقی آوازوں سے بحث کی ہے
البتہ حروف سے ان کی مراد نطقی آوازیں ہی ہیں۔ ان کے خیال میں جو حروف قریب المخرج
ہیں وہ باہم بدل جاتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں کے افراد کے اعضائے
صوت میں فرق ہوتا ہے اس لئے وہ دوسری زبانوں کے مخصوص حروف کے اجراء پر قادر نہیں ہوتے۔
جس کی وجہ سے وہ حروف قریب المخرج حروف سے بدل جاتے ہیں۔ (14) اس ذیل میں انہوں نے
حروف کے مخارج کی تفصیل بھی دی ہے۔ (15)

محمد حسین آزاد نے مغربی ماہرین لسانیات کے حوالے سے زبانوں کو تین گروہوں،
1۔ آرین 2۔ سیمیٹک 3۔ تورینین، میں تقسیم کیا ہے۔ ابتداء میں زبانوں کی
تقسیم جغرافیائی بنیاد پر اسی طرح کی گئی تھی، بعد میں لسانی خصوصیات کی بنیاد پر زبانوں کی

گروہی تقسیم کی گئی جس کا حوالہ آزاد نے نہیں دیا ہے۔ الفاظ کی بناوٹ کے حوالے سے وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ زبان جمہور کے تابع ہے، فرد واحد لفظ ایجاد نہیں کر سکتا۔ وہ لفظ جو قبول عام کا درجہ حاصل کر لے زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔ البتہ علماء متفقہ طور پر اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے لفظوں کی اشتقاقیات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ دخیل الفاظ میں لفظوں کی صوری و معنوی تبدیلی کی نشان دہی بھی ہے ان کے خیال میں زبانیں تغیر پذیر رہتی ہیں اور جب تک زبان بول چال میں اور تحریر و تقریر میں استعمال ہوتی ہے، زندہ رہتی ہے ورنہ مر جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے مغربی لسانیات سے براہ راست استفادہ تو نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے ولیم جونز کی لسانی دلچسپی کا اور نام لئے بغیر چند دیگر مغربی علمائے لسانیات کا ذکر ضرور کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اہل یورپ کی لسانیاتی سرگرمیوں سے واقف ضرور تھے۔ مغربی لسانیات سے استفادہ کئے بغیر محمد حسین آزاد نے زبانوں کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے پختہ لسانی شعور کا مظہر ہیں لیکن انہوں نے لسانی مطالعے کی ذیل میں زیادہ توجہ نہیں دی۔ اگر وہ اس طرف اپنی توجہ مرکوز کرتے تو اردو لسانیات کی روایت میں قابل قدر اضافہ کر سکتے تھے۔

سیّد احمد دہلوی (1846 - 1918ء) مولفہ " فرہنگ آصفیہ " کی ایک کتاب " علم اللسان " 1900ء میں شائع ہوئی، بعد ازاں ترمیم و اضافے کے ساتھ فرہنگ آصفیہ کے مقدمے میں شامل کی گئی۔ اس کتاب میں لسانی مسائل پر چند اہم مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ زبان کے آغاز کے بارے میں سید احمد دہلوی کا خیال یہ ہے کہ ابتدا میں انسان نے خوشی، غم اور تکلیف کے عالم میں فطاتی آوازیں نکالی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ وہ ابتدائی صوتوں کے اجراء پر قادر ہوا، پھر مظاہر فطرت سے پیدا ہونے والی آوازوں کی نقل کرنے لگا۔ اس نے جانوروں کی آوازوں کی مطابقت سے ان کے نام مقرر کرنا شروع کئے۔ اسماء وضع کرنے کے بعد افعال وضع کئے گئے اور چیزوں کو شمار کرنے کے لئے اعداد مقرر ہوئے۔ اس ذیل میں انہوں نے عمل نطق کی وضاحت بھی کی ہے اور مختلف علاقوں کے باشندوں کے اعضائے نطق میں فرق کی نشان دہی

بھی کی ہے جس کی وجہ سے ایک زبان بولنے والے کسی دوسری زبان کے حروف کے ادراک پر قادر نہیں ہوتے۔ سیّد احمد دہلوی اس کتاب میں آواز اور اس کے معنی میں فطری مطابقت کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ یہ مباحث عربی نحویوں کے یہاں بھی ملتے ہیں اور جدید لسانیات میں صوتی رمزیت (Sound Symbolism) کے ذیل میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سید احمد دہلوی نے اردو سے مثالیں دے کر اس مسئلے کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔

" فرہنگ آصفیہ " کے مقدمے میں سید احمد دہلوی نے اردو کے آغاز کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق برج بھاشا نے اردو نام اختیار کیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ اردو کو مخلوط زبان بھی قرار دیتے ہیں، جس سے تضاد کا اشتباہ ہوتا ہے۔ سید احمد دہلوی نے " علم اللسان " میں جن لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے وہ نئے نہیں ہیں۔ ان کے خیالات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں لسانی مسائل کا شعور تھا۔

مرزا سلطان احمد کی کتاب " زبان " (1916ء) میں لسانیات کے عمومی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں زبان سے مراد وہ الفاظ یا کلمات ہیں جو کسی ملک یا قوم میں مستعمل ہوں اور بول چال میں کام آتے ہوں۔ یہ کلمات معنی اور مفہوم رکھتے ہوں اور انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہوں۔ (11) الفاظ اور کلمات اشارات و کنایات ہیں جو انسان نے نطق کی صلاحیت سے، جو اسے ودیعت کی گئی ہے، مدد لے کر وضع کئے ہیں۔ زبان عطیہ الٰہی ہے جو ابتدا میں تمام دنیا میں ایک ہی تھی لیکن انسانوں کی نقل مکانی سے اس میں اختلاف رونما ہوئے اور یہ شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔ مرزا سلطان احمد نے عمل نطق کی نفسیاتی اور طبعی توضیح کی ہے۔ الفاظ اور معنی کے رشتے کی وضاحت لفظ کو ڈھانچہ اور معنی کو روح قرار دے کر کی ہے اور حرف، لفظ، جملہ، فقرہ، عبارت کو اجزائے زبان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں زبانوں میں ارتقاء اور انحطاط ہوتا رہتا ہے اور زبانیں ضرورت کے مطابق دوسری زبانوں سے استفادہ بھی کرتی رہتی ہیں، جس سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

مرزا سلطان احمد نے " زبان " میں جو مباحث پیش کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے

کہ زبانوں کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت محدود ہے اور وہ لسانیات کی مبادیات سے بھی ناواقف ہیں۔ ان کے خیالات کی بنیاد حقائق و شواہد نہیں محض قیاسات ہیں۔ جو چند زبانوں کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے زبان کے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور زبانوں کے مطالعے میں دلچسپی لی ہے۔ جس سے ان کے لسانی شعور کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کے خیالات عصر حاضر کی جدید لسانیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لسانیات کی مبادیات سے ناواقف اردو داں طبقے سے اس سے زیادہ کی توقع کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اتنا بھی بہت ہے کہ مرزا سلطان احمد نے مسائل زبان میں دلچسپی لے کر اردو لسانیات کی روایت میں کسی قدر اضافہ کیا ہے۔

انیسویں صدی سے پہلے ہی اردو میں لغت اور قواعد زبان پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ اردو کی پہلی لغت میر عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللغات" کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ لغت عہد عالمگیری میں مرتب کی گئی۔ اس میں اردو الفاظ کے معنی اور تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ اس لغت کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو کی "نوادر الالفاظ" کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا سال تصنیف 1165ھ مطابق 1751ء ہے۔ آرزو نے اس کی تالیف کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ "غرائب اللغات" کی غلطیوں اور تسامحات کی تصحیح کی جائے۔ (17) لیکن آرزو نے اس میں جو ترمیم و اضافے کئے ہیں اس سے "نوادر الالفاظ" کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے اور اسے مستقل تالیف کی حیثیت حاصل ہے۔ سیّد عبداللہ نے بہ اعتبار فن آرزو کو اردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار قرار دیا ہے۔ (18) یہ دونوں لغات چونکہ فارسی زبان میں ہیں اس لئے اردو داں طبقہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا ہے۔ اوحدالدین بلگرامی کی "نفائس اللغات" (سن تالیف 1837ء، سن اشاعت 1869ء) اور میر علی اوسط رشک لکھنوی کی "نفس اللغۃ" (تالیف 1844ء) بھی اسی ذیل میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ "نفائس اللغات" میں اردو الفاظ کی شرح فارسی میں اور اس کا مترادف عربی اور فارسی میں دیا گیا ہے۔ "نفس اللغۃ" میں اردو کے الفاظ سے فارسی مترادف دئیے گئے ہیں۔ نیاز علی بیگ کی "مخزن فوائد" (1886ء)

اردو محاورات و اصطلاحات کی لغت ہے۔ منشی چرن جی لال کی تالیف " مخزن المحاورات " (1899ء) بھی اردو محاورات کی لغت ہے۔ (19)

سید احمد دہلوی نے فیلن کے معاون کے طور پر ڈکشنری مرتب کرنے کا کام کیا تھا۔ انہیں لغت کی تدوین کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ انہوں نے اردو کی لغت مرتب کی جس کی پہلی جلد 1887ء میں " لغات اردو " کے نام سے شائع ہوئی اور بعد ازاں چار جلدوں میں " فرہنگ آصفیہ " کے نام سے 1908ء میں شائع ہوئی۔ (20) " فرہنگ آصفیہ " اردو لغت نویسی میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اس عہد میں جب کہ اردو لغت نویسی کی باقاعدہ روایت موجود نہ تھی اس سے بہتر لغت تالیف نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس لغت میں سید احمد دہلوی سے بہت سی لغزشیں اور تسامحات ہوئی ہیں تاہم اس کے باوجود اردو لغت نویسی کی روایت میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے۔

امیر مینائی کی لغت " امیر اللغات " کی پہلی جلد 1891ء میں شائع ہوئی لیکن یہ لغت تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ مولوی نور الحسن نیر کی " نوراللغات " (1924ء) اردو کی عظیم الشان لغت ہے۔ مروجہ الفاظ، متروک الفاظ اور محاورات اس لغت میں شامل کئے گئے ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ اس کے اصل کا حوالہ بھی دیا ہے اور تلفظ کی صحت کے لئے اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔ اردو لغت نویسی کی روایت میں " نور اللغات " نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ خواجہ عبدالحمید کی " جامع اللغات " چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو 1933ء سے 1935ء کے دوران شائع ہوئیں۔ اس لغت میں بول چال کی زبان سے زیادہ کتابی زبان کے الفاظ شامل کئے گئے ہیں اور دخیل الفاظ کے اصل تلفظ پر زور دیا گیا ہے۔ ان لغات کے علاوہ انیسویں صدی کے آخر میں تالیف کی گئی چند اہم لغات درج ذیل ہیں۔

1۔ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی، " سرمایہ زبان اردو " و تحفہ سخنوران " (1889ء)

2۔ شاہ جہاں بیگم ، " خزانتہ اللغات " (1889ء)

3۔ خواجہ اشرف علی ، " اشرف اللغات " (1896ء)

4۔ خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی ، " دستورالشعرا " (1889ء)

۵۔ سیّد تصدق حسین رضوی، " لغات کشوری " (۱۸۹۲ء) (۲۱)

انیسویں صدی میں اردو لغت نویسی پر ان یورپین لغت نویسوں کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں مذہبی، سیاسی اور تجارتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر، یہاں کی مقامی زبانوں سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے لغات مرتب کی تھیں۔ ان لغات کا، گزشتہ باب میں، تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے اکثر لغت نویسوں نے فن لغت نویسی کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھنے کے بجائے مذکورہ یورپین لغت نویسوں کی مرتب کردہ لغات کو پیش نظر رکھ کر اردو لغات مدوّن کیں۔ اور بعد کے لغت نویسوں نے ان اردو لغات کو مثال بنایا اور اس میں کسی قدر اضافہ کرتے رہے۔ مولوی عبد الحق کے مطابق:

" اردو میں اب تک جو لغت کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کر لی ہے اورکچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیا ہے۔" (۲۲)

انیسویں صدی کی لغت نویسی کی روایت میں " فرہنگ آصفیہ " کے علاوہ " امیر اللغات " اور " نور اللغات " ہی ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، بیسویں صدی میں بھی اردو لغت نویسی کی روایت میں قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔ اس دوران جو لغات مرتب کی گئیں ان پر پیش روؤں کی لغات ہی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان میں سے بیشتر لغات کاروباری ضرورت کے تحت مرتب کی گئیں۔ جو عام قاری کی روزمرہ ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے یہ ہے کہ

" اردو کے اب تک جتنے لغت لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب کاروباری ہیں۔ ایک عام قاری کی ان سے ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں لیکن ایک محقق اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے کی تشفی نہیں ہوتی ۔ اردو جیسی پر مایہ زبان کے لئے ایک جامع تاریخی لغت کی ضرورت علمی طبقے میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔" (۲۳)

مولوی عبدالحق نے اردو میں علمی لغت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایک جامع لغت کی تدوین کا کام شروع کیا، اور اس پر کافی کام ہو چکا تھا کہ تقسیم ہندوستان کے دوران بیشتر کام ضائع ہو گیا، پاکستان میں مولوی عبدالحق نے اس لغت پر دوبارہ کام شروع کیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی، جتنا بھی کام ہوا تھا اسے انجمن ترقی اردو نے " لغت کبیر" کے نام سے 1973ء سے شائع کرنا شروع کیا۔ " لغت کبیر" کی چند جلدیں ہی شائع ہوئی ہیں، جن سے اس لغت کی جامعیت اور علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں اردو کے تمام مفرد و مرکب متروک و مروجہ الفاظ، محاورات اور اصطلاحات شامل کی گئی ہیں۔ الفاظ کی مختلف ادوار میں رائج صورتیں دی گئی ہیں اور ان کے ماخذ بتائے گئے ہیں اس طرح لغت کبیر، اشتقاقیاتی لغت کا درجہ حاصل کر گئی ہے۔ اردو لغت بورڈ پاکستان نے " اردو لغت" (تاریخی اصول پر) " کی تدوین کا کام شروع کیا ہے جو پچھلی ربع صدی سے جاری ہے۔ اس لغت کی 1999ء تک تیرہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ اس لغت میں الفاظ کے معنی اور ان کی تشریح دینے کے ساتھ سند کے لئے مثالیں اور حوالے بھی دئیے گئے ہیں۔ مختلف ادوار میں الفاظ کی صورتیں اور معنوں میں رائج تھے ان کی نشان دہی کرتے ہوئے سنین کے ساتھ اس عہد کے ادب سے مثالیں بھی دی گئی ہیں اور الفاظ کے ماخذ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس طرح اس لغت کی حیثیت تاریخی و اشتقاقیاتی ہو جاتی ہے۔ اردو لغت نویسی کے اس دور میں مولوی عبدالحق کی " لغت کبیر" کے بعد یہ " اردو لغت" اہم مقام رکھتی ہے۔

اردو قواعد نویسی کا آغاز ہندوستان میں آنے والے ان قواعد نویسوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مخصوص مذہبی، تجارتی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر یہاں کی مقامی زبانیں سیکھنے کی غرض سے یہاں کی زبانوں کی جن میں اردو بھی شامل تھی، قواعدیں مرتب کیں۔ ان قواعدوں کا اجمالی جائزہ گزشتہ باب میں پیش کیا گیا ۔ اردو میں قواعد نویسی کا آغاز انشاءاللہ خاں انشا کی " دریائے لطافت" سے ہوتا ہے۔ یہ قواعد فارسی زبان میں 1802ء میں لکھی گئی۔ اور اس کا اردو ترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی نے 1935ء میں کیا۔ انشا نے اردو کی قواعد مرتب کرتے

ہوئے عوام و خواص کی زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے دخیل الفاظ کی حیثیت اور زبان کی صحت کے مسائل سے بحث کی ہے اور اردو کی مختلف بولیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ قواعد اردو کی تدوین میں انہوں نے فارسی قواعد کی مثالوں کو سامنے رکھا ہے لیکن اردو کی ساخت اور مزاج کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے " دریائے لطافت " لازوال حیثیت کی حامل ہے۔ مولوی احمد علی دہلوی کی قواعد " فیض کا چشمہ " 1845ء میں طبع ہوئی یہ اردو صرف و نحو پر ایک ابتدائی رسالہ ہے۔ مولوی امام بخش صہبائی دہلوی کی اردو قواعد " رسالہ قواعد صرف و نحو اردو " 1845ء میں شائع ہوئی ۔ یہ قواعد اردو پر اچھی تصنیف ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو قواعد پر بے شمار کتابیں اور رسالے تالیف ہوئے جن میں سے بیشتر تدریسی اداروں کی نصابی ضرورت کے تحت طالب علموں کی سہولت کے لئے تالیف ہوئیں ۔ اس دور میں علمی سطح پر اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ نہیں دی گئی ۔ انیسویں صدی میں اردو قواعد نویسی کی روایت پر عربی فارسی قواعد نویسی اور یورپین کی روایتی گرامر نویسی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس دور کو اردو گرامر کا کلاسیکی و مدرسانہ دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس دور کی اردو قواعدوں کو عربی فارسی کی صرف و نحو کا تتبع قرار دیا ہے اور اس رجحان کی مذمت کی ہے۔ (24) کیوں کہ اردو کا لسانی مزاج عربی فارسی سے مختلف ہے اس لئے اردو کی قواعد کی تدوین کے لئے اردو زبان کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں، اردو گرامر کی حیثیت علمی سے زیادہ عملی رہی ہے اور اس کی وجہ یورپین گرامر نویسوں کے اثرات ہیں۔ عربی فارسی گرامر کی تقلید میں جو قواعدیں مرتب ہوئیں ان میں اردو کو سامی زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ۔ (25)

بیسویں صدی کے آغاز میں قواعد اردو کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ 1901ء میں منشی صاحب نے مدارس میں " قواعد اردو " کے نام سے ایک قواعد مرتب کی ۔ مولوی محمد احسن کی کتاب " قواعد اردو " 1904ء میں شائع ہوئی ۔ 1905ء میں شیخ برکت علی کی " ہندوستانی گرامر " شائع ہوئی ۔ مولوی محمد فتح خاں جالندھری کی " مصباح القواعد " 1904ء میں شائع ہوئی ۔

یہ اس دور کے قواعدوں میں ممتاز ترین حیثیت کی حامل ہے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق عصر حاضر کے اکثر و بیشتر قواعد نویسوں نے فتح محمد جالندھری کی " مصباح القواعد " سے استفادہ کیا ہے۔ (26) یہ قواعدیں بھی کلاسیکی اور مدرسانہ رجحان کی حامل ہیں، سوائے " مصباح القواعد " کے، جو مستند علمی قواعد کا درجہ رکھتی ہے۔ مولوی عبدالحق کی " قواعد اردو " 1914ء اردو کی مستند اور معیاری علمی قواعد ہے۔ انہوں نے اردو قواعد نویسی کے روایتی طرز سے ہٹ کر علمی انداز اختیار کیا، اور عربی فارسی نحو کی تقلید نہیں کی ۔ وہ اردو کی ساخت اور لسانی مزاج سے بخوبی واقف تھے اس لئے انہوں نے جدید مغربی اصول قواعد نویسی سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کی اپنی ساخت اور خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر " قواعد اردو " مدوّن کی ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں " قواعد اردو " کو مولوی عبدالحق کا ایسا کارنامہ قرار دیا ہے جس کی مثال دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ملتی اور اس کا سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب نے قواعد نویسی کے جدید اصول و ضوابط کے مطابق اردو زبان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اردو کی قواعد مرتب کی ہے ۔ (27) " آئین اردو " (1926ء) مولوی محمد زین العابدین فرجاد کوٹانوی کی تالیف ہے۔ مولف " آئین اردو " اردو کے مزاج شناس ہیں اور اصول قواعد نویسی سے بھی واقف ہیں، ان کی اردو قواعد معیاری اور علمی قواعد ہے اور نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ " جامع القواعد " (1971ء) کا حصہ صرف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مدوّن کیا ہے۔ وہ لسانیات کا وسیع مطالعہ اور اردو زبان کے لسانی مزاج سے کامل شناسائی رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید لسانیات کے مطابق اصول قواعد نویسی پیش نظر رکھے ہیں۔ جامع القواعد (1973ء) کا حصہ نحو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے تالیف کیا ہے۔ وہ قواعد نویسی کی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اردو کے لسانی مزاج سے خوب واقف ہیں۔ اس طرح جامع القواعد مستند اور معیاری اردو قواعد ہے جو قواعد نویسی کی روایت میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ گرامر نویسی کے جدید رجحان کی جھلک عصمت جاوید کی " نئی اردو قواعد " (1981ء) اور ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کی " اردو صرف و نحو " (1985ء) میں نظر آتی ہے۔ دونوں قواعدوں کے مولفین کا تعلق

بھارت سے ہے۔ انہوں نے جدید لسانیاتی گرامر نویسی کے رجحان کے زیر اثر اردو کی قواعد مدوّن کی ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو داں طبقے کی لسانی دلچسپی کے موضوعات، لغت و قواعد نویسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے آغاز کے مسائل، تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں، زبان کے مسائل، عمومی لسانیات کی ذیل میں اور اشتقاقیات اور صوتیات کے مسائل، رہے ہیں۔ ابتداء میں اردو دنیا میں لسانیات سے دلچسپی برائے نام ہی رہی ہے لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل کے بعد ان موضوعات میں دلچسپی لی گئی اور کسی حد تک قابل قدر تحقیقی کام بھی ہوا۔ اس ذیل میں یہ امر البتہ قابل غور ہے کہ اردو دنیا میں زبانوں کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بجائے زیادہ تر مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات کے لسانیاتی مطالعوں اور لسانیاتی جائزوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی (1880 ؁ 1946ء) نے " پنجاب میں اردو" (1928ء) میں اردو دنیا میں پہلی بار لسانیاتی طرز استدلال اختیار کرتے ہوئے پنجابی اور اردو کی مماثل لسانی خصوصیات کا تقابل کر کے دونوں زبانوں میں لسانی رشتوں کا تعین کیا۔ انہوں نے گریرسن اور گراہم بیلی کا حوالہ تو نہیں دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو کے پنجابی پن کی نشان دہی گریرسن اور گراہم بیلی، حافظ محمود شیرانی سے پہلے کر چکے تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (1905 ۔ 1962ء) نے یورپ میں قیام کے دوران مغربی ماہرین لسانیات کی زیر نگرانی لسانیات کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کے لئے تحقیقی کام کیا تھا۔ انہوں نے بھی " ہندوستانی لسانیات" (1932ء) میں اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کی نشان دہی کی ہے اور اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یورپ میں قیام کے دوران پروفیسر آر۔ ایل۔ ٹرنر اور ڈاکٹر گراہم بیلی کے مشوروں سے اردو اور پنجابی کے لسانی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ " ہندوستانی لسانیات" میں ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں ڈاکٹر زور نے گریرسن اور ہیورنلے سے استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" (1948ء) میں اردو پر اس کی ہمسایہ زبانوں خصوصاً کھڑی بولی اور ہریانی کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے اردو کے پنجابی پن کو اس کا ہریانی پن قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں سند کے لئے جیولز بلاک کا حوالہ دیا ہے۔ زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں انہوں نے گریرسن، ہیورنلے اور چٹر جی سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے ارتقاء کا سلسلہ پراکرت عہد کی بولی سے جوڑا ہے اور اردو اور پالی کے لسانی رشتوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹر چٹر جی کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ اردو کے ارتقائی مدارج کے مباحث میں انہوں نے جان بیمز کیلاگ، ایس سی، وولنر، بھنڈارکر، بابو رام سکسینہ اور شیام سندر داس سے استفادہ کیا ہے جن کے حوالے ان کی کتاب "اردو زبان کا ارتقاء" (1956ء) میں اکثر مقامات پر ملتے ہیں۔ زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں انہوں نے، گریرسن، ہیورنلے اور شیام سندرداس سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فریدکوٹی نے اردو کو دراوڑی زبان قرار دیا ہے لیکن انہوں نے کاڈویل اور کِٹل کا حوالہ، جنہوں نے دراوڑی زبانوں پر لسانیاتی تحقیق کی ہے، اپنی کتابوں "اردو کا روپ" اور "اردو زبان کی قدیم تاریخ" میں نہیں دیا، لیکن ان حضرات نے دراوڑی زبانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا اور وہ دراوڑی زبانوں سے واقف بھی نہیں ہیں۔ دراوڑی زبانوں سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے ان زبانوں کے بارے میں کسی قسم کی رائے قائم کرنے کے لئے کاڈویل اور کِٹل کی تصانیف سے استفادہ کرنا لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ملتانی اور اردو کے لسانی تعلق کی تحقیق کے سلسلے میں گریرسن سے استفادہ کیا ہے، جس کے حوالے ان کی کتاب "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" (1967ء) میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے "اردو اور سندھی کے لسانی روابط" (1970ء) میں اردو اور سندھی کے لسانی تعلق پر تحقیق کی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ، جان بیمز اور گریرسن سے استفادہ کیا ہے جن کے حوالے ان کی کتاب میں موجود ہیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں اردو کے مذکورہ ماہرین لسانیات نے، اردو کے آغاز و ارتقاء کے نظریات اور اردو کے دیگر زبانوں سے

لسانی روابط کے حوالے سے، اپنے نظریات کے لئے لسانی مواد ، ان نظریات کی تائید کے لئے دلائل، ہمسایہ زبانوں سے مماثل لسانی مواد اور اردو کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کے لئے اردو کے قدیم ترین نمونوں کی مثالوں کے لئے مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات کے لسانیاتی مطالعوں اور لسانیاتی جائزوں سے استفادہ کیا ہے۔

اردو لسانیات میں زبانوں کے عمومی مسائل پر مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے " زبان کا مطالعہ" (1964ء) میں لسانیات کی اہمیت، لسانیات کے مسائل ، اس کے مختلف شعبے اور شاخیں ، اس کا مختلف علوم سے تعلق اور لسانیات کی تاریخ میں اہم ماہرین لسانیات کے کارناموں اور نظریات کے مباحث پیش کئے ہیں، " زبان کا ارتقاء" (1977ء) میں زبان کے آغاز کے مسائل اور اس حوالے سے پیش کئے گئے نظریات، لسانی تغیرات کی صورتیں اور ان کے اسباب، لسانی ارتقاء اور اس کے مدارج کے مباحث پیش کئے ہیں۔ " زبان کیا ہے" (1989ء) میں زبان کے عمومی مسائل، زبان کا نظام اور زبانوں کے مختلف خاندانوں ، ان کی گروہ بندی اور ان کی لسانی خصوصیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ " لسانی مباحث" (1991ء) میں ہند آریائی لسانیات، تاریخی لسانیات، گریمر، ساختیات، معنیات، لغت نویسی اور لسانیات کے دیگر اہم مسائل پر مباحث پیش کئے ہیں اور " آواز شناسی " (1993ء) میں صوتیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے مستشرقین ، ہندو ماہرین لسانیات اور مغربی ماہرین لسانیات سے استفادہ کیا ہے وہ اپنی ہر کتاب کے دیباچے میں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تصنیف کو تالیف قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے" لسانیات کے بنیادی اصول " (1985ء) نے لسانیات کے عمومی مسائل اور لسانیات کی مختلف شاخوں کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے" اردو لسانیات " (1990ء) نے لسانیات کے عمومی مسائل اور اردو صوتیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے" زبان اسلوب اور اسلوبیات" (1983ء) نے اسلوبیات کے مباحث پیش کئے ہیں اور " اردو کی لسانی تشکیل" (1985ء)میں اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل اور اردو صوتیات کے مسائل سے بحث کی ہے۔ اشتقاقیات کی ذیل میں احمد دین بی اے کی

" سرگزشت الفاظ " (1932ء) میں اردو الفاظ کی اشتقاقیات کے مباحث پیش کئے ھیں۔ انھوں نے دیباچے میں پادری ٹریچ سے استفادے کا ذکر بھی کیا ھے۔ ان کتابوں کے علاوہ اردو میں لسانیات کے مختلف موضوعات پر پاکستان اور بھارت کے مختلف رسائل اور جرائد میں مضامین اور مقالات شائع ھوئے ھیں۔اردو دنیا میں برصغیر کی زبانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا گیا ھے۔ جب کہ مستشرقین نے یہاں کی زبانوں کا براہ راست مطالعہ کر کے ان کی تقابلی گرامریں، تقابلی لغات اور لسانیاتی جائزے پیش کئے تھے۔ کئی مستشرقین اسی غرض سے یورپ سے ھندوستان پہنچے اور یہاں زبانوں کے براہ راست مطالعے میں بعض اوقات کئی دھائیوں کا عرصہ صرف کر دیا۔ گزشتہ باب میں اس حوالے سے اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ھے۔ اس عہد میں مستشرقین کے ساتھ ھند و ماھرین لسانیات بھی شامل تھے۔ آج بھی بھارت میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں لسانیات پر کام ھو رھا ھے۔ اردو دنیا میں مستشرقین اور ھند و ماھرین لسانیات کے لسانیاتی کارناموں سے استفادہ تو کیا گیا ھے لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ھوتا ھے کہ ان کے لسانیاتی مباحث کو سمجھا نہیں گیا یا ان کا سرسری مطالعہ کیا گیا ھے۔ جیسے ڈاکٹر سہیل بخاری ("اردو کا روپ" اور "اردو کی کہانی") اور عین الحق فریدکوٹی (اردو زبان کی قدیم تاریخ) میں نظر آتا ھے، انھوں نے ھند آریائی اور دراوڑی زبانوں میں مماثل لسانی عناصر پر ھی نظر رکھی ھے اور یہ دعویٰ کر دیا کہ برصغیر میں ھند آریائی زبانوں کا وجود ھی نہیں ھے اور اردو بھی دراوڑی زبان ہے جب کہ یہ دعویٰ تو کاڈویل نے بھی نہیں کیا تھا جس نے تیس سال کے طویل عرصے میں دراوڑی زبانوں کو سیکھا، سمجھا اور ان کے ادبی دستاویزات کی تفہیم کی تھی۔ اسی طرح ھمارے بعض محققین نے اردو کے مقامی زبانوں سے لسانی روابط کے مباحث میں مقامی زبانوں کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بجائے گریرسن کی سو سالہ پرانی تحقیق پر بھروسہ کیا ھے اور زبان کے نمونے اور مثالیں " لسانیاتی جائزہ ھند " سے لی ھیں۔ " ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق (ڈاکٹر مہر عبدالحق) اس کی ایک مثال ھے۔ اردو کے ماھرین لسانیات کا یہ رویّہ قابل تحسین نہیں ھے۔

اردو دنیا میں سنسکرت ادب اور لسانیات سے براہ راست استفادہ نہیں کیا گیا۔ سنسکرت

سے اردو داں طبقے کا علمی و ادبی ناطہ رہا ہی نہیں ہے۔ اردو کے شاعر و ادیب اور علماء ہمیشہ فارسی کے علمی و ادبی سر چشموں سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ اسی لئے اردو لسانیات کی روایت بھی سنسکرت لسانیات کی روایت سے الگ تھلگ ہی رہی ہے۔ اردو کے ماہرین لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری سنسکرت زبان سے کسی حد تک واقف ضرور تھے لیکن انہوں / نے سنسکرت کے علمی و ادبی خزانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا اور وہ سنسکرت کے عالم بھی نہ تھے۔ اردو دنیا میں اختر حسین رائے پوری سنسکرت کے عالم ضرور تھے لیکن وہ لسانیات سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کا مطالعہ، سنسکرت، پراکرتوں اور اپ بھرنشوں اور ان کے ادب اور دیگر دستاویزات کے مطالعے کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ مستشرقین نے سنسکرت پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے علمی و ادبی خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا، اور مغربی دنیا کو ان سے روشناس کرایا۔ اردو کے ماہرین لسانیات مستشرقین کے واسطے سے سنسکرت اور قدیم ہند آریائی زبانوں سے واقف ہوئے اور انہوں نے اس سے اس حد تک استفادہ کیا جہاں تک اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری تھا، بلکہ اردو کے اکثر ماہرین لسانیات نے مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں کا سطحی مطالعہ کیا ہے۔ مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں کے اردو لسانیات پر اثرات کا اجمالی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو دنیا نے سنسکرت سے بالواسطہ استفادہ کیا ہے۔

اردو کی علمی و ادبی دنیا پر عربی و فارسی علم و ادب کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو لسانیات نے بھی عربی سے اثرات قبول کئے ہیں۔ عربی میں لسانیات کی روایت کا اجمالی جائزہ گزشتہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔ عربی لسانیات میں صوتیات کے جو مباحث ملتے ہیں۔ اردو لسانیات نے ان سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اس ذیل میں اردو لسانیات نے مغربی لسانیات سے فیض اٹھایا ہے۔ مغربی لسانیات پر عربی کے بجائے سنسکرت کے اثرات زیادہ تھے۔ اہل مغرب عربی لسانیات کی روایت سے واقف نہیں تھے۔ اردو لسانیات پر عربی صرف و نحو کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو قواعد نویسوں نے عربی نحویوں کا تتبع کیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں اس حوالے سے اجمالی

جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو قواعد نویسوں نے اردو گرامر کے مباحث میں صرف و نحو کے ذیلی مباحث کی ترتیب عربی و فارسی صرف و نحو کے مطابق رکھی ہے۔ اصطلاحات، تمام تر، عربی و فارسی صرف و نحو سے لی گئی ہیں اور اب تک یہی اصطلاحات رائج ہیں۔ مثلاً اسم، اسم عام، اسم خاص، نکرہ و معرفہ، اسم صفت، اسم جمع، اسم کی حالتیں، فاعلی، اضافی، مفعولی، ظرفی، طوری، ندائی اور ظرفی، اسمائے مشتق، اسم صوت، اسم موصول، اسم ضمیر، فعل، اقسام فعل، لازم اور متعدی، فعل ناقص، معروف اور مجہول، افعال کی صورتیں، خبری، شرطی، احتمالی، حرف، حروف ربط، عطف، تخصیص، فجائیہ ۔ اردو صوتیات میں بھی اصطلاحات عربی سے لی گئی ہیں، جیسے لسان، لہوی، منحرف، مصمت، مسموع، مجہورہ، مہموسہ، صوت، لثوی، غشائی، حلقی، صفیریہ، انفی، مصوتہ، مصمتہ، صحیحہ، تنزیلی مصوتہ، رخوہ، منحرفہ مکررہ، مخرج، ہائیہ، شفوی، حنجری، ارتعاشی، حکائی، حنکی، تعریب، تعریفی ۔ اصطلاحات عربی سے وضع بھی کی گئی ہیں۔ جیسے لسان سے لسانی، لسانیات ۔ صوت سے صوتی، صوتیات۔ معنی سے معنوی، معنویات ۔ اہل اردو نے اصطلاحات کے سلسلے میں عربی سے مدد لی۔ لیکن عربی لسانیات کی روایت سے بھی استفادہ کیا جاتا تو اردو لسانیات کی روایت اتنی محدود، کم مایہ اور مغربی لسانیات سے اتنا پیچھے نہ ہوتی۔

اردو لسانیات کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اردو دنیا میں لسانیات کی طرف دوسرے علوم کی نسبت بہت کم توجہ دی گئی ہے، اور لسانیات کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کے بہت کم اہل علم نے لسانیات کو علمی و فکری سرگرمی کا مرکز و محور سمجھا ہے۔ اردو لسانیات کا دائرہ بھی بہت محدود رہا ہے۔ ہمارے ماہرین لسانیات لغت و قواعد نویسی، اشتقاقیات اور اردو کے آغاز و ارتقاء کے مباحث تک محدود رہے ہیں۔ صوتیات اور مبادیات لسانیات جیسے اہم موضوعات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ لغت نویسی کے سلسلے میں بھی لسانیات کے جدید رجحانات سے اغماض برتا گیا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اردو لغت بورڈ، تاریخی اصولوں پر اردو لغت مرتب کر رہا ہے۔ لیکن اشتقاقیاتی اور تقابلی لغت کی طرف بھی توجہ دینے کی

ضرورت ہے۔ قواعد نویسی کے سلسلے میں روایتی اور مدرسانہ رجحان غالب رہا ہے۔ بیسویں صدی
میں چند ایک قواعد میں علمی رجحان نظر آتا ہے۔ بھارت میں لسانیات کے جدید رجحانات کے
مطابق اردو قواعد بھی مرتب کی گئی ہیں، لیکن تاریخی اور تقابلی گرامر کی طرف توجہ دینے کی
اشد ضرورت ہے۔ ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گراموں ہی نے جدید مغربی لسانیات کی بنیاد
رکھ دی تھی۔ اردو کے آغاز و ارتقاء اور دیگر زبانوں سے اردو کے لسانی روابط کے حوالے سے تاریخی
و تقابلی لسانیات کی ذیل میں تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن تاریخی و تقابلی لسانیات کا دائرہ
صرف اردو کے آغاز و ارتقا کے مباحث تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ اردو میں صوتیات اور مبادیات
لسانیات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ صوتیات کی ذیل میں جستہ جستہ چند مضامین ہی نظر
آتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اس
طرف توجہ دی ہے، لیکن ان کی تصانیف کا بھی ایک محدود حصہ صوتیات کے لئے مخصوص کیا
گیا ہے۔ عتیق صدیقی نے ایچ۔ اے۔ گلیسن کی کتاب کا ترجمہ " توضیحی لسانیات" کے عنوان سے
کیا ہے۔ اردو میں صوتیات پر ایک مستقل تصنیف پروفیسر خلیل صدیقی کی " آواز شناسی" کے
عنوان سے حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ مغرب میں مبادیات لسانیات جیسے اہم موضوع پر
مغرب کے نامور ماہرین لسانیات نے خاصی توجہ دی ہے۔ ان کے اہم لسانیاتی کارنامے عموی
لسانیات کے مباحث کا احاطہ کرتے ہیں اور یہی مغرب میں لسانیات کے فروغ کا باعث بنے ہیں۔
اردو دنیا میں اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مبادیات لسانیات پر جستہ جستہ مضامین کی
صورت میں اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی " زبان کا مطالعہ"، " زبان
کا ارتقاء"، " زبان کیا ہے؟" اور " لسانی مباحث" مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔
یہ لسانیات کی مبادیات، لسانیات کی تاریخ، لسانیات کے جدید رجحانات اور جدید لسانیاتی تکنیک
کے مباحث کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں بعض ماہرین لسانیات نے قابل قدر
کام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو میں لسانیاتی کارنامے خال خال ہی نظر آتے ہیں اور
پروفیسر خلیل صدیقی کا یہ قول حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتا ہے کہ " اردو لسانیات بسم اللہ کے

کہیں ہی میں ہے۔" (28)

اردو دنیا میں لسانیات سے مستقل علمی دلچسپی کا فقدان نظر آتا ہے۔ اردو کے ماہرین لسانیات نے بھی لسانیات میں جزوی دلچسپی لی ہے اور اپنی علمی و فکری سرگرمیوں میں اسے ضمنی حیثیت دی ہے۔ ان کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور اردو ادب میں تخلیق اور تنقید رہے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے افسانہ نگار، نقاد اور محقق بھی تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ماہر لسانیات ہیں اور اردو ادب کے اہم نقاد بھی ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے لسانیاتی کارنامے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں وہاں انہوں نے تنقید و تحقیق اور غالبیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے لسانیات کے ساتھ اردو میں ادبی تحقیق و تنقید کے حوالے سے کام کیا ہے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور لسانیات اور ادب، دونوں ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر گیان چند نے تنقید و تحقیق پر زیادہ اور لسانیات پر کم توجہ دی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور لسانیات ہی رہی ہے۔ انہوں نے ادب کی تنقید و تحقیق پر توجہ نہیں دی ہے چوں کہ اردو دنیا عموی طور پر لسانیات سے بیگانہ رہی ہے اور اردو میں کسی بھی ماہر لسانیات کے لسانیاتی کارنامے اس کی پہچان کا حوالہ نہیں رہے ہیں، اس لئے اردو میں لسانیات سے جزوی دلچسپی اور اسے ضمنی حیثیت دے کر، ادبی تحقیق و تنقید میں گہری دلچسپی لینے کا سبب اپنی شخصیت کی پہچان کرانا اور علمی مقام و مرتبے کو تسلیم کرانا ہے۔

حوالہ جات، حواشی ۔ دوسرا باب : اردو دنیا میں لسانیات کا شعور

1- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد ، (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ، 1971ء) ص 152

2- ڈاکٹر سیّد عبد اللّٰہ، مقدمہ مشمولہ نوادر الالفاظ تصنیف سراج الدین علی خاں آرزو، (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1951ء) ص 15

3- ایضاً ، ص 27

4- ایضاً ، ص 37

5- ایضاً ، ص 37

6- انشا اللّٰہ خاں انشا ، دریائے لطافت، مترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی ، مرتبہ مولوی عبد الحق (کراچی ، انجمن ترقی اردو، 1988ء) ص 353، 354

7- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (ایضاً) ص 173

8- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی ، (ملتان، بیکن بکس، 1993ء) ص 108

9- محمد حسین آزاد ، آب حیات (لاہور، شیخ مبارک علی تاجر کتب، س،ن) ص 6

10- محمد حسین آزاد کا اردو کے آغاز کے بارے میں نظریہ اور اس کا لسانیاتی جائزہ اور اردو کے ماہرین لسانیات کی اس نظریے کی تردید کے مباحث اس مقالے کے چوتھے باب " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات" میں پیش کئے جائیں گے۔

11- محمد حسین آزاد ، سخندان فارس (لاہور، مکتبہ ادب اردو، س،ن) ص 16

12- ایضاً ، ص 12

13- ایضاً ، ص 437

14- ایضاً ، ص 71، 72

15- ایضاً ، ص 78

16- مرزا سلطان احمد ، زبان ، (لاہور، مرغوب ایجنسی ، 1923ء) ص 1

17- سراج الدین علی خاں آرزو، دیباچہ نوادر الالفاظ مرتبہ سیّدعبداللّٰہ (ایضاً) ص 3

18- ڈاکٹر سیّدعبداللّٰہ، نوادر الالفاظ، مقدمہ (ایضاً) ص 16

19- مولوی عبدالحق، لغت کبیر، مقدمہ (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان،) ص 37، 38

20- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات لغات اردو (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 17

21- ایضاً، ص 9 تا 20

22- مولوی عبدالحق، لغت کبیر، مقدمہ (ایضاً) ص 54

23- ڈاکٹر شوکت سبزواری، تعارف لغت کبیر مرتبہ مولوی عبدالحق (ایضاً) ص 12

24- مولوی عبدالحق، قواعد اردو، (اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، 1936ء) ص 19

25- ڈاکٹر شوکت سبزواری، " اردو قواعد کی ترتیب نو" مشمولہ لسانی مسائل (کراچی، مکتبہ اسلوب، 1962ء) ص 21

26- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) مقدمہ (ایضاً) ص 179، 180

27- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، 1973ء) ص ک

28- پروفیسر خلیل صدیقی، اپنی بات، مشمولہ زبان کیا ہے؟ (ملتان، بیکن بکس، 1989ء) ص 7

دوسرا باب

اردو دنیا میں لسانیات کا شعور

اردو دنیا میں، اٹھارویں صدی تک لسانیات سے علمی دلچسپی کا فقدان نظر آتا ہے۔ سترھویں صدی میں جب اہل مغرب/برصغیر میں سنسکرت کے لسانیاتی خزانوں سے فیض یاب ہو رہے تھے اور اٹھارویں صدی میں مستشرقین ہندوستان کی زبانوں کے عمیق مطالعے کے نتیجے میں لسانیاتی کارہائے نمایاں سر انجام دے رہے تھے اور ہندو ماہرین لسانیات بھی اس لسانی مطالعے میں ان کے شریک کار تھے، تو اردو داں طبقہ اس لسانیاتی سرگرمی سے یکسر بے خبر تھا۔ اکثر ابواللیث صدیقی اردو داں طبقے کی لسانیات سے عدم دلچسپی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> " افسوس یہ ہے کہ خود برصغیر پاک و ہند میں فارسی اور اردو کے قواعد نویس پانتی کے نام اور اس کے کارناموں سے قطعاً نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نظر فارسی اور عربی کے نحویوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ انہی کے افکار و خیالات اور ان کی صرفی و نحوی تشریحات کو وہ اپنے لئے راہ نما قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے قواعد نویس سنسکرت سے واقف نہ تھے اور نہ پراکرتوں اور ان کے ارتقاء کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ نہ انہیں ہند آریائی زبانوں کی اصل و نسل کی تحقیق سے دلچسپی تھی۔ " (۱)

لسانیات سے اردو داں طبقے کی عدم دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ مقامی زبانوں، کلچر، تاریخ اور سنسکرت زبان و ادب سے ذہنی فاصلے رکھتے تھے اور ایرانی تہذیب و ثقافت

اور فارسی زبان و ادب اور اسی کے توسط سے عربی زبان و ادب سے تعلق قائم رکھے ہوئے تھے۔ فارسی عربی کے نحویوں کے علمی کارناموں سے ان کی واقفیت سطحی نوعیت کی تھی اس لئے کہ اگر وہ عربی زبان کے نحویوں کی شہرۂ آفاق تصانیف کا بغائر مطالعہ کرتے تو ان کے لسانیاتی کارناموں سے، جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے، ضرور واقف ہوتے اور اس سے استفادہ کر کے اردو لسانیات کی روایت کو آگے بڑھاتے، تو اردو لسانیات کی روایت، ہندی اور مغربی لسانیات کی روایت کے مقابل آ سکتی تھی۔

سراج الدین علی خان آرزو فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان کی تصانیف فارسی زبان میں ہیں لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق وہ برصغیر کے پہلے مسلمان عالم ہیں، جنہوں نے اپنی تصانیف میں، جستہ جستہ ہی سہی، اردو زبان کی خصوصیات اور سنسکرت اور فارسی زبانوں میں مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے "نوادر الالفاظ"، "سراج اللغات" اور "مثمر" میں قواعد زبان اور سنسکرت اور فارسی میں لسانی مشابہتوں پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے مطابق

"آرزو کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی، ہندوستانی فیلالوجی کے ابتدائی قواعد وضع کئے۔ اور زبانوں کی مماثلت کو دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔ یہ اصول ان کی کتاب مثمر میں بہ تفصیل ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ لغت کی کتابوں میں بھی جہاں موقع ملتا ہے وہ قواعدزبان کی بحثیں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔" (2)

سراج الدین علی خان آرزو نے اپنی لغات اور دیگر تصانیف میں سنسکرت اور فارسی لسانی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ نوادر الالفاظ میں انہوں نے سنسکرت اور فارسی زبانوں کے مماثل الفاظ کی فہرست دی ہے اور مماثل ذخیرۂ الفاظ کی بنیاد پر لسانی رشتوں کے اصول وضع کرتے ہوئے سنسکرت اور فارسی کو ہم نسب زبانیں قرار دیا ہے۔ محض مماثل ذخیرۂ الفاظ کی

بنیاد پر لسانی رشتوں کا تعین کرنا محل نظر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس امر کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" ان میں سے کون سے الفاظ ایسے ہیں جو اصولی اور بنیادی طور پر اس قدیم آریائی زبان سے متعلق ہیں، جو دو حصوں اور دو شاخوں میں بٹ جانے سے پہلے کی زبان تھی۔ کیوں کہ اس فہرست میں کچھ ایسے الفاظ بھی مل جائیں گے جو سنسکرت اور ہندی کے ذخیرے میں بعد کی فارسی سے داخل ہوئے۔ اسی طرح وہ الفاظ بھی ہیں جو بعد کی ہندوستانی زبانوں سے فارسی کے خلط ملط کا نتیجہ ہیں۔ آرزو نے اپنی ساری تحقیق کے باوجود اس امتیاز کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا بلکہ اپنی دریافت کے جوش مسرت سے مغلوب ہو کر عربی الفاظ میں بھی توافق کا اصول جاری کر دیا حالاں کہ اس زبان کے ساتھ ہندی یا سنسکرت کا کوئی رشتہ و پیوند قائم نہیں کیا جا سکتا۔" (3)

زبانوں کے مماثل ذخیرہ الفاظ کو لسانی اشتراک کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، یہ غیرلسانی نقطہ نظر ہے جس کے نتیجے میں آرزو نے دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبانوں عربی (سامی) اور سنسکرت (آریائی) میں بھی لسانی رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ آرزو نے فارسی اور سنسکرت میں جس لسانی مشابہت کی نشان دہی کی وہ حسن اتفاق سے مستشرقین کی لسانیاتی تحقیق کے مطابق درست ثابت ہوا، لیکن آرزو نے محض لفظی مماثلت پر دھیان دیا تھا۔ فارسی اور سنسکرت کا لسانیاتی جائزہ نہیں لیا تھا۔ جب کہ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے وسط میں کورڈو اور ولیم جونز نے سنسکرت اور دیگر آریائی زبانوں، جن میں قدیم فارسی زبان بھی شامل ہے، کے لسانی مطالعے کے بعد ان زبانوں میں لسانی رشتوں کی وضاحت کی تھی۔ آرزو فارسی کے بے مثل عالم تو تھے ہی، لیکن سنسکرت سے ان کی علمی واقفیت اتنی نہ تھی جتنی مذکورہ مستشرقین کی تھی، ڈاکٹر سید عبداللہ آرزو کی سنسکرت شناسی کے بارے میں

لکھتے ھیں۔

" آرزو کو سنسکرت زبان میں کہاں تک دسترس تھی اس کا صحیح اندازہ میں نہیں کر سکا۔ گمان غالب یہ ھے کہ ان کی واقفیت سرسری اور معمولی تھی۔ " (4)

جب کہ اس کے برعکس ولیم جونز سنسکرت کا مستند عالم تھا۔ ان تمام امور کے باوجود یہ تسلیم کرنا چاھیے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اردو اور فارسی داں طبقے میں سنسکرت اور فارسی زبانوں میں لسانی اشتراک کی نشان دھی کرنے کے معاملے میں سراج الدین علی خان آرزو کو اوّلیت کا شرف حاصل ھے اور ان کی فارسی تصانیف میں زبانوں کے حوالے سے جو مباحث ملتے ھیں وہ ان کے لسانی شعور کا پتہ دیتے ھیں، جیسے وہ اردو میں دخیل الفاظ کے بارے میں اس رائے کا اظہار کرتے ھیں کہ وہ الفاظ جو دوسری زبانوں سے اردو میں رائج ھو جائیں انہیں اس صورت میں صحیح تسلیم کرنا چاھیے جیسے وہ عوام و خواص میں مروّج ھیں اور ان کی اصل کی پیروی نہیں کرنا چاھیے
ڈاکٹر سید عبد اللہ، دخیل الفاظ کے متعلق آرزو کے وضع کردہ قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ھیں۔

" دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں آرزو کی رائے یہ ھے کہ اس معاملے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو اھل زبان (عوام و خواص دونوں) میں رواج پا چکی ھو۔ ایسے لفظوں کے لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں البتہ یہ ضرور ھے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت سامنے رھنی چاھیے جو محض عوام ھی میں مروّج نہ ھو بلکہ عام و خاص سب کے نزدیک مسلّم ھو چکی ھو۔ " (5)

سراج الدین علی خان آرزو کی یہ رائے جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے صحیح ھے اور آرزو کی زبانوں کے مطالعے میں دلچسپی اور ان کے لسانی شعور کی پختگی کی دلیل ھے۔

انشا اللہ خاں انشا نے، دخیل الفاظ کے بارے میں آرزو کے قاعدے سے مماثل ایک اصول وضع کیا، بلکہ ان کا اصول امر کی پوری طرح وضاحت کرتا ھے کہ دخیل الفاظ اپنی اصل صورت میں یا

تبدیلیوں کے بعد ، زبان کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں اور قبول عام کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں تو وہ اردو کے ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے انشا لکھتے ہیں۔

> " جاننا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی ، ترکی ہو یا سریانی ، پنجابی ہو یا پوربی ، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح ، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔ اس کی صحت اور اس کی غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیوں کہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو، اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔" (6)

انشا کا یہ اصول اگرچہ ان کے اپنے عہد کے اہل زبان اور فصحا کی نظر میں قابل گرفت ہو گا کیوں کہ اس وقت کے فصحا دخیل الفاظ کو ان کے اصل تلفظ اور معانی کے مطابق استعمال کرنے پر مصر رہتے تھے۔ تاہم جدید لسانیات کی رو سے انشا کا یہ اصول صحیح اور درست ہے اور اس میں تنقیح و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

انشا اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت 1802ء میں تصنیف ہوئی اور 1935ء میں پنڈت دتاتریہ کیفی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں اردو زبان کی قواعد کے علاوہ اردو سے متعلق دیگر اہم مباحث بھی شامل ہیں جو لسانیاتی نقطہ نظر سے اہم ہیں۔ انشا نے " دریائے لطافت" کے ابتدائی ابواب میں اردو کی مختلف بولیوں میں فرق و امتیاز کی نشان دہی کی ہے۔ ان مباحث میں انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے مختلف طبقوں ، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں ، دہلی میں باہر سے آ کر آباد ہونے والے کشمیریوں ، پنجابیوں ، افغانیوں اور پوربیوں کے لب و لہجے اور روزمرہ و محاورے میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بول چال کی زبان سے مثالیں دی ہیں۔ عورتوں کی زبان ، مردوں کی زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ عورتوں کا سماجی

دائرہ محدود ہوتا ہے۔ جس کا اثر ان کی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ انشا نے عورتوں کی زبان میں اس فرق کی نشان دھی کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کی اردو میں اور پڑھے لکھوں اور ان پڑھوں کی زبان میں امتیاز کیا ہے۔ دھلی کی زبان پر بیرون دھلی کی زبانوں کے اثرات اور مضافات دھلی کی زبانوں پر دھلی کی اردو کے اثرات کی نشان دھی بھی کی ہے۔ یہ تمام مباحث جدید لسانیات میں " جغرافیائی بولیوں " یا " علاقائی بولیوں " (Area Dilectology) کی ذیل میں آتے ہیں۔ انشاء نے ان مباحث میں دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے اردو کی مختلف بولیوں کا براہ راست مطالعہ کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ دریائے لطافت کے یہ مباحث لسانیاتی نقطہ نظر سے بہت اھمیت کے حامل ہیں اور جدید لسانیاتی اصول و قواعد کی رو سے درست ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق ،

> " یہ اردو کی واحد کتاب ہے جس میں اردو کے مقامی محاوروں کے فرق اور ان کی اھمیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ زبانوں کے مطالعے میں کسی زبان کی مختلف علاقائی بولیوں کا تجزیہ اب لسانیات کا ایک مخصوص موضوع ہے، جسے Area Dilectology کا نام دیا گیا ہے۔ انشا نے دھلی اور لکھنؤ میں اردو بولنے والوں کو ان کی بولیوں اور مخصوص محاوروں کے اعتبار سے الگ الگ گروھوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس ساری بحث سے محسوس ہوتا ہے کہ صوتی اور ترکیبی سطح پر انشا اللہ خاں کا یہ تجزیہ حیرت انگیز حد تک جدید لسانیاتی تجزیے کے مطابق ہے۔ اس سے اس وقت کی رائج اردو کے معیاری نمونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مختلف علاقوں میں بولیوں کے آپس کے اختلافات کی نوعیت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ " (7)

" دریائے لطافت " میں حروف تہجی کے مباحث صوتیات نقطہ نظر سے اھمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ ان مباحث میں آوازوں کے بجائے حروف سے بحث کی گئی ہے تاھم اس دور میں زبان کے

مطالعے کی ذیل میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جانی چاہیے۔ مغرب میں بھی انیسویں صدی کے ابتدا میں ریسک اور بوپ نے صوتیاتی مباحث کی ذیل میں آوازوں کے بجائے حروف سے ہی بحث کی تھی۔ انشا نے حروف تہجی کی بحث میں مخلوط ہائے ہوز یا ہائیہ آوازوں کو مستقل حیثیت دی ہے یہ تعداد میں سترہ ہیں، اسی طرح انہوں نے فرعی یا ذیلی آوازوں (ایلو فون) کی وضاحت تو نہیں کی، اس دور میں ان سے اس کی توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی، تاہم ذیلی آوازوں کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اردو کے حروف تہجی کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق:

> " اردو دنیا میں اس طرح کی غیر محسوس صوتی تبدیلی کو پہلی بار انشا اللہ خاں انشا نے بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اس کی توجیہہ تو نہیں کی، (اس دور کے اردو ادیب یا شاعر سے اس کی توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی) تاہم انہوں نے اسی بنیاد پر اردو کے حروف تہجی کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ " (۶)

گفتگو کے دوران مختلف آوازوں کو ادا کرتے ہوئے عامل عضو صوت کے فنکشن میں خفیف سے فرق کی وجہ سے آوازوں کے مخارج پر اثر پڑتا ہے جس سے آوازوں کے اجراء میں غیر محسوس سا فرق رونما ہوتا ہے، جسے عموماً بولنے اور سننے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا اور یہ تبدیلی " سپکٹو گراف " ہی کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اصل آواز سے خفیف سی بدلی ہوئی صورت کو فرعی یا ذیلی آواز (ایلو فون) کہتے ہیں۔ انشا نے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ جس سے ان کے غائر لسانی مطالعے اور ذہن کی رسائی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ اردو کو انہوں نے مخلوط زبان قرار دیا ہے۔ زبان کے آغاز کے بارے میں ان کی یہ رائے غیر لسانیاتی ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے اردو کے قواعد کی تدوین کے سلسلے میں انہوں نے بول چال کی زبان کو بھی مدنظر رکھا اور پختہ لسانیاتی شعور سے کام لیتے ہوئے اردو زبان کے حوالے سے جو مباحث پیش کئے وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں اور جدید

لسانیاتی نقطۂ نظر سے درست قرار دئیے جا سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد (1832 - 1910ء) نے اپنے عہد کے مروّجہ قیاسی تصوّرات کے برعکس، اردو کو مخلوط زبان قرار دینے کے بجائے، اسے برج بھاشا کی بیٹی قرار دیا۔ انھوں نے برج اور اردو میں لسانی مماثلتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا۔ انہیں اس امر کا شعور ہے کہ ہر زبان کی اپنی مخصوص ساخت ہوتی ہے البتہ وہ ہمسایہ زبانوں کے اثرات قبول کرتی رہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

" سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اردو کا پتلا بنا ہے باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔۔۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اردو میں آئے تو ان کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیسی کر صورت بدل لی۔ " (9)

اردو کے آغاز کے بارے میں محمد حسین آزاد کے نظریے کو بعد میں اردو کے ماہرین لسانیات نے رد کر دیا۔(10) لیکن یہ حقیقت ہے کہ آزاد نے ملواں زبان کے تصور سے ہٹ کر پہلی بار اردو کا ماخذ کسی دوسری زبان کو قرار دیا اور اردو زبان کی ساخت میں اس کے ماخذ کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں زبانیں میں لسانی روابط کا شعور تھا۔

محمد حسین آزاد کے لسانی شعور کا بھرپور اظہار " سخندان فارس " (1887ء) میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عمومی لسانیات کے مسائل سے تفصیلی بحث کی ہے۔ زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" وہ اظہار خیال کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں ..... زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے رستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے

ہیں ۔۔۔۔ تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے
ہوا پر کھینچی ہے۔" (11)

آزاد نے اردو میں پہلی بار زبانوں کے آپس کے رشتے کو محسوس کر کے انہیں ماں ،
بیٹی اور بہنوں کے نام دئیے۔ وہ ایرانی اور ہندی زبانوں کو بہنیں قرار دیتے ہیں جو ایک ماں
کی دو بیٹیاں ہیں۔ (12) وہ ایرانی اور ہندی کو متحد الماخذ قرار دینے کے بعد ان میں
مماثلتوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور لسانی اشتراک کی ذیل میں قریبی رشتہ داروں کے
ناموں اور گنتی کے اعداد کے ناموں میں مماثلت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی
انہوں نے دونوں زبانوں میں لسانی تغیر و تبدل کی صورتوں سے بحث کرتے ہوئے اس حوالے سے
اصول و ضوابط بھی وضع کئے ہیں اور ان کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ عربی زبان کے فارسی
پر اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ہی ہندوستان کی زبانوں پر فارسی کے اثرات کا جائزہ لیا
ہے اور فارسی پر یہاں کی زبانوں کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے خیال میں فارسی کے
اثر سے ہندوستان میں ایک نئی زبان اردو پیدا ہوئی۔ (13)

لسانی تغیرات کی ذیل میں محمد حسین آزاد نے صوتی تبادل کو اہمیت دی ہے۔
انہوں نے صوتی تبادل کی اصطلاح تو استعمال نہیں کی ، نہ ہی نطقی آوازوں سے بحث کی ہے
البتہ حروف سے ان کی مراد نطقی آوازیں ہی ہیں۔ ان کے خیال میں جو حروف قریب المخرج
ہیں وہ باہم بدل جاتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں کے افراد کے اعضائے
صوت میں فرق ہوتا ہے اس لئے وہ دوسری زبانوں کے مخصوص حروف کے اجراء پر قادر نہیں ہوتے۔
جس کی وجہ سے وہ حروف قریب المخرج حروف سے بدل جاتے ہیں۔ (14) اس ذیل میں انہوں نے
حروف کے مخارج کی تفصیل بھی دی ہے۔ (15)

محمد حسین آزاد نے مغربی ماہرین لسانیات کے حوالے سے زبانوں کو تین گروہوں ،
1۔ آرین 2۔ سیمیٹک 3۔ تورینین ، میں تقسیم کیا ہے۔ ابتداء میں زبانوں کی
تقسیم جغرافیائی بنیاد پر اسی طرح کی گئی تھی ، بعد میں لسانی خصوصیات کی بنیاد پر زبانوں کی

گروہی تقسیم کی گئی جس کا حوالہ آزاد نے نہیں دیا ہے۔ الفاظ کی بناوٹ کے حوالے سے وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ زبان جمہور کے تابع ہے، فرد واحد لفظ ایجاد نہیں کر سکتا۔ وہ لفظ جو قبول عام کا درجہ حاصل کر لے زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔ البتہ علماء متفقہ طور پر اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے لفظوں کی اشتقاقیات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ دخیل الفاظ میں لفظوں کی صوری و معنوی تبدیلی کی نشان دہی بھی ہے ان کے خیال میں زبانیں تغیر پذیر رہتی ہیں اور جب تک زبان بول چال میں اور تحریر و تقریر میں استعمال ہوتی ہے، زندہ رہتی ہے ورنہ مر جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے مغربی لسانیات سے براہ راست استفادہ تو نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے ولیم جونز کی لسانی دلچسپی کا اور نام لئے بغیر چند دیگر مغربی علمائے لسانیات کا ذکر ضرور کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اہل یورپ کی لسانیاتی سرگرمیوں سے واقف ضرور تھے۔ مغربی لسانیات سے استفادہ کئے بغیر محمد حسین آزاد نے زبانوں کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے پختہ لسانی شعور کا مظہر ہیں لیکن انہوں نے لسانی مطالعے کی ذیل میں زیادہ توجہ نہیں دی۔ اگر وہ اس طرف اپنی توجہ مرکوز کرتے تو اردو لسانیات کی روایت میں قابل قدر اضافہ کر سکتے تھے۔

سیّد احمد دہلوی (1846 - 1918ء) مولفہ " فرہنگ آصفیہ " کی ایک کتاب " علم اللسان " 1900ء میں شائع ہوئی، بعد ازاں ترمیم و اضافے کے ساتھ فرہنگ آصفیہ کے مقدمے میں شامل کی گئی۔ اس کتاب میں لسانی مسائل پر چند اہم مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ زبان کے آغاز کے بارے میں سید احمد دہلوی کا خیال یہ ہے کہ ابتدا میں انسان نے خوشی، غم اور تکلیف کے عالم میں فجائی آوازیں نکالی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ وہ ابتدائی صوتوں کے اجراء پر قادر ہوا، پھر مظاہر فطرت سے پیدا ہونے والی آوازوں کی نقل کرنے لگا۔ اس نے جانوروں کی آوازوں کی مطابقت سے ان کے نام مقرر کرنا شروع کئے۔ اسماء وضع کرنے کے بعد افعال وضع کئے گئے اور چیزوں کو شمار کرنے کے لئے اعداد مقرر ہوئے۔ اس ذیل میں انہوں نے عمل نطق کی وضاحت بھی کی ہے اور مختلف علاقوں کے باشندوں کے اعضائے نطق میں فرق کی نشان دہی

بھی کی ہے جس کی وجہ سے ایک زبان بولنے والے کسی دوسری زبان کے حروف کے ادراک پر قادر نہیں ہوتے۔ سیّد احمد دہلوی اس کتاب میں آواز اور اس کے معنی میں فطری مطابقت کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ یہ مباحث عربی نحویوں کے یہاں بھی ملتے ہیں اور جدید لسانیات میں صوتی رمزیت (Sound Symbolism) کے ذیل میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سید احمد دہلوی نے اردو سے مثالیں دے کر اس مسئلے کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔

" فرہنگ آصفیہ " کے مقدمے میں سید احمد دہلوی نے اردو کے آغاز کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق برج بھاشا نے اردو نام اختیار کیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ اردو کو مخلوط زبان بھی قرار دیتے ہیں، جس سے تضاد کا اشتباہ ہوتا ہے۔ سید احمد دہلوی نے " علم اللسان " میں جن لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے وہ نئے نہیں ہیں۔ ان کے خیالات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں لسانی مسائل کا شعور تھا۔

مرزا سلطان احمد کی کتاب " زبان " (1916ء) میں لسانیات کے عمومی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں زبان سے مراد وہ الفاظ یا کلمات ہیں جو کسی ملک یا قوم میں مستعمل ہوں اور بول چال میں کام آتے ہوں۔ یہ کلمات معنی اور مفہوم رکھتے ہوں اور انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہوں۔ (11) الفاظ اور کلمات اشارات و کنایات ہیں جو انسان نے نطق کی صلاحیت سے، جو اسے ودیعت کی گئی ہے، مدد لے کر وضع کئے ہیں۔ زبان عطیہ الٰہی ہے جو ابتدا میں تمام دنیا میں ایک ہی تھی لیکن انسانوں کی نقل مکانی سے اس میں اختلاف رونما ہوئے اور یہ شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔ مرزا سلطان احمد نے عمل نطق کی نفسیاتی اور طبعی توضیح کی ہے۔ الفاظ اور معنی کے رشتے کی وضاحت لفظ کو ڈھانچہ اور معنی کو روح قرار دے کر کی ہے اور حرف، لفظ، جملہ، فقرہ، عبارت کو اجزائے زبان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں زبانوں میں ارتقاء اور انحطاط ہوتا رہتا ہے اور زبانیں ضرورت کے مطابق دوسری زبانوں سے استفادہ بھی کرتی رہتی ہیں، جس سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

مرزا سلطان احمد نے " زبان " میں جو مباحث پیش کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے

کہ زبانوں کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت محدود ہے اور وہ لسانیات کی مبادیات سے بھی ناواقف ہیں۔ ان کے خیالات کی بنیاد حقائق و شواہد نہیں محض قیاسات ہیں۔ جو چند زبانوں کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے زبان کے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور زبانوں کے مطالعے میں دلچسپی لی ہے۔ جس سے ان کے لسانی شعور کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کے خیالات عصر حاضر کی جدید لسانیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لسانیات کی مبادیات سے ناواقف اردو داں طبقے سے اس سے زیادہ کی توقع کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اتنا بھی بہت ہے کہ مرزا سلطان احمد نے مسائل زبان میں دلچسپی لے کر اردو لسانیات کی روایت میں کس قدر اضافہ کیا ہے۔

انیسویں صدی سے پہلے ہی اردو میں لغت اور قواعد زبان پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ اردو کی پہلی لغت میر عبدالواسع ہانسوی کی " غرائب اللغات " کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ لغت عہد عالمگیری میں مرتب کی گئی۔ اس میں اردو الفاظ کے معنی اور تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ اس لغت کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو کی " نوادر الالفاظ " کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا سال تصنیف 1165ھ مطابق 1751ء ہے۔ آرزو نے اس کی تالیف کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ " غرائب اللغات " کی غلطیوں اور تسامحات کی تصحیح کی جائے۔ (17) لیکن آرزو نے اس میں جو ترمیم و اضافے کئے ہیں اس سے " نوادر الالفاظ " کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے اور اسے مستقل تالیف کی حیثیت حاصل ہے۔ سید عبداللہ نے بہ اعتبار فن آرزو کو اردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار قرار دیا ہے۔ (18) یہ دونوں لغات چونکہ فارسی زبان میں ہیں اس لئے اردو داں طبقہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا ہے۔ اوحد الدین بلگرامی کی " نفائس اللغات " (سن تالیف 1837ء، سن اشاعت 1869ء) اور میر علی اوسط رشک لکھنوی کی " نفس اللغتہ " (تالیف، 1844ء) بھی اسی ذیل میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ " نفائس اللغات " میں اردو الفاظ کی شرح فارسی میں اور اس کا مترادف عربی اور فارسی میں دیا گیا ہے۔ " نفس اللغتہ " میں اردو کے الفاظ سے فارسی مترادف دئیے گئے ہیں۔ نیاز علی بیگ کی " مخزن فوائد " (1886ء)

اردو محاورات و اصطلاحات کی لغت ہے۔ منشی چرن جی لال کی تالیف " مخزن المحاورات" (1899ء) بھی اردو محاورات کی لغت ہے۔ (19)

سید احمد دہلوی نے فیلن کے معاون کے طور پر ڈکشنری مرتب کرنے کا کام کیا تھا۔ انہیں لغت کی تدوین کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ انہوں نے اردو کی لغت مرتب کی جس کی پہلی جلد 1887ء میں " لغات اردو" کے نام سے شائع ہوئی اور بعد ازاں چار جلدوں میں " فرہنگ آصفیہ" کے نام سے 1908ء میں شائع ہوئی۔ (20) " فرہنگ آصفیہ" اردو لغت نویسی میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اس عہد میں جب کہ اردو لغت نویسی کی باقاعدہ روایت موجود نہ تھی اس سے بہتر لغت تالیف نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس لغت میں سید احمد دہلوی سے بہت سی لغزشیں اور تسامحات ہوئے ہیں تاہم اس کے باوجود اردو لغت نویسی کی روایت میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے۔

امیر مینائی کی لغت " امیر اللغات" کی پہلی جلد 1891ء میں شائع ہوئی لیکن یہ لغت تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ مولوی نور الحسن نیر کی " نوراللغات" (1924ء) اردو کی عظیم الشان لغت ہے۔ مروّجہ الفاظ، متروک الفاظ اور محاورات اس لغت میں شامل کئے گئے ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ اس کے اصل کا حوالہ بھی دیا ہے اور تلفظ کی صحت کے لئے اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔ اردو لغت نویسی کی روایت میں " نور اللغات" نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ خواجہ عبدالحمید کی " جامع اللغات" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو 1933ء سے 1935ء کے دوران شائع ہوئیں۔ اس لغت میں بول چال کی زبان سے زیادہ کتابی زبان کے الفاظ شامل کئے گئے ہیں اور دخیل الفاظ کے اصل تلفظ پر زور دیا گیا ہے۔ ان لغات کے علاوہ انیسویں صدی کے آخر میں تالیف کی گئی چند اہم لغات درج ذیل ہیں۔

1- حکیم سیّد ضامن علی جلال لکھنوی، " سرمایۂ زبان اردو" و تحفۂ سخنوران" (1889ء)

2- شاہ جہاں بیگم، " خزانۃ اللغات" (1889ء)

3- خواجہ اشرف علی، " اشرف اللغات" (1896ء)

4- خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی، " دستورالشعرا" (1889ء)

۵۔ سیّد تصدق حسین رضوی، " لغات کشوری " (1892ء) (21)

انیسویں صدی میں اردو لغت نویسی پر ان یورپین لغت نویسوں کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں مذہبی، سیاسی اور تجارتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر، یہاں کی مقامی زبانوں سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے لغات مرتب کی تھیں۔ ان لغات کا، گزشتہ باب میں، تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے اکثر لغت نویسوں نے فن لغت نویسی کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھنے کے بجائے مذکورہ یورپین لغت نویسوں کی مرتب کردہ لغات کو پیش نظر رکھ کر اردو لغات مدوّن کیں۔ اور بعد کے لغت نویسوں نے ان اردو لغات کو مثال بنایا اور اس میں کسی قدر اضافہ کرتے رہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق

" اردو میں اب تک جو لغت کی کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کر لی ہے اورکچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیا ہے۔" (22)

انیسویں صدی کی لغت نویسی کی روایت میں " فرہنگ آصفیہ " کے علاوہ " امیر اللغات " اور " نور اللغات " ہی ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، بیسویں صدی میں بھی اردو لغت نویسی کی روایت میں قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔ اس دوران جو لغات مرتب کی گئیں ان پر پیش روؤں کی لغات ہی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان میں سے بیشتر لغات کاروباری ضرورت کے تحت مرتب کی گئیں۔ جو عام قاری کی روزمرہ ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے یہ ہے کہ

" اردو کے اب تک جتنے لغت لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب کاروباری ہیں۔ ایک عام قاری کی ان سے ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں لیکن ایک محقق اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے کی تشفی نہیں ہوتی ۔ اردو جیسی پر مایہ زبان کے لئے ایک جامع تاریخی لغت کی ضرورت علمی طبقے میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔" (23)

مولوی عبدالحق نے اردو میں علمی لغت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایک جامع لغت کی تدوین کا کام شروع کیا، اور اس پر کافی کام ہو چکا تھا کہ تقسیم ہندوستان کے دوران بیشتر کام ضائع ہو گیا۔ پاکستان میں مولوی عبدالحق نے اس لغت پر دوبارہ کام شروع کیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی، جتنا بھی کام ہوا تھا اسے انجمن ترقی اردو نے "لغت کبیر" کے نام سے 1973ء سے شائع کرنا شروع کیا۔ "لغت کبیر" کی چند جلدیں ہی شائع ہوئی ہیں، جن سے اس لغت کی جامعیت اور علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں اردو کے تمام مفرد و مرکب متروک و مروجہ الفاظ، محاورات اور اصطلاحات شامل کی گئی ہیں۔ الفاظ کی مختلف ادوار میں رائج صورتیں دی گئی ہیں اور ان کے ماخذ بتائے گئے ہیں اس طرح لغت کبیر، اشتقاقیاتی لغت کا درجہ حاصل کر گئی ہے۔ اردو لغت بورڈ پاکستان نے "اردو لغت" (تاریخی اصول پر) "کی تدوین کا کام شروع کیا ہے جو پچھلی ربع صدی سے جاری ہے۔ اس لغت کی 1999ء تک تیرہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ اس لغت میں الفاظ کے معنی اور ان کی تشریح دینے کے ساتھ سند کے لئے مثالیں اور حوالے بھی دئیے گئے ہیں۔ مختلف ادوار میں الفاظ کی صورتوں اور معنوں میں رائج تھے ان کی نشان دہی کرتے ہوئے سنین کے ساتھ اس عہد کے ادب سے مثالیں بھی دی گئی ہیں اور الفاظ کے ماخذ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس طرح اس لغت کی حیثیت تاریخی و اشتقاقیاتی ہو جاتی ہے۔ اردو لغت نویسی کے اس دور میں مولوی عبدالحق کی "لغت کبیر" کے بعد یہ "اردو لغت" اہم مقام رکھتی ہے۔

اردو قواعد نویسی کا آغاز ہندوستان میں آنے والے ان قواعد نویسوں سے ہوا جنھوں نے اپنے مخصوص مذہبی، تجارتی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر یہاں کی مقامی زبانیں سیکھنے کی غرض سے یہاں کی زبانوں کی جن میں اردو بھی شامل تھی، قواعدیں مرتب کیں۔ ان قواعدوں کا اجمالی جائزہ گزشتہ باب میں پیش کیا گیا۔ اردو میں قواعد نویسی کا آغاز انشاءاللہ خاں انشا کی "دریائے لطافت" سے ہوتا ہے۔ یہ قواعد فارسی زبان میں 1802ء میں لکھی گئی۔ اور اس کا اردو ترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی نے 1935ء میں کیا۔ انشا نے اردو کی قواعد مرتب کرتے

ہوئے عوام و خواص کی زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے دخیل الفاظ کی حیثیت اور زبان کی صحت کے مسائل سے بحث کی ہے اور اردو کی مختلف بولیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ قواعد اردو کی تدوین میں انہوں نے فارسی قواعد کی مثالوں کو سامنے رکھا ہے لیکن اردو کی ساخت اور مزاج کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے " دریائے لطافت " لازوال حیثیت کی حامل ہے۔ مولوی احمد علی دہلوی کی قواعد " فیض کا چشمہ " 1845ء میں طبع ہوئی یہ اردو صرف و نحو پر ایک ابتدائی رسالہ ہے۔ مولوی امام بخش صہبائی دہلوی کی اردو قواعد " رسالہ قواعد صرف و نحو اردو " 1845ء میں شائع ہوئی ۔ یہ قواعد اردو پر اچھی تصنیف ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو قواعد پر بے شمار کتابیں اور رسالے تالیف ہوئے جن میں سے بیشتر تدریسی اداروں کی نصابی ضرورت کے تحت طالب علموں کی سہولت کے لئے تالیف ہوئیں ۔ اس دور میں علمی سطح پر اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ نہیں دی گئی ۔ انیسویں صدی میں اردو قواعد نویسی کی روایت پر عربی فارسی قواعد نویسی اور یورپین کی روایتی گرامر نویسی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس دور کو اردو گرامر کا کلاسیکی و مدرسانہ دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس دور کی اردو قواعدوں کو عربی فارسی کی صرف و نحو کا تتبع قرار دیا ہے اور اس رجحان کی مذمت کی ہے۔ (24) کیوں کہ اردو کا لسانی مزاج عربی فارسی سے مختلف ہے اس لئے اردو کی قواعد کی تدوین کے لئے اردو زبان کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں، اردو گرامر کی حیثیت علمی سے زیادہ عملی رہی ہے اور اس کی وجہ یورپین گرامر نویسوں کے اثرات ہیں۔ عربی فارسی گرامر کی تقلید میں جو قواعدیں مرتب ہوئیں ان میں اردو کو سامی زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ۔ (25)

بیسویں صدی کے آغاز میں قواعد اردو کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ 1901ء میں منشی صاحب نے مدارس میں " قواعد اردو " کے نام سے ایک قواعد مرتب کی ۔ مولوی محمد احسن کی کتاب " قواعد اردو " 1904ء میں شائع ہوئی ۔ 1905ء میں شیخ برکت علی کی " ہندوستانی گرامر " شائع ہوئی ۔ مولوی محمد فتح خاں جالندھری کی " مصباح القواعد " 1904ء میں شائع ہوئی ۔

یہ اس دور کے قواعدوں میں ممتاز ترین حیثیت کی حامل ہے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق عصر حاضر کے اکثر و بیشتر قواعد نویسوں نے فتح محمد جالندھری کی " مصباح القواعد " سے استفادہ کیا ہے۔ (26) یہ قواعدیں بھی کلاسیکی اور مدرسانہ رجحان کی حامل ہیں، سوائے " مصباح القواعد " کے، جو مستند علمی قواعد کا درجہ رکھتی ہے۔ مولوی عبدالحق کی " قواعد اردو " 1914ء اردو کی مستند اور معیاری علمی قواعد ہے۔ انہوں نے اردو قواعد نویسی کے روایتی طرز سے ہٹ کر علمی انداز اختیار کیا، اور عربی فارسی نحو کی تقلید نہیں کی۔ وہ اردو کی ساخت اور لسانی مزاج سے بخوبی واقف تھے اس لئے انہوں نے جدید مغربی اصول قواعد نویسی سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کی اپنی ساخت اور خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر " قواعد اردو " مدوّن کی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں " قواعد اردو " کو مولوی عبدالحق کا ایسا کارنامہ قرار دیا ہے جس کی مثال دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ملتی اور اس کا سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب نے قواعد نویسی کے جدید اصول و ضوابط کے مطابق اردو زبان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اردو کی قواعد مرتب کی ہے۔ (27) " آئین اردو " (1926ء) مولوی محمد زین العابدین فرجاد کوشاندی کی تالیف ہے۔ مولف " آئین اردو " اردو کے مزاج شناس ہیں اور اصول قواعد نویسی سے بھی واقف ہیں، ان کی اردو قواعد معیاری اور علمی قواعد ہے اور نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ " جامع القواعد " (1971ء) کا حصہ صرف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مدوّن کیا ہے۔ وہ لسانیات کا وسیع مطالعہ اور اردو زبان کے لسانی مزاج سے کامل شناسائی رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید لسانیات کے مطابق اصول قواعد نویسی پیش نظر رکھے ہیں۔ جامع القواعد (1973ء) کا حصہ نحو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے تالیف کیا ہے۔ وہ قواعد نویسی کی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اردو کے لسانی مزاج سے خوب واقف ہیں۔ اس طرح جامع القواعد مستند اور معیاری اردو قواعد ہے جو قواعد نویسی کی روایت میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ گرامر نویسی کے جدید رجحان کی جھلک عصمت جاوید کی " نئی اردو قواعد " (1981ء) اور ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کی " اردو صرف و نحو " (1985ء) میں نظر آتی ہے۔ دونوں قواعدوں کے مولفین کا تعلق

بھارت سے ہے۔ انہوں نے جدید لسانیاتی گرامر نویسی کے رجحان کے زیر اثر اردو کی قواعد مدوّن کی ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو داں طبقے کی لسانی دلچسپی کے موضوعات، لغت و قواعد نویسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے آغاز کے مسائل، تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں، زبان کے مسائل، عمومی لسانیات کی ذیل میں اور اشتقاقیات اور صوتیات کے مسائل، رہے ہیں۔ ابتداء میں اردو دنیا میں لسانیات سے دلچسپی برائے نام ہی رہی ہے لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل کے بعد ان موضوعات میں دلچسپی لی گئی اور کسی حد تک قابل قدر تحقیقی کام بھی ہوا۔ اس ذیل میں یہ امر البتہ قابل غور ہے کہ اردو دنیا میں زبانوں کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بجائے زیادہ تر مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات کے لسانیاتی مطالعوں اور لسانیاتی جائزوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی (1880 ـ 1946ء) نے "پنجاب میں اردو" (1928ء) میں اردو دنیا میں پہلی بار لسانیاتی طرز استدلال اختیار کرتے ہوئے پنجابی اور اردو کی مماثل لسانی خصوصیات کا تقابل کر کے دونوں زبانوں میں لسانی رشتوں کا تعین کیا۔ انہوں نے گریرسن اور گراہم بیلی کا حوالہ تو نہیں دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو کے پنجابی پن کی نشان دہی گریرسن اور گراہم بیلی، حافظ محمود شیرانی سے پہلے کر چکے تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (1905 ـ 1962ء) نے یورپ میں قیام کے دوران مغربی ماہرین لسانیات کی زیر نگرانی لسانیات کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کے لئے تحقیقی کام کیا تھا۔ انہوں نے بھی "ہندوستانی لسانیات" (1932ء) میں اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کی نشان دہی کی ہے اور اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یورپ میں قیام کے دوران پروفیسر آر۔ ایل۔ ٹرنر اور ڈاکٹر گراہم بیلی کے مشوروں سے اردو اور پنجابی کے لسانی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ "ہندوستانی لسانیات" میں ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں ڈاکٹر زور نے گریرسن اور ہیورنلے سے استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے " مقدمہ تاریخ زبان اردو" (1948ء) میں اردو پر اس کی ہمسایہ زبانوں خصوصاً کھڑی بولی اور ہریانی کے اثرات کی نشان دھی کرتے ہوئے اردو کے پنجابی پن کو اس کا ہریانی پن قرار دیا ھے اور اس سلسلے میں سند کے لئے جیولز بلاک کا حوالہ دیا ھے۔ زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں انہوں نے گریرسن، ھیورنلے اور چٹر جی سے استفادہ کیا ھے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے ارتقاء کا سلسلہ پراکرت عہد کی بولی سے جوڑا ھے اور اردو اور پالی کے لسانی رشتوں کی نشان دھی کی ھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹر چٹر جی کے نظریات سے استفادہ کیا ھے ۔ اردو کے ارتقائی مدارج کے مباحث میں انہوں نے جان بیمز کیلاگ، اے۔ سی ، وولنر، بھنڈارکر، بابو رام سکسینہ اور شیام سندر داس سے استفادہ کیا ھے جن کے حوالے ان کی کتاب " اردو زبان کا ارتقاء" (1956ء) میں اکثر مقامات پر ملتے ھیں۔ زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں انہوں نے، گریرسن، ھیورنلے اور شیام سندرداس سے استفادہ کیا ھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فریدکوٹی نے اردو کو دراوڑی زبان قرار دیا ھے لیکن انہوں نے کاڈویل اور کٹل کا حوالہ، جنہوں نے دراوڑی زبانوں پر لسانیاتی تحقیق کی ھے، اپنی کتابوں " اردو کا روپ" اور " اردو زبان کی قدیم تاریخ " میں نہیں دیا ، لیکن ان حضرات نے دراوڑی زبانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا اور وہ دراوڑی زبانوں سے واقف بھی نہیں ھیں۔ دراوڑی زبانوں سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے ان زبانوں کے بارے میں کسی قسم کی رائے قائم کرنے کے لئے کاڈویل اور کٹل کی تصانیف سے استفادہ کرنا لازمی امر ھے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ملتانی اور اردو کے لسانی تعلق کی تحقیق کے سلسلے میں گریرسن سے استفادہ کیا ھے، جس کے حوالے ان کی کتاب " ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق " (1967ء) میں ملتے ھیں۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے " اردو اور سندھی کے لسانی روابط" (1970ء) میں اردو اور سندھی کے لسانی تعلق پر تحقیق کی ھے۔ انہوں نے ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ، جان بیمز اور گریرسن سے استفادہ کیا ھے جن کے حوالے ان کی کتاب میں موجود ھیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں اردو کے مذکورہ ماھرین لسانیات نے، اردو کے آغاز و ارتقاء کے نظریات اور اردو کے دیگر زبانوں سے

لسانی روابط کے حوالے سے، اپنے نظریات کے لئے لسانی مواد ، ان نظریات کی تائید کے لئے دلائل، ہمسایہ زبانوں سے مماثل لسانی مواد اور اردو کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کے لئے اردو کے قدیم ترین نمونوں کی مثالوں کے لئے مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات کے لسانیاتی مطالعوں اور لسانیاتی جائزوں سے استفادہ کیا ہے۔

اردو لسانیات میں زبانوں کے عمومی مسائل پر مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے " زبان کا مطالعہ" (1964ء) میں لسانیات کی اہمیت، لسانیات کے مسائل، اس کے مختلف شعبے اور شاخیں، اس کا مختلف علوم سے تعلق اور لسانیات کی تاریخ میں اہم ماہرین لسانیات کے کارناموں اور نظریات کے مباحث پیش کئے ہیں، " زبان کا ارتقاء" (1977ء) میں زبان کے آغاز کے مسائل اور اس حوالے سے پیش کئے گئے نظریات، لسانی تغیرات کی صورتیں اور ان کے اسباب، لسانی ارتقاء اور اس کے مدارج کے مباحث پیش کئے ہیں۔ " زبان کیا ہے" (1989ء) میں زبان کے عمومی مسائل، زبان کا نظام اور زبانوں کے مختلف خاندانوں ، ان کی گروہ بندی اور ان کی لسانی خصوصیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ " لسانی مباحث" (1991ء) میں ہند آریائی لسانیات، تاریخی لسانیات، گریمر، ساختیات، معنیات، لغت نویسی اور لسانیات کے دیگر اہم مسائل پر مباحث پیش کئے ہیں اور " آواز شناسی " (1993ء) میں صوتیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے مستشرقین، ہندو ماہرین لسانیات اور مغربی ماہرین لسانیات سے استفادہ کیا ہے وہ اپنی ہر کتاب کے دیباچے میں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تصنیف کو تالیف قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے" لسانیات کے بنیادی اصول " (1985ء) میں لسانیات کے عمومی مسائل اور لسانیات کی مختلف شاخوں کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے" اردو لسانیات " (1990ء) نے لسانیات کے عمومی مسائل اور اردو صوتیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے" زبان اسلوب اور اسلوبیات " (1983ء) نے اسلوبیات کے مباحث پیش کئے ہیں اور " اردو کی لسانی تشکیل" (1985ء)میں اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل اور اردو صوتیات کے مسائل سے بحث کی ہے۔ اشتقاقیات کی ذیل میں احمد دین بی اے کی

" سرگزشت الفاظ " (1932ء) میں اردو الفاظ کی اشتقاقیات کے مباحث پیش کئے ہیں۔ انہوں نے دیباچے میں پادری ٹریںچ سے استفادے کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اردو میں لسانیات کے مختلف موضوعات پر پاکستان اور بھارت کے مختلف رسائل اور جرائد میں مضامین اور مقالات شائع ہوئے ہیں۔اردو دنیا میں برصغیر کی زبانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ جب کہ مستشرقین نے یہاں کی زبانوں کا براہ راست مطالعہ کر کے ان کی تقابلی گرامریں، تقابلی لغات اور لسانیاتی جائزے پیش کئے تھے۔ کئی مستشرقین اسی غرض سے یورپ سے ہندوستان پہنچے اور یہاں زبانوں کے براہ راست مطالعے میں بعض اوقات کئی دہائیوں کا عرصہ صرف کر دیا۔ گزشتہ باب میں اس حوالے سے اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس عہد میں مستشرقین کے ساتھ ہند و ماہرین لسانیات بھی شامل تھے۔ آج بھی بھارت میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں لسانیات پر کام ہو رہا ہے۔ اردو دنیا میں مستشرقین اور ہند و ماہرین لسانیات کے لسانیاتی کارناموں سے استفادہ تو کیا گیا ہے لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لسانیاتی مباحث کو سمجھا نہیں گیا یا ان کا سرسری مطالعہ کیا گیا ہے۔ جیسے ڈاکٹر سہیل بخاری ("اردو کا روپ" اور "اردو کی کہانی") اور عین الحق فریدکوٹی (اردو زبان کی قدیم تاریخ) میں نظر آتا ہے، انہوں نے ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں میں مماثل لسانی عناصر پر ہی نظر رکھی ہے اور یہ دعویٰ کر دیا کہ برصغیر میں ہند آریائی زبانوں کا وجود ہی نہیں ہے اور اردو بھی دراوڑی زبان ہے جب کہ یہ دعویٰ تو کاڈویل نے بھی نہیں کیا تھا جس نے تیس سال کے طویل عرصے میں دراوڑی زبانوں کو سیکھا، سمجھا اور ان کے ادبی دستاویزات کی تفہیم کی تھی۔ اسی طرح ہمارے بعض محققین نے اردو کے مقامی زبانوں سے لسانی روابط کے مباحث میں مقامی زبانوں کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بجائے گریرسن کی سو سالہ پرانی تحقیق پر بھروسہ کیا ہے اور زبان کے نمونے اور مثالیں " لسانیاتی جائزہ ہند " سے لی ہیں۔ " ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق (ڈاکٹر مہر عبدالحق) اس کی ایک مثال ہے۔ اردو کے ماہرین لسانیات کا یہ رویّہ قابل تحسین نہیں ہے۔

اردو دنیا میں سنسکرت ادب اور لسانیات سے براہ راست استفادہ نہیں کیا گیا۔ سنسکرت

سے اردو داں طبقے کا علمی و ادبی ناطہ رہا ہی نہیں ہے۔ اردو کے شاعر و ادیب اور علماء ہمیشہ فارسی کے علمی و ادبی سر چشموں سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ اسی لئے اردو لسانیات کی روایت بھی سنسکرت لسانیات کی روایت سے الگ تھلگ ہی رہی ہے۔ اردو کے ماہرین لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری سنسکرت زبان سے کسی حد تک واقف ضرور تھے لیکن / انہوں نے سنسکرت کے علمی و ادبی خزانوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا اور وہ سنسکرت کے عالم بھی نہ تھے۔ اردو دنیا میں اختر حسین رائے پوری سنسکرت کے عالم ضرور تھے لیکن وہ لسانیات سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کا مطالعہ، سنسکرت، پراکرتوں اور اپ بھرنشوں اور ان کے ادب اور دیگر دستاویزات کے مطالعے کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ مستشرقین نے سنسکرت پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے علمی و ادبی خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا، اور مغربی دنیا کو ان سے روشناس کرایا۔ اردو کے ماہرین لسانیات مستشرقین کے واسطے سے سنسکرت اور قدیم ہند آریائی زبانوں سے واقف ہوئے اور انہوں نے اس سے اس حد تک استفادہ کیا جہاں تک اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری تھا، بلکہ اردو کے اکثر ماہرین لسانیات نے مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں کا سطحی مطالعہ کیا ہے۔ مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں کے اردو لسانیات پر اثرات کا اجمالی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو دنیا نے سنسکرت سے بالواسطہ استفادہ کیا ہے۔

اردو کی علمی و ادبی دنیا پر عربی و فارسی علم و ادب کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو لسانیات نے بھی عربی سے اثرات قبول کئے ہیں۔ عربی میں لسانیات کی روایت کا اجمالی جائزہ گزشتہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔ عربی لسانیات میں صوتیات کے جو مباحث ملتے ہیں۔ اردو لسانیات نے ان سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اس ذیل میں اردو لسانیات نے مغربی لسانیات سے فیض اٹھایا ہے۔ مغربی لسانیات پر عربی کے بجائے سنسکرت کے اثرات زیادہ تھے۔ اہل مغرب عربی لسانیات کی روایت سے واقف نہیں تھے۔ اردو لسانیات پر عربی صرف و نحو کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو قواعد نویسوں نے عربی نحویوں کا تتبع کیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں اس حوالے سے اجمالی

جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو قواعد نویسوں نے اردو گرامر کے مباحث میں صرف و نحو کے ذیلی مباحث کی ترتیب عربی و فارسی صرف و نحو کے مطابق رکھی ہے۔ اصطلاحات، تمام تر، عربی و فارسی صرف و نحو سے لی گئی ہیں اور اب تک یہی اصطلاحات رائج ہیں۔ مثلاً اسم، اسم عام، اسم خاص، نکرہ و معرفہ، اسم صفت، اسم جمع، اسم کی حالتیں، فاعلی، اضافی، مفعولی، ندائی، طوری، ندائی اور ظرفی، اسمائے مشتق، اسم صوت، اسم موصول، اسم ضمیر، فعل، اقسام فعل، لازم اور متعدی، فعل ناقص، معروف اور مجہول، افعال کی صورتیں، خبری، شرطی، احتمالی، حرف، حروف ربط، عطف، تخصیص، فجائیہ۔ اردو صوتیات میں بھی اصطلاحات عربی سے لی گئی ہیں، جیسے لسان، لہوی، منحرف، مصمت، مسموع، مجہورہ، مہموسہ، صوت، لثوی، غشائی، حلقی، صفیریہ، انفی، مصوتہ، مصمتہ، صحیحہ، تنزیلی مصوتہ، رخوہ، منحرفہ مکررہ، مخرج، ہائیہ، شفوی، حنجری، ارتباطی، حکائی، حنکی، تعریب، تعریفی۔ اصطلاحات عربی سے وضع بھی کی گئی ہیں۔ جیسے لسان سے لسانی، لسانیات۔ صوت سے صوتی، صوتیات۔ معنی سے معنوی، معنیات۔ اہل اردو نے اصطلاحات کے سلسلے میں عربی سے مدد لی۔ لیکن عربی لسانیات کی روایت سے بھی استفادہ کیا جاتا تو اردو لسانیات کی روایت اتنی محدود، کم مایہ اور مغربی لسانیات سے اتنا پیچھے نہ ہوتی۔

اردو لسانیات کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اردو دنیا میں لسانیات کی طرف دوسرے علوم کی نسبت بہت کم توجہ دی گئی ہے، اور لسانیات کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کے بہت کم اہل علم نے لسانیات کو علمی و فکری سرگرمی کا مرکز و محور سمجھا ہے۔ اردو لسانیات کا دائرہ بھی بہت محدود رہا ہے۔ ہمارے ماہرین لسانیات لغت و قواعد نویسی، اشتقاقیات اور اردو کے آغاز و ارتقاء کے مباحث تک محدود رہے ہیں۔ صوتیات اور مبادیات لسانیات جیسے اہم موضوعات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ لغت نویسی کے سلسلے میں بھی لسانیات کے جدید رجحانات سے اغماض برتا گیا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اردو لغت بورڈ، تاریخی اصولوں پر اردو لغت مرتب کر رہا ہے۔ لیکن اشتقاقیاتی اور تقابلی لغت کی طرف بھی توجہ دینے کی

ضرورت ہے۔ قواعد نویسی کے سلسلے میں روایتی اور مدرسانہ رجحان غالب رہا ہے۔ بیسویں صدی میں چند ایک قواعد میں علمی رجحان نظر آتا ہے۔ بھارت میں لسانیات کے جدید رجحانات کے مطابق اردو قواعد یں مرتب کی گئی ہیں، لیکن تاریخی اور تقابلی گرامر کی طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گراموں ہی نے جدید مغربی لسانیات کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اردو کے آغاز و ارتقاء اور دیگر زبانوں سے اردو کے لسانی روابط کے حوالے سے تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن تاریخی و تقابلی لسانیات کا دائرہ صرف اردو کے آغاز و ارتقا کے مباحث تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ اردو میں صوتیات اور مبادیات لسانیات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ صوتیات کی ذیل میں جستہ جستہ چند مضامین ہی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اس طرف توجہ دی ہے، لیکن ان کی تصانیف کا بھی ایک محدود حصہ صوتیات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ عتیق صدیقی نے ایچ۔ اے۔ گلیسن کی کتاب کا ترجمہ " توضیحی لسانیات " کے عنوان سے کیا ہے۔ اردو میں صوتیات پر ایک مستقل تصنیف پروفیسر خلیل صدیقی کی " آواز شناسی " کے عنوان سے حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ مغرب میں مبادیات لسانیات جیسے اہم موضوع پر مغرب کے نامور ماہرین لسانیات نے خاصی توجہ دی ہے۔ ان کے اہم لسانیاتی کارنامے عمومی لسانیات کے مباحث کا احاطہ کرتے ہیں اور یہی مغرب میں لسانیات کے فروغ کا باعث بنے ہیں۔ اردو دنیا میں اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مبادیات لسانیات پر جستہ جستہ مضامین کی صورت میں اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی " زبان کا مطالعہ "، " زبان کا ارتقاء "، " زبان کیا ہے؟ " اور " لسانی مباحث " مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ لسانیات کی مبادیات، لسانیات کی تاریخ، لسانیات کے جدید رجحانات اور جدید لسانیاتی تکنیک کے مباحث کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں بعض ماہرین لسانیات نے قابل قدر کام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو میں لسانیاتی کارنامے خال خال ہی نظر آتے ہیں اور پروفیسر خلیل صدیقی کا یہ قول حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتا ہے کہ " اردو لسانیات بسم اللہ کے

کشید ھی میں ھے۔" (28)

اردو دنیا میں لسانیات سے مستقل علمی دلچسپی کا فقدان نظر آتا ھے۔ اردو کے ماھرین لسانیات نے بھی لسانیات میں جزوی دلچسپی لی ھے اور اپنی علمی و فکری سرگرمیوں میں اسے ضمنی حیثیت دی ھے۔ ان کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور اردو ادب میں تخلیق اور تنقید رھے ھیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے افسانہ نگار، نقاد اور محقق بھی تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ماھر لسانیات ھیں اور اردو ادب کے اھم نقاد بھی ھیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے لسانیاتی کارنامے نمایاں حیثیت کے حامل ھیں وھاں انہوں نےتنقید و تحقیق اور غالبیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے کئے ھیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے لسانیات کے ساتھ اردو میں ادبی تحقیق و تنقید کے حوالے سے کام کیا ھے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور لسانیات اور ادب، دونوں ھیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر گیان چند نےتنقید و تحقیق پر زیادہ اور لسانیات پر کم توجہ دی ھے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز و محور لسانیات ھی رھی ھے۔ انہوں نے ادب کی تنقید و تحقیق پر توجہ نہیں دی ھے چوں کہ اردو دنیا عموی طور پرلسانیات سے بیگانہ رھی ھے اور اردو میں کسی بھی ماھر لسانیات کے لسانیاتی کارنامے اس کی پہچان کا حوالہ نہیں رھے ھیں، اس لئے اردو میں لسانیات سے جزوی دلچسپی اور اسے ضمنی حیثیت دے کر ، ادبی تحقیق و تنقید میں گہری دلچسپی لینے کا سبب اپنی شخصیت کی پہچان کرانا اور علمی مقام و مرتبے کو تسلیم کرانا ھے۔

حوالہ جات، حواشی ۔ دوسرا باب : اردو دنیا میں لسانیات کا شعور

1- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد ، (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ، 1971ء) ص 152

2- ڈاکٹر سیّد عبد اللّٰہ، مقدمہ مشمولہ نوادرالالفاظ تصنیف سراج الدین علی خاں آرزو، (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1951ء) ص 15

3- ایضاً ، ص 27

4- ایضاً ، ص 37

5- ایضاً ، ص 37

6- انشا اللّٰہ خاں انشا ، دریائے لطافت، مترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی ، مرتبہ مولوی عبد الحق (کراچی ، انجمن ترقی اردو، 1988ء) ص 353، 354

7- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (ایضاً) ص 173

8- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی ، (ملتان، بیکن بکس، 1993ء) ص 108

9- محمد حسین آزاد ، آب حیات (لاہور، شیخ مبارک علی تاجر کتب، س،ن) ص 6

10- محمد حسین آزاد کا اردو کے آغاز کے بارے میں نظریہ اور اس کا لسانیاتی جائزہ اور اردو کے ماہرین لسانیات کی اس نظریے کی تردید کے مباحث اس مقالے کے چوتھے باب " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات" میں پیش کئے جائیں گے۔

11- محمد حسین آزاد ، سخندان فارس (لاہور، مکتبہ ادب اردو، س،ن) ص 16

12- ایضاً ، ص 12

13- ایضاً ، ص 437

14- ایضاً ، ص 71، 72

15- ایضاً ، ص 78

16- مرزا سلطان احمد ، زبان، (لاہور، مرغوب ایجنسی ، 1923ء) ص 1

17- سراج الدین علی خاں آرزو، دیباچہ نوادر الالفاظ مرتبہ سیّد عبد اللہ (ایضاً) ص 3

18- ڈاکٹر سیّد عبد اللہ، نوادر الالفاظ، مقدمہ (ایضاً) ص 16

19- مولوی عبد الحق، لغت کبیر، مقدمہ (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان،) ص 37، 38

20- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات لغات اردو (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 17

21- ایضاً، ص 9 تا 20

22- مولوی عبد الحق، لغت کبیر، مقدمہ (ایضاً) ص 54

23- ڈاکٹر شوکت سبزواری، تعارف لغت کبیر مرتبہ مولوی عبد الحق (ایضاً) ص 12

24- مولوی عبد الحق، قواعد اردو، (اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، 1936ء) ص 19

25- ڈاکٹر شوکت سبزواری، "اردو قواعد کی ترتیب نو" مشمولہ لسانی مسائل (کراچی، مکتبہ اسلوب، 1962ء) ص 21

26- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جامع القواعد (حصہ صرف) مقدمہ (ایضاً) ص 179، 180

27- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (لاهور، مرکزی اردو بورڈ، 1973ء) ص ک

28- پروفیسر خلیل صدیقی، اپنی بات، مشمولہ زبان کیا ہے؟ (ملتان، بیکن بکس، 1989ء) ص 7

چوتھا باب

تاریخی اور تقابلی لسانیات — تاریخ و تنقید

==================================

زبانیں ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں، یہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس تغیر و تبدل کے مختلف عوامل اور کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ کبھی ایک زبان بولنے والے دو گروہوں میں تقسیم ہو کر مختلف علاقوں میں مقیم ہو جاتے ہیں یا مخصوص سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کے زیر اثر زبان اپنے بولنے والوں کے ساتھ اپنے وطن سے کسی دوسرے علاقے میں سفر کرتی ہے۔ کبھی حکومتی سرپرستی میں پھلنے پھولنے والی زبان اپنی ہمہ گیری اور مقبولیت کے باعث ایک وسیع علاقے میں پھیل جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان کسی مذہب کی ترجمان بن کر اس مذہب کے پیروکاروں کے ساتھ دور دراز علاقوں میں پہنچ جاتی ہے۔ کبھی حملہ آور اقوام کی زبان مفتوحین کی زبانوں پر غالب آ جاتی ہے یا غالب نہیں بھی آتی تو مفتوحین کی زبان پر اپنے اثرات قائم کرتی ہے یا مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہے۔ زبانیں اپنے مرکز سے دور ہو جائیں یا وسیع علاقے پر پھیل جائیں ہر صورت میں دوسری زبانوں سے میل جول کے نتیجے میں ان کے نظام میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کئی سطحوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ زبانوں کے میل جول کے علاوہ اندرونی تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ زبانیں جو بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ رہنے کے باوجود تغیر پذیر رہی ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی سیاسی و سماجی اور معاشی ضروریات میں تغیر، فطری طور پر ان کے لب و لہجے میں معمولی سا فرق، بولنے والوں کی صوتی عادتوں میں وقت کے ساتھ خفیف سی تبدیلی اور زبانوں کا تسہیلی رجحان، وہ عوامل ہیں جو زبانوں میں رفتہ رفتہ تبدیلیوں اور تغیرات کا باعث بنتے ہیں۔ اگرچہ تغیر کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست ہو سکتی ہے۔ یہ عوامل ان زبانوں میں بھی کارفرما رہتے ہیں۔

جو زبانیں بیرونی اثرات کی زد میں ہوتی ہیں یا دوسری زبانوں سے میل جول رکھتی ہیں۔ البتہ بیرونی اثرات تغیر کی رفتار کو ذرا تیز کر دیتے ہیں۔ ایسی زبانوں میں دخیل الفاظ کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل ہو جاتی ہے۔ ان لفظوں میں ایسی آوازیں بھی شامل ہو سکتی ہیں جن کے ادراک پر وہ لوگ قادر نہ ہوں جن کی زبانوں میں یہ الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ ایسے میں تبدیلیوں کی نت نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح زبانوں میں صوتی، صرفی، نحوی، اشتقاقیاتی اور معنوی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات زبانوں میں رونما ہونے والی ان تمام تبدیلیوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ تاکہ ان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے۔اس مطالعے میں ہمسایہ زبانوں کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اگر اس مطالعے کے نتیجے میں زبانوں میں مماثلتیں نظر آئیں تو ان کا تقابلی مطالعہ کر کے زبانوں کے خاندانی اور نسبی رشتوں کا کھوج لگایا جاتا ہے تاکہ ان کے مشترکہ ماخذ کا سراغ لگایا جا سکے۔

اردو کے مختلف ماہرین لسانیات نے تاریخی و تقابلی لسانیات کی تعریف اپنے انداز میں کی ہے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں لکھتے ہیں،

" تاریخی لسانیات میں ہم ان اصولوں اور قاعدوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے ماتحت زبانوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی لسانیات میں مختلف زبانوں میں آپسی رشتہ اور تعلق کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے ان میں یکسانیت یا اختلاف کی توجیہہ ملتی ہے۔" (1)

ڈاکٹر گیان چند جین تاریخی اور تقابلی لسانیات کے بارے میں لکھتے ہیں،

" زبان کے تاریخی ارتقاء کا مطالعہ تاریخی لسانیات کہلاتا ہے۔ اگر ایک خاندان کی دو زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اسے تقابلی لسانیات (Comparative Philology) کہتے ہیں۔" (2)

پروفیسر خلیل صدیقی تاریخی اور تقابلی لسانیات کے متعلق لکھتے ھیں،

" لسانیات کی اس شاخ میں ایک ھی زبان کے دور بہ دور کی مختلف صورتیں اور تغیر و تبدل کی نوعیتیں زیر بحث آتی ھیں، اس طرح زبان کی ارتقائی منزلیں منظر عام پر آ جاتی ھیں اور اس کی لسانی تاریخ مرتب ھو جاتی ھے۔ اسی لئے اسے تاریخی لسانیات کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے۔ چوں کہ دور بہ دور کی ھیئتوں اور صورتوں کے تقابل کے ساتھ ساتھ اور دوسری زبانوں کے اثرات، ان کے اجزاء و عناصر سے تقابل بھی ھوتا ھے۔ اس لئے اسے تقابلی لسانیات بھی کہا جاتا ھے۔" (3)

وہ تاریخی اور تقابلی لسانیات کے منصب کی توضیح کرتے ھوئے لکھتے ھیں کہ

" لسانیات کی یہ شاخ کسی نظام لسان میں دور بہ دور رونما ھونے والے تغیرات اور زبانوں کے خاندانی اور نسبی رشتوں کے مطالعہ سے تعلق رکھتی ھے۔ زبانوں کا تقابل اور تاریخی ارتقاء کا جائزہ اس کا مطمح نظر ھوتا ھے وہ ھمسایہ زبانوں کی مماثلتوں دور بہ دور کی مشابہتوں کے تقابل سے ان کے رشتوں کی نوعیت سمجھاتی اور ان کے مشترکہ سرچشمہ و ماخذ کا سراغ لگاتی ھے اور اس مقصد کے لئے زبان کے مستقل اور یکساں طور پر رونما ھونے والے صوتی تغیرات کی شناخت کو ذریعہ بناتی ھے۔" (4)

زبانوں کا تاریخی جائزہ اور ان کا تقابلی مطالعہ کرتے ھوئے ماھرین لسانیات کو لسانیات کے دیگر شعبوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ھے۔ تب ھی کسی نتیجے تک پہنچا جا سکتا ھے۔ اس ذیل میں " تقابلی لسانیات علم اصوات، صرف و نحو، اشتقاقیات اور معنویات کا سہارا لیتی ھے۔ اشتقاقیات اور تقابلی و تاریخی گرامر اس کے لئے کم و بیش بنیاد کی حیثیت رکھتے ھیں۔" (5)

تاریخی لسانیات زبان میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کا مطالعہ کرتی ھے تاکہ اس زبان کے

تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا جا سکے اور اس کے نظام ، ماہیت اور ماخذ کا سراغ لگایا جائے اس ذیل میں کسی ایک عہد میں زبان کی خصوصیات کا تقابل ماقبل یا مابعد کے عہد کی خصوصیات سے کیا جاتا ہے یہاں تاریخی لسانیات اور تقابلی لسانیات کے دائرے آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمسایہ زبانوں سے رشتوں کا کھوج لگانے، خاندان اور نسب کا تعین کرنے کے لئے زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ زبانوں کے ارتقائی مدارج کا تعین کر کے ان کی تاریخ مرتب کی جائے اور ان کے مشترکہ ماخذ کا استخراج کیا جا سکے۔ یہاں بھی تاریخی لسانیات اور تقابلی لسانیات کا دائرہ کار ایک ہو جاتا ہے۔ تاریخی اور تقابلی لسانیات کے اس تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں،۔

" تاریخی لسانیات کو اسی حد تک تقابلی سمجھا جا سکتا ہے جہاں تک نسبی رشتوں کی تلاش کا تعلق ایک ہی زبان کی ابتدائی اور مابعد کی صورتوں کے تقابل سے ہوتا ہے۔ عملی مقاصد کے لئے تقابلی لسانیات کے سہارے کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب کئی مماثل زبانوں کی ہم عصر ہیتوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔" (6)

زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعہ کے لئے ان سے متعلق مستند مواد کی دستیابی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں بہت دقت پیش آتی ہے کیوں کہ بعض اوقات زبانوں کے ہر عہد کے نمونے نہیں ملتے یا ہمسایہ زبانوں کے تاریخی شواہد اور دستاویزیں ناپید ہوتی ہیں۔ بول چال کی زبانوں کے نمونے تو مفقود ہوتے ہی ہیں ان کی تحریری صورتیں بھی نایاب ہوتی ہیں۔ بہت سی زبانیں تحریری صورت میں محفوظ ہو ہی نہیں سکیں اگر ان کی تحریری صورتیں رہی بھی ہوں گی تو وہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گئیں۔ معلومہ تاریخ میں زبانوں کی تحریری نمونے کتبوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبانوں کے ابتدائی نمونے اور مابعد کے نمونے دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن درمیانی عہد کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔

"۔۔۔ ایسی حالت میں ارتقاء کے رخ اور تغیر و تبدل کی نہج کو سمجھ کر مفقود کڑیوں

سے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے۔" (7) اگر زبانوں کی قدیم ترین صورتوں کے نمونے دستیاب نہ ہو سکیں اور بعد کی صورتوں کے نمونے موجود ہوں یا وہ زبانیں بولی جا رہی ہوں تو بھی ان کے تاریخی ارتقاء کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ان زبانوں کے ما بعد کے نمونوں اور موجودہ صورتوں کے تحلیلی مطالعہ سے ان کی قدیم صورتوں کی خصوصیات کا تعین کیا جا سکتا ہے، اس ذیل میں ان کی ہمسایہ زبانوں سے جو ہم ماخذ بھی ہوں، مدد لی جا سکتی ہے کیوں کہ ان میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ایسی ضرور باقی رہ جاتی ہے جو اس کے ابتدائی خط و خال کی نشان دہی کر دیتی ہے۔

"تحلیلی مطالعہ کی نظر زبان کی ساخت میں بھی، اس کے ارتقاء کی پرچھائیں دیکھ لیتی ہے۔ ہم عصر اور ہم رشتہ زبانوں کے تقابل سے بھی کچھ نہ کچھ نتیجہ خیز باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ہم ماخذ زبانیں مرور ایام کے ساتھ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو جاتی ہیں، ان میں سے اکثر اپنی متوارث خصوصیات بھی کھو بیٹھتی ہیں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی ایسی ضرور ہوتی ہے جس میں ان خصوصیات میں سے تھوڑی بہت اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔" (8)

لیکن اگر زبانوں کے ابتدائی نمونے بھی دستیاب نہ ہوں اور مابعد نمونے بھی مفقود ہوں، وہ زبانیں بول چال کی زبانیں بھی نہ رہی ہوں تو ان کے تاریخی و تقابلی مطالعہ کی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔ایسی صورت حال میں ہم عصر اور ہم ماخذ ہمسایہ زبانوں کا تحلیلی مطالعہ کر کے ان زبانوں کی، جن کے دستاویزی نمونے نایاب ہیں، خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں قیاس سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ تاریخی اور تقابلی لسانیات کے مطالعے میں ان دقتوں کی نشان دہی پروفیسر خلیل صدیقی نے کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"تقابلی لسانیات کے مطالعہ میں اس وقت بڑی دقت پیش آتی ہے جب بہت سی ایسی ہم رشتہ زبانوں کا تقابل کرنا پڑے، جن کے تاریخی شواھد اور

دستاویزیں نایاب ہوں، یا جو ضبط تحریر میں نہ آ سکی ہوں، مثلاً برصغیر پاک و ہند کی پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں سے بیشتر ضبط تحریر میں نہ آ سکی تھیں یا ان کی دستاویزیں نایاب ہیں اس لئے نہ تو ان کا تقابل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے متفرع زبانوں اور بولیوں کے دور بہ دور کے ارتقائی صورتوں کا صحیح مطالعہ ہو سکتا ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے ماخذ کے سراغ اور ان کے صحیح رشتوں کی نشان دہی کے سلسلے میں کم و بیش بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔" (۹)

تاریخی و تقابلی لسانیات کے مطالعے میں توضیحی لسانیات کو اہمیت حاصل ہے کیوں کہ زبانوں کے تاریخی و تدریجی ارتقاء میں صوتی تغیر کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ " تاریخی لسانیات کی بنیادی ہی صوتی تغیرات پر رکھی جاتی ہے۔" (10) صوتی تبدیلیاں کئی سطحوں پر رونما ہوتی ہیں زبان کی آوازوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ آوازوں میں ادغام یا مغائرت اور مستعاریت بھی ہوتی ہے۔ (11) گویا صوتیاتی اور فونیمیاتی حوالوں سے زبانوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ان کے مطالعے کے لئے توضیحی لسانیات سے مدد لی جاتی ہے۔ تاریخی و تقابلی لسانیات کے مطالعے میں توضیحی لسانیات کے مطالعہ کی اہمیت کے بارے میں پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں

" عام طور پر نظام لسانی کے دو مختلف ادوار کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے توضیحی و تشریحی تقابل سے تغیرات کا استنباط کیا جاتا ہے۔ گویا زبان کی تاریخ کے لئے بھی توضیحی مطالعہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔" (12)

البتہ توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات کے مباحث اور دائرہ کار الگ الگ ہیں جن کی توضیح پروفیسر خلیل صدیقی نے کی ہے۔

" تاریخی لسانیات ان مناہج کی تحقیق اور توضیح کرتی ہے جن کی بدولت زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہیں یا اپنی مخصوص ساخت

بنیادی طور پر برقرار رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس توضیحی لسانیات میں
زمانی یا تاریخی لحاظ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ پیش نظر لسانی مواد
کو مستقل حیثیت دی جاتی ہے۔" (13)

تاریخی لسانیات کے مطالعے میں اشتقاقیات کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اشتقاقیات الفاظ کے ماخذ اور عہد بہ عہد ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں ، صوری و معنوی تغیرات، صوتی تبدیلیوں اور ارتقائی نقوش کی دریافت و توضیح ، سے بحث کرتی ہے، تاریخی و تقابلی لسانیات کے مطالعے میں الفاظ کی تاریخ کا جائزہ لینا بھی شامل ہے۔ اسی طرح یہ گرامر سے بھی مدد لیتی ہے کیوں کہ زبانوں کے تاریخی ارتقاء کے جائزے میں صرف و نحو کی تبدیلیوں سے بھی بحث کی جاتی ہے اور تقابلی جائزے میں رشتوں کا تعین کرتے ہوئے زبانوں کی صرفی و نحوی خصوصیات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس ذیل میں تاریخی و تقابلی گرامر کے مباحث ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی تاریخی و تقابلی لسانیات کے مطالعے میں گرامر کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں،

" تاریخی اور تقابلی گرامر زبان کی مختلف منزلوں اور اخذ و استفادہ کی
نشان دہی کرتی ہے اور اسی طرح زبان کی تاریخ بتاتی ہے اور زبان
کے باہمی رشتوں کی تفہیم میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔" (14)

تقابلی گرامر اور تقابلی لسانیات کا تعلق اتنا قدیم اور گہرا ہے کہ تقابلی گرامر کو تقابلی لسانیات کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ (15)

زبانوں میں معنوی سطح پر بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لفظوں میں صوتی تغیرات بعض اوقات معنوی تبدیلیوں کا سبب بن جاتے ہیں زبانیں بولنے والوں کی سیاسی ، سماجی اور معاشرتی ضروریات بھی لفظوں میں معنوی تبدیلیاں لاتی رہتی ہیں۔ دخیل الفاظ بھی کبھی اپنے اصل معنوں کے ساتھ اور کبھی خفیف تبدیلی کے ساتھ یا مختلف معنوں کے ساتھ زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعے کی ذیل میں ان تمام

عوامل کا جائزہ بہت ضروری ہوتا ہے۔

زبانوں میں زمانی و مکانی تبدیلیوں کے ساتھ یا وقت کے ساتھ ساتھ اندروں سطح پر بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ زبانوں کی فطرت بھی ہے اور ان کے بولنے والوں کا اختیار بھی، زبانوں میں مماثلتیں اور مشابہتیں بھی ملتی ہیں اور یہ مختلف سطحوں پر ہوتی ہیں۔ جو زبانوں کے آپس کے رشتوں اور نسبی تعلق کا پتہ دیتی ہیں، یہ مماثلتیں اتفاقی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ ان کے اسباب و علل ہوتے ہیں، تاریخی و تقابلی لسانیات انہی اسباب و علل کا مطالعہ کرتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی تاریخی و تقابلی لسانیات کے اس منصب کی تصریح ان الفاظ میں کرتے ہیں،

" لسانی تقابل اس وجدانی فیصلے کا مرہون منت ہوتا ہے کہ دو یا زیادہ زبانوں کے صوتی معنیاتی عناصر کی مشابہتیں، حسن اتفاق نہیں ہو سکتیں کیوں کہ کلمے اور معنی و مدلول کا تعلق فطری نہیں بلکہ اختیاری ہوتا ہے اور متفق علیہ، مشابہتیں، تاریخی رشتے یا قرابت ہی کی وجہ سے ہو سکتی ہیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات میں اسی کی توضیح و توجیہہ کی جاتی ہے۔" (16)

تاریخی و تقابلی لسانیات کا آغاز انیسویں صدی میں ہوتا ہے۔ سر ولیم جونز نے 1786ء میں زبانوں کے آپس کے رشتوں کو دریافت کیا اور سنسکرت، لاطینی، یونانی اور جرمن زبانوں کی قدیم شکل میں قریبی تعلق کی نشان دہی کی اور ان کے مشترک ماخذ کی طرف اشارہ کیا۔ (17) ولیم جونز نے زبانوں کا تفصیلی تقابلی جائزہ پیش نہیں کیا تھا البتہ اس کی تحقیق نے تقابلی لسانیات کے لئے ایک نئی راہ ضرور کھول دی۔ اور زبانوں کا مطالعہ سائنسی بنیادوں پر ہونے لگا۔ اگرچہ "اہل مغرب کو سنسکرت سے متعارف کرانے اور تقابلی لسانیات کی داغ بیل ڈالنے میں سر ولیم جونز (William Jones (1746 تا 1794ء) کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔" (18) تاہم انیسویں صدی کے آغاز میں فریڈرک فان شلیگل (1772ء تا 1829ء)

نے اپنی تحقیقات سے لسانیات کو خاصا متاثر کیا۔ لیکن " حقیقت میں تقابلی لسانیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کا سہرا جرمنی کے ماہر لسانیات فرانز بوپ (Franx Bopp) (1791ء تا 1867ء) کے سر بندھتا ہے۔" (19) ریسمز رسک، فرانز بوپ اور جیکب گرم کے لسانیاتی کارناموں کی وجہ سے تاریخی و تقابلی لسانیات میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور لسانیات سائنس کا درجہ اختیار کر گئی ۔ ہند و یورپی/زبانوں کا سائنسی بنیادوں پر تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ، زبانوں کے مطالعے کے مناہج (Methodology) وضع کئے گئے۔ تاریخی و تقابلی گرامریں مرتب کی گئیں ، زبانوں میں صوتی تبدیلیوں کے قوانین بنائے گئے اور یوں لسانیات کے مطالعے میں نئی نئی راہیں کھلیں اور آگسٹ شلیخر (1821 - 1868ء) ، میکس ملر (1823 - 1900ء) ، ولیم ڈوائٹ وھٹنی (1827 - 1894ء) جیسے نامور ماہرین لسانیات کے لسانیاتی کارنامے منظر عام پر آئے۔

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کا دائرہ کار بہت محدود سا رہا ہے۔ ہمارے یہاں تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں اردو کے آغاز و ارتقاء اور اس کے وطن کے مسائل پر کام ہوا ہے۔ یا زبانوں کی گروہی تقسیم کے مسائل اور ہند آریائی اور غیر آریائی زبانوں کے لسانی رشتوں کے مباحث کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ذیل میں بھی تمام محققین نے یورپی ماہرین لسانیات اور مستشرقین سے خوشہ چینی کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اکثر نے لسانیاتی تحقیق کا حق ادا نہیں کیا ہے۔

اردو میں تاریخی اور تقابلی لسانیات

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کا آغاز اردو کی ابتداء اور وطن کے بارے میں قیاسی نظریات سے ہوتا ہے۔ اردو کے مصنفین میں ابھی لسانی شعور اتنا پختہ نہ تھا اور وہ مستشرقین کے لسانیاتی کارناموں سے واقف بھی نہ ہوئے تھے اس لئے انہوں نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں قیاس سے کام لیا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے قیاس

دلائل پیش کئے۔ اردو کی ابتداء کے بارے میں میر امن دہلوی کی رائے سب سے قدیم تصور کی جاتی ہے، باغ و بہار کے دیباچے میں انھوں نے لکھا۔

"حقیقت اردو کی زبان کی ، بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چو جگی ہے انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا ــــــــ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا ــــ"

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آ کر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔" (20)

میر امن کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد اور ہندوؤں سے ان کے میل جول سے اردو زبان وجود میں آئی۔ ایسا ہی خیال سر سید احمد خاں کا ہے۔

"جب کہ شاہ جہاں بادشاہ نے 1058ھ بمطابق 1648ء میں شہر شاہ جہاں آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا اس زمانہ میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں میں بسبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدیل ہو گئی۔ غرض یہ کہ لشکر بادشاہی اور اردوئے معلٰی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا۔" (21)

مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے اردو کی ابتداء کے بارے میں کم بیش ایسے ہی خیالات کا

اظہار کیا ہے۔

" جب شاہ جہاں بادشاہ نے 1058ھ میں شاہ جہاں آباد کو آباد کیا۔
۔۔۔۔ شاہ جہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی
علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ آ کر مجتمع ہوئے۔ قدیم
ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق ہونے لگا۔ زبان اردو کی
ترقی شروع ہوئی۔ " (22)

امام بخش صہبائی اردو کی ابتداء کے بارے میں لکھتے ہیں،

" شاہ جہاں آباد تیمور خاندان کے شاہ جہاں نے آباد کیا اس وقت
فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرت استعمال
کے سبب تبدیلی و تغیر واقع ہوا اور اس خلا ملا سے جو بولی مروّج
ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرایا۔ " (23)

سیّد احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ اردو کو مخلوط زبان قرار دیتے ہیں،

" ہندوستان کی دیسی مروّجہ زبان نے جسے اس وقت بھاشا اور خاص کر
برج بھاشا کہتے تھے اردو نام اختیار کیا ۔۔۔۔۔ مگر اصل میں اردو
زبان چوں کہ ایک مخلوط زبان ہے اور اس نے شاہ جہانی لشکر کی بولی
ہو جانے کی وجہ سے ترقی پا کر اردو نام پایا ۔۔۔ اس زبان کی بنیاد
اسی وقت سے پڑی جس وقت سے مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف
الوالعزموں، مختلف المذاہب بیرونی بادشاہوں، تاجروں، سیّاحوں،
خدا پرست درویشوں نے اس ملک میں آ آ کر اس کی قدیمی زبان میں
اپنی مادری زبان کے الفاظ، لغات، اسماؑ و محاورات، اصطلاحات وغیرہ
کو مخلوط کیا اور ایک مدت دراز کے بعد اس اتفاقی اختلاط سے یہ
زبان ایک معجون مرکب بن گئی۔ " (24)

میر امن کے مشاھدے میں یہ بات آئی ہو گی کہ جب مختلف زبانیں بولنے والے کہیں اکٹھے ہوتے ہیں تو اپنا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے ایک دوسرے کی زبان سے مدد لینا شروع کرتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ زبانوں کے میل جول سے نئی زبان وجود میں آ جاتی ہے۔ اگرچہ ہنگامی ضرورت کے تحت ایسا ممکن ہے تاہم اردو کے لئے یہ دعویٰ کرنے سے پہلے اس کا لسانیاتی مطالعہ ضروری تھا، لیکن میر امن نے قیاس کر لیا کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد، اکبر بادشاہ حکمران ہوا تو دارالخلافہ میں مختلف قوموں کا میل جول ہوا، یوں جدا جدا زبانوں کے لین دین سے اردو زبان وجود میں آ گئی۔ میر امن کی اس رائے کے اثرات بہت عرصے تک قائم رہے اور تقریباً ایک صدی تک علماً اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ اردو مخلوط یا ملواں زبان ہے۔ کسی نے یہ تک سوچنا گوارا نہ کیا کہ اردو اگر مختلف زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی ہے تو وہ زبانیں کونسی ہو سکتی ہیں، البتہ میر امن نے اردو کا وطن اکبر کے حوالے سے آگرے کو قرار دیا تھا جب کہ بعد میں آنے والوں نے اسے شاہ جہانی عہد سے منسلک کر کے اس کا وطن دہلی کو قرار دیا۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خاں نے جو ایک محقق کا مزاج رکھتے تھے اور بعد ازاں ان کے ہم نام سید احمد دہلوی نے جنہوں نے فرہنگ آصفیہ جیسی لغت مرتب کی، اپنے تحقیقی ذہنوں کو اردو کے لسانی مطالعے پر مرکوز نہ کیا بلکہ میر امن کے قیاس کو حقیقت تسلیم کر لیا۔ اس میں ان لوگوں کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں ہے کیوں کہ اس وقت تک اردو دنیا لسانیات کے علم سے واقف نہ ہوئی تھی لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ گریرسن اور ہیورنلے جیسے ماہرین لسانیات بھی ابتداً میں میر امن کے قیاسی نظریے کے سحر میں جکڑے گئے اور اردو کو مخلوط زبان قرار دے دیا۔ البتہ ان زبانوں کی نشان دہی بھی کر دی جن کے اختلاط سے اردو وجود میں آئی تھی۔ بعد میں لسانیاتی جائزہ ہند میں گریرسن نے اپنے نظریے میں ترمیم کی اور اعتراف کیا کہ مخلوط زبان کا نظریہ اس نے میر امن سے متاثر ہو کر پیش کیا تھا۔ (25)

بیسویں صدی میں اردو کے ماہرین لسانیات نے مخلوط زبان کے اس نظریے پر کڑی تنقید کی اور اردو کے لسانیاتی مطالعے کی بنیاد رکھی۔ حافظ محمود شیرانی نے مخلوط زبان کے ان نظریات

کو بزرگوں کے تبرک کے طور پر قبول کرتے ہوئے لکھا۔

" یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں، حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ ورنہ کیا اکبر اور شاہ جہاں سے پیشتر دلّی نہ تھی یا ہندو اور مسلمان نہ تھے یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے یا مختلف قو میں ایک جارہ سہکر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ " (26)

ڈاکٹر شوکت سبزواری ملواں زبان کے ان نظریات کو غیر سنجیدہ سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

" ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے۔ چڑیا لائی چانول کا دانہ چڑا لایا مونگ کا دانہ دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ ہندوؤں نے ہندی افعال و حروف فراہم کئے، ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اردو نے مغلوں کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے جنم لیا۔ " (27)

مخلوط زبان کے نظریے کو اردو کے ماہرین لسانیات نے اگرچہ رد کر دیا ہے تاہم گزشتہ ربع صدی میں ایسی زبانیں بھی لسانیات کے دائرہ تحقیق میں آئی ہیں جنہیں مخلوط زبانیں قرار دیا گیا ہے۔ ان زبانوں کو پجن (Pidgin) اور کری اول (Creole) کہا جاتا ہے۔ یہ زبانیں لسانی میل جول کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں اور ان کا محرک سیاسی، سماجی اور معاشی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ یہ زبانیں آہستہ آہستہ اپنا لسانی نظام وضع کر لیتی ہیں۔ جن اسباب کے تحت وجود میں آتی ہیں اگر وہ نہ رہیں تو معدوم بھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر سماج انہیں مستقل طور پر اختیار کر لے تو یہ باقاعدہ زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، ہینکاک(Hancock) نے 1971ء میں پجن اور کری اول کی فہرست میں " بازار ہندوستانی" زبان کو شامل کر کے اسے شمالی ہندوستان کی لنگوافرنکا قرار دیا ہے۔ (28) لیکن ڈاکٹر

مرزا خلیل بیگ اردو کو پجن اور کری اول زبان تسلیم نہیں کرتے۔

" پجن (Pidgin) اور کری اول (Creole) زبانوں کا معاملہ اور ہے اردو نہ تو پجن زبان ہے اور نہ ہی کری اول ---- اردو کا بنیادی ڈھانچہ یا کینڈا، اسی قدیم زبان پر قائم ہے جو اس کی اصل و اساس ہے۔" (29)

پجن اور کری اول زبانوں کے مطالعہ کے بھی اپنے خاص اصول و ضوابط ہیں، جو اردو کو مخلوط زبان قرار دینے والوں کے سامنے نہ تھے، اور ہو بھی نہیں سکتے تھے لیکن زبان کا مطالعہ ایک علمی، تحقیقی اور لسانیاتی مسئلہ ہے۔ میر امن نے تو قیاس سے کام لیا ہی تھا لیکن ان کی رائے پر صاد کہنے والوں کو اردو کا مطالعہ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے تھا۔ ان بزرگوں نے محض اس کے سرمایہ الفاظ پر ہی نظر رکھی اور ان کی ظاہراً مماثلتوں پر دھیان دیا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ " اردو کی اصل و اساس، اس کے ترکیبی اجزاء نیز اس کے بنیادی ڈھانچے یا کینڈے کو نظر انداز کر کے محض اس کے سرمایہ الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے اردو کو ایک کھچڑی زبان سمجھنا ایک گمراہ کن نظریہ ہے لیکن اردو کی پیدائش کا مسلمانوں کو ذمے دار ٹھہرانا اس سے بھی زیادہ گمراہ کن تصور ہے۔" (30) اردو کی ابتدا کے بارے میں قیاس پر مبنی نقطۂ نظر رکھنے والوں نے دو غلطیاں کیں ایک تو زبانوں کے سرمایہ الفاظ کی ظاہری مماثلتوں پر نظر رکھی دوسرے اردو کے آغاز کو مسلمانوں کی آمد کے ساتھ منسلک کر دیا۔ لیکن انہوں نے نہ تو تاریخی استدلال پیش کئے نہ لسانیاتی، اس لئے ان کا نقطہ نظر غیر لسانیاتی ہے۔

اردو کے لسانی مطالعے کا تاریخی و تقابلی رویہ

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کا دائرہ اردو کے لسانی مطالعے تک محدود رہا ہے اور اس محدود دائرے میں رہ کر بھی لسانیاتی تحقیق کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ ابتدا

میں لسانیاتی طرز استدلال اختیار کرنے کے بجائے تاریخی استدلال پر بھروسہ کیا گیا، بعد ازاں لسانیاتی نقطۂ نظر اختیار کیا بھی گیا تو ہمسایہ زبانوں پر کما حقہ، توجہ نہیں دی گئی۔ زبانوں کی تاریخی و تقابلی گرامر مرتب کرنے اور اشتقاقیاتی لغت ترتیب دینے کے بجائے مخصوص نتائج کے حصول کی خاطر زبانوں میں مماثلتوں اور مشابہتوں پر زیادہ توجہ دی گئی اور اختلافی عناصر کو نظر انداز کیا گیا۔ زیادہ تر مغربی ماہرین لسانیات کے تحقیقی کارناموں سے استفادہ کیا گیا اور زبانوں کے براہ راست مطالعے کی کوشش نہیں کی گئی۔

محمد حسین آزاد (1832 - 1910ء) لسانی شعور رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ علم لسانیات سے براہ راست واقف تو نہ تھے تاہم لسانی مشابہتوں اور زبانوں کے آپس کے رشتوں کا انہیں شعور تھا جس کا اظہار " سخندان فارس " (1887ء) میں ہوتا ہے۔ جس میں وہ زبانوں کے درمیان ماں بیٹی اور بہن کے رشتے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ (31) لیکن جب وہ " آب حیات " میں اردو زبان کی ابتداء پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کا یہ لسانی شعور پوری طرح کارفرما نظر نہیں آتا۔ وہ اردو اور برج میں لسانی مشابہتوں کو بھانپ کر کہتے ہیں۔

" اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔" (32)

محمد حسین آزاد نے اپنے اس دعویٰ کی حمایت میں لسانیاتی استدلال سے کام تو نہیں لیا البتہ اردو اور برج کی لفظی مشابہتوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ اردو پر دیگر زبانوں فارسی اور سنسکرت کے اثرات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ ہر زبان کا ڈھانچا اپنا ہوتا ہے۔ البتہ لفظوں کا لین دین دوسری زبانوں سے ہوتا رہتا ہے اور دخیل الفاظ اپنی شکل و صورت بھی بدلتے رہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

" سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اردو کا پتلا بنا ہے باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے --- دیکھو سنسکرت الفاظ جب اردو میں آئے تو ان کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ

کیوں کر صورت بدل لی۔" (33)

اردو کے بارے میں محمد حسین آزاد کی ان آراء سے ان کا لسانی شعور تو جھلکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو کی ابتداء کے بارے میں ان کے خیالات کا لسانیاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو اور برج کا لسانیاتی مطالعہ نہیں کیا تھا ورنہ ان زبانوں کے لسانی مزاج میں وہ اختلافات ان کے سامنے آ جاتے جن کی نشان دہی بعد میں دیگر محققین نے کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی اردو اور برج کے بارے میں لکھتے ہیں،

"جب ہم اردو کے ڈول، اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشہ کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔" (34)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو اور برج میں اختلافات کی نشان دہی کی ہے اور دونوں زبانوں کا تفصیل سے تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ "اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں مدد ضرور دی ہے۔" (35) ان کے خیال میں محمد حسین آزاد نے خان آرزو سے متاثر ہو کر اردو کا ماخذ برج بھاشا کو قرار دیا ہو گا۔

"خان آرزو" نوادرالالفاظ میں گوالیار (یا برج) کو "افصح زبانہائے ہند" اکثر جگہ لکھتے ہیں۔" (36)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو اور برج کے ایسے لسانی عناصر کی نشان دہی کی ہے جو ان دونوں زبانوں کے اختلاف کو نمایاں کرتے ہیں، جس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی بلکہ "یہ دونوں دو الگ الگ اور آزاد بولیاں ہیں جو بہنیں بہنیں تو کہلا سکتی ہیں پر ماں بیٹی نہیں ہو سکتیں۔" (37)

ڈاکٹر شوکت سبزواری، رام بابو سکسینہ کے حوالے سے محمد حسین آزاد کے اس خیال کو

غلط قرار دیتے ہیں کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے، ان کے خیال میں " اردو اس کی بہن کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔" (38) وہ خود بھی اردو اور برج کی لسانی خصوصیات کا تفصیل سے جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " اردو کا لسانی سرمایہ زیادہ پیچیدہ اور بعض حیثیتوں سے زیادہ قدیم ہے۔ وہ برج سے کسی طرح ماخوذ نہیں ہو سکتا۔" (39)

محمد حسین آزاد کے اس نظریے کو لسانیاتی استدلال سے کام لے کر رد کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے آزاد ہی وہ شخصیت تھے جنہوں نے پہلی بار ملواں زبان کے نظریے سے ہٹ کر اردو کا ماخذ کسی دوسری زبان کو قرار دیا اور اردو زبان کی تہہ میں اس کے ماخذ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اردو اور برج کے اس تعلق کی نشان دہی ڈاکٹر ہیورنلے نے کی تھی۔ (40) لیکن اردو دنیا میں " آب حیات" کا مقام اس حیثیت میں اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں دو زبانوں/ کے تقابل کے حوالے سے اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے اولین نقوش نظر آتے ہیں۔

حکیم شمس اللہ قادری نے " اردوئے قدیم" (1927ء) میں اردو کی ابتداء کے بارے میں انہی خیالات کا اظہار کیا جنہیں محمد حسین آزاد " آب حیات" ( ) میں پیش کر چکے تھے " اردوئے قدیم" 1925ء میں رسالہ " تاج " کے اردوئے قدیم نمبر میں شائع ہوا ۔ بعد ازاں اسے کتابی صورت میں ترمیم و اضافے کے ساتھ، 1927ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں اردو کی ابتداء اور اس کے وطن کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دکن میں اردو نظم و نثر کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو کی اصل کے بارے میں شمس اللہ قادری نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ محمد حسین آزاد کے خیالات کا ہی اعادہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

> " زمانہ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبان اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا ہے۔۔۔۔۔ مسلمان فاتحوں سے جب ہندوؤں کا میل جول ہوا تو برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا

جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد زبان کی اصلی ہیئت
بدل گئی جس کے باعث ایک جدید زبان کا ظہور ہوا۔ اور یہ جدید
زبان سلاطین مغلیہ کے دور میں زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔" (41)

حکیم شمس اللہ قادری کی یہ رائے محمد حسین آزاد کے نقطہ نظر کی باز گشت ہی ہے لیکن ان کا ذہن تضاد کا شکار بھی ہے اور وہ اردو کی ابتداء کے بارے میں بزرگوں کی دو قسم کی آراء میں سے کسی ایک کی حقیقت پر بھروسہ نہیں کر سکے ہیں۔ اس لئے جب وہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مخلوط تمدن کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اردو کو بھی مخلوط زبان قرار دیتے ہیں۔

" دونوں اقوام کی زبانوں کے اختلاط سے ایک تیسری زبان وجود میں آئی
جو اردو کے نام سے مشہور ہے۔" (42)

یہ غیر لسانیاتی طرز استدلال کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اردو کا لسانی مطالعہ کئے بغیر اور اس کی خصوصیات کا تعین کئے بغیر اس کی ابتداء کے بارے میں ایک متضاد فیصلہ کر لیا کہ اردو برج سے ماخذ بھی ہے اور مخلوط زبان بھی ہے۔ انہوں نے زبان کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور اردو پر برج کے اثرات کو دونوں زبانوں کے اختلاط کا کرشمہ سمجھ کر اسے مخلوط زبان قرار دے دیا۔ اس لئے ہم ان کے نقطہ نظر کو غیر لسانیاتی ہی کہیں گے، البتہ انہوں نے تاریخی استدلال سے ضرور کام لیا ہے اور اردو کے آغاز کے زمانے کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے ماقبل پیش کئے گئے نظریات کا احاطہ کیا ہے اور دکنی ادب کا مطالعہ کر کے اردو کے ارتقاء کی نشان دہی کی ہے۔

تاریخی و تقابلی لسانیات کے حوالے سے بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں جو کام ہوا، اسے غیر لسانیاتی یا کسی حد تک نیم لسانیاتی (کہ موضوع کے اعتبار سے اس کا تعلق لسانیات سے تھا) ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا دائرہ کار اردو کے آغاز و وطن کے بارے میں

اپنی آراؑ کے اظہار تک ہی محدود رہا، اتنا بھی ہوا کہ قیاسی اشتقاقیات سے کام لے کر ذخیرۂ الفاظ کا مطالعہ کیا گیا۔ طرز استدلال تاریخی ہی رہا، البتہ ان تمام آراؑ میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اردو کا وطن دہلی کو قرار دیا گیا۔ اس نقطۂ نظر پر سب ہی متفق رہے۔ حافظ محمود شیرانی (1880 - 1946ء) ایک صاحب نظر محقق تھے۔ ان کی محققانہ نظر نے اردو اور پنجابی کی لسانی خصوصیات میں مشترک عناصر کو تلاش کر لیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے پیش روؤں سے ہٹ کر محض قیاسات پر نظریات کی عمارت اٹھانے کے بجائے، زبانوں کے بارے میں لسانیاتی نقطۂ نظر اختیار کیا، ان کا لسانیاتی کارنامہ " پنجاب میں اردو" (1928ء) ہے، جس نے اردو دنیا میں دور رس اثرات مرتب کئے۔

حافظ محمود شیرانی نے اردو اور پنجابی کے لسانی مطالعے کے نتیجے میں دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی نشان دہی کی ہے۔ اور دونوں زبانوں کی مشترک لسانی خصوصیات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اردو دنیا میں، اردو کی ابتداؑ اور وطن کے مسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلی بار لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا اور اردو کا پنجابی اور برج بھاشا سے تقابل کر کے اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی بنیاد رکھی۔ حافظ محمود شیرانی کے مباحث کے بنیادی نکات یہ ہیں۔

1- اردو کا آغاز شاہ جہاں اور اکبر سے بہت پہلے ہو چکا تھا " بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔" (43)

2- اردو برج بھاشا کی بیٹی نہیں ہے کیوں کہ دونوں کی صرف و نحو میں اور دوسرے خصائص میں فرق ہے" اس لئے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔" (44)

3- مسلمان فاتحین کی ابتدائی قیام گاہ پنجاب بنتا ہے اور دارالسلطنت لاہور، یہاں وہ کئی سو سال تک قیام کرتے ہیں اور یہاں کی زبان کو اپنی روزمرہ کی ضرورتیں پوری کرنے

کے لئے اختیار کر لیتے ھیں اور جب دارالسلطنت لاھور سے دھلی جاتا ھے تو مسلمان یہی زبان اپنے ساتھ وھاں لے جاتے ھیں لہذا اردو دھلی کی قدیم زبان نہیں ھے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دھلی جاتی ھے اور " دھلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باھمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رھتی ھے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ھوتی جاتی ھے۔" (45)

4- پنجاب سے مسلمان پنجابی یا اس سے مماثل کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے " غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ھے۔ ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ھو سکتی ھے اور چوں کہ پنجاب میں بنی ھے۔ اس لئے ضروری ھے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ھو یا اس کی قریبی رشتہ دار ھو۔" (46)

5- تاریخی واقعات یہ ثابت کرتے ھیں کہ پنجاب کے دھلی پر سیاسی اثرات رھے ھیں " سیاسی نقطہ نظر سے پنجاب کا اثر دھلی پر ھر عہد میں نمایاں رھا ھے ۔ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ھوتا ھے۔ چناں چہ جب ھم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ، ان کے قواعد اور عام ھئیت کا مقابلہ کرتے ھیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ھوتا ھے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکارا ھو جاتا ھے۔" (47)

اس تاریخی استدلال کی روشنی میں حافظ محمود شیرانی اس نتیجے تک پہنچے کہ اردو کا ماخذ پنجاب ھی کی کوئی زبان ھو سکتی ھے۔ انھوں نے موجودہ اردو، قدیم دکنی اردو اور موجودہ پنجابی میں صرفی و نحوی مماثلتیں بھی ڈھونڈھ لیں اس طرح انھوں نے اردو اور پنجابی میں لسانی قرابت کا نظریہ پیش کیا ۔ اس ذیل میں انھوں نے اردو اور پنجابی کی مماثل صرفی نحوی خصوصیات کا تقابلی جائزہ پیش کیا ھے۔ جو " پنجاب میں اردو" میں " پنجابی اور اردو" کے عنوان سے شامل ھے۔ یہ حصہ اردو میں تقابلی و تاریخی لسانیات میں بہت اھمیت کا حامل ھے۔ اس لئے کہ اردو لسانیات میں اس سے پہلے اس طرح لسانیاتی نقطہ نظر سے زبانوں کا

لسانی تقابل نہیں کیا گیا تھا۔

اردو اور پنجابی کی مماثل صرفی و نحوی خصوصیات کے تقابلی جائزے میں حافظ محمود شیرانی نے جو مثالیں دی ہیں وہ موجودہ اردو اور دکنی قدیم اردو ادب سے لی گئی ہیں اور ان کا تقابل موجودہ پنجابی سے لی گئی مثالوں سے کیا گیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں تئیس صرفی نحوی قاعدوں کا تقابل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ

> " اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر طیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجہ کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوتی ہے۔" (48)

اس باب کے دوسرے حصے میں بیس ایسی لسانی خصوصیات کا تقابل کیا گیا ہے جو اردو اور پنجابی میں مماثل ہیں۔ اس حصے میں تمام تر مثالیں قدیم دکنی اردو ادب سے لی گئی ہیں اور ان کا تقابل موجودہ پنجابی سے کیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے اردو اور پنجابی کا جو لسانی تقابل کیا ہے وہ کئی اعتبار سے نا مکمل ہے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی کی تمام لسانی خصوصیات کا تقابل نہیں کیا بلکہ صرف مماثلتوں پر نظر رکھی ہے۔ دونوں زبانوں کے لسانی اختلاف کو نمایاں نہیں کیا اگر کہیں لسانی اختلاف کا ذکر کیا بھی ہے تو اپنے طور پر اس کی توجیہہ کر دی ہے جو لسانیاتی نقطہ نظر سے محل نظر ہے۔ اس لئے ڈاکٹر سہیل بخاری کا یہ کہنا صحیح ہے کہ حافظ محمود شیرانی نے اپنے نظریے کو برحق ثابت کرنے کے لئے اردو اور پنجابی کی مشترک خصوصیات کا تقابل کیا ہے جب کہ ان کے لسانی اختلاف کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں،

" اپنی کتاب " پنجاب میں اردو " کے مقدمے میں اردو اور برج بھاشا دونوں بولیوں کی صرف اور نحو کا پھیر دکھا کر یہ بتاؤ کر دیا ہے کہ اردو کو بھاشا سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا نہیں بہنوں کا ناتا ہے پر آگے چل کر اپنی کتاب میں اردو اور پنجابی کے ملتے جلتے لچھن گنا کر یہ منوانا چاہا ہے کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے۔ ان کی کھوج کا ڈھنگ یہ ہے کہ جب دو بولیوں کو الگ الگ دکھانا ہو تو ان کے بل سامنے رکھو اور جو دونوں کو ایک ہی بولی منوانا ہو تو ملتے جلتے لچھن گناؤ۔ انہوں نے پہلے یہ سوچ رکھا تھا کہ اردو اور پنجابی کو ایک دکھانا ہے اس لئے دونوں کے بل صاف اڑا گئے اور ملتے جلتے روپ اور اصول بڑھا چڑھا کر لکھ گئے۔ " (49)

ڈاکٹر سہیل بخاری کے علاوہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں (مقدمہ تاریخ زبان اردو) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری (داستان تاریخ زبان اردو) نے حافظ محمود شیرانی کے اس نظریے پر سخت تنقید کی ہے اور انہوں نے دونوں زبانوں کی جن لسانی خصوصیات کا تقابلی جائزہ لیا ہے ان کی تفاصیل بہت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں جس نتیجے پر ڈاکٹر سہیل بخاری پہنچتے ہیں۔

" ان لچھنوں کو دیکھ کر جو اردو اور پنجابی کو الگ کرتے ہیں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دونوں دو الگ الگ اور آزاد بولیاں ہیں۔ " (50)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے " مقدمہ تاریخ زبان اردو " میں " پنجابی اور دکنی " کے عنوان سے حافظ محمود شیرانی کے لسانی نظریہ پر تنقید کی ہے، ان کے لسانی استدلال اور پنجابی اور اردو کے لسانی تقابل کا تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری " داستان زبان اردو " کے چوتھے باب " اردو اور پنجابی " میں دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ

مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ھیں، مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ھیں۔ " (51)

ڈاکٹر گیان چند جین نے حافظ محمود شیرانی کے لسانی استدلال میں تضادات کی نشاندھی کی ھے ان کے خیال میں حافظ محمود شیرانی کو " اردو سے قبل کی لسانی صورت حال کی کوئی واقفیت نہ تھی .... وہ تاریخی لسانیات کی مبادیات تک سے اتنے بے خبر ھیں کہ مغربی ھندی میں راجستھانی اور پنجابی کو بھی شامل کر بیٹھے ..... مسلمانوں کی آمد دھلی یعنی بارھویں صدی عیسوی کی زبان وہ سولھویں سترھویں صدی کے نمونوں کی بنا پر طے کرتے ھیں ...... حقیقت یہ ھے کہ وہ اردو کی بنیادی زبان اور میرٹھ کی بولی کو نہیں مانتے۔ انہیں اس کے خدو خال کے بارے میں اندازہ ھی نہیں۔ وہ صرف یہ مانتے ھیں کہ اردو قدیم پنجابی سے ماخوذ ھے۔ چناں چہ وہ اپنا پورا زور قدیم اردو اور پنجابی کی مماثلت دکھانے میں صرف کر دیتے ھیں۔ " (52)

ڈاکٹر گیان چند جین نے یہاں چند اھم حقائق کی نشان دھی کی ھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حافظ محمود شیرانی ماھر لسانیات نہ تھے ان کی لسانی تحقیقات سے واضح ھوتا ھے کہ انہیں علم لسانیات سے گہری واقفیت نہ تھی، مثلاً وہ مغربی ھندی میں پنجابی اور راجستھانی کو بھی شامل کر دیتے ھیں۔ وہ مشرقی و مغربی پنجابی کی تقسیم کو بھی رد کرتے ھیں اور لہندا اور پنجابی کو ایک ھی زبان سمجھتے ھیں اور اس قسم کی تقسیم کو ناجائز قرار دیتے ھیں۔ وہ ایسے نظریات کو رد کر رھے ھیں، جن پر اکثر ماھرین لسانیات متفق ھیں اور حافظ محمود شیرانی اختلافات کی وجوھات تک بیان نہیں کرتے۔

اردو اور پنجابی کے لسانی تعلق کا نظریہ حافظ محمود شیرانی کی لسانی تحقیق کا نتیجہ نہیں ھے بلکہ وہ خود اس کا اعتراف کرتے ھیں کہ " اردو زبان کے آغاز کا سر زمین پنجاب سے منسوب ھونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ھے اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدہ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سر خوش اپنے پر لطف تذکرہ " اعجاز سخن " میں

اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔" (53) اور مسعود حسین خاں کے خیال میں " شیرانی کو اپنے نقطہ نظر کے لیے اشارہ خود گریرسن کی تحریروں میں مل گیا ہے، جس نے ارد و کے"پنجابی پن" پر غیر معمولی زور دیا ہے۔" (54)

حافظ محمود شیرانی کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا گیا ہے تو ان کے نظریے کی پر زور تائید بھی کی گئی ہے۔ اردو کے معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں۔

" پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقا پاتے رہے ہیں ..... اردو میں چند اجزاء ایسے ہیں جن کی توضیح صرف عہد حاضر کی پنجابی ہی کے مطالعہ اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہو سکتی ہے۔ نیز چند عناصر ایسے ہیں کہ جن کا حوالہ سوائے پنجابی کے کسی اور زبان میں نہیں، مگر یہ خصوصیتیں زیادہ تر لفظی حیثیتوں اور صوتی تغیرات سے متعلق ہیں جو خصوصیتیں براہ راست تعمیر زبان سے تعلق رکھتی ہیں، موجودہ اردو میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف قدیم دکنی کارناموں میں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے نہایت ہی مفید اور اردو کی تخلیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لئے کافی ممد و معاون ہو سکتا ہے۔" (55)

ٹی۔گراہم بیلی (وفات : 1942ء) نے، جو پنجابی زبان کے عالم تھے، حافظ محمود شیرانی کے نظریے کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔

" اردو 1027ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی ماشدر (سوتیلی ماں)۔ برج سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں ..... مسلمان سپاہیوں نے پنجابی

نہ تھا، اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دئیے۔" (56)

حافظ محمود شیرانی کے نظریات کا لسانیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو چند ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جن کی روشنی میں ان کے لسانیاتی استدلال کے سقم واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر زبان کا اپنا لسانی مزاج ہوتا ہے، جو اس کے صرفی و نحوی اور صوتی نظام اور سرمایہ الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر زبان کی لسانی خصوصیات اس کے لسانی مزاج کا تعین کرتی ہیں۔ دو زبانوں میں فرق و امتیاز، ان کے لسانی مزاج یا ان کی لسانی خصوصیات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ایک ہی خاندان کی زبانوں میں مشترک لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، لیکن ان مشترک لسانی خصوصیات کی بنیاد پر ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہوتا، بلکہ بہن بہن کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ان مشترک لسانی خصوصیات میں ہر زبان کی اپنی مخصوص لسانی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو اسے اپنے خاندان کی دیگر زبانوں میں ممتاز کرتی ہیں۔ ایک ہی خاندان کی زبانوں میں قدامت کا فیصلہ ان کی مخصوص الگ الگ لسانی خصوصیات کے تقابلی مطالعے سے کیا جاتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو اور پنجابی کی مشترک لسانی خصوصیات میں سے چند ایک کا تقابل تو کیا ہے لیکن ان زبانوں کی اپنی مخصوص خصوصیات کا تعین نہیں کیا، اس لئے وہ اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کا صحیح تعین نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو اور پنجابی کی دیگر ہمسایہ زبانوں کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی کے ارتقائی ادوار کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے اور ان دونوں زبانوں کے صوتی نظام کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی کی صرفی و نحوی مماثلتوں اور مشابہتوں اور مشترک سرمایہ الفاظ پر نظر رکھی ہے، اس لئے لسانیاتی نقطہ نظر سے ان کے نظریات میں سقم رہ گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے پہلی بار دو زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں ایک حد تک لسانیاتی طرز استدلال بھی اختیار کیا، اس لئے ان کا یہ تحقیقی کارنامہ " پنجاب میں اردو"، اردو لسانیات میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

" 1928ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب " پنجاب میں اردو " شائع ہوئی ۔
اس کی اہمیت ادبی تاریخ و تنقید کے لحاظ سے بہت کم اور لسانی
تحقیق کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ " (57)

اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ،

" اس دور کا اردو میں لسانیاتی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ پروفیسر
شیرانی کی " پنجاب میں اردو " (1928ء) ہے۔ جو ترتیب کے اعتبار سے
نا مکمل سہی ، تحقیق کے اعتبار سے گراں قدر تصنیف ہے۔ " (58)

اردو اور پنجابی کے لسانی تعلق پر حافظ محمود شیرانی کی تحقیق اگرچہ عصر حاضر کے لسانیاتی نقطہ نظر کے مطابق نہیں ہے تاہم ان سے اس کی توقع بھی نہیں کی جانی چاہیے کیوں کہ وہ ماہر لسانیات نہ تھے، انہوں نے اردو اور پنجابی کا لسانی تقابلی ، لسانیاتی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ ایک علمی و فکری سرگرمی کے طور پر کیا ، لیکن چوں کہ " پنجاب میں اردو " میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے نقوش باقاعدہ اور منظم صورت میں نظر آتے ہیں ، اس لئے اردو لسانیات کی تاریخ میں اسے ایک اہم مقام حاصل رہے گا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور (1905 - 1962ء) نے ہندوستانی لسانیات (1932ء) کے حصہ دوم میں ہندوستانی (اردو) کے آغاز و ارتقاء کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔(59) ڈاکٹر زور اردو کی ابتداء کے دیگر تمام نظریوں کو رد کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں کہ اردو کی ابتداء پنجاب میں ہوئی ۔ ان کے خیال میں اردو کا سنگ بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا اور مسلمان فاتحین اسے پنجاب سے دہلی لے گئے، لہذا یہ خیال غلط ہے کہ اردو کا تعلق ان زبانوں سے ہے جو دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں، بلکہ " ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا ...... اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ

زبان تھی جو پنجاب سے لے کر دوآبۂ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی ۔ البتہ اردو پر نواح دھلی کی دیگر زبانوں بانگڑو یا ھریانی کا بھی قابل لحاظ اثر ھے۔

ڈاکٹر زور کے خیال میں ھندوستانی (اردو) کا ارتقاء پنجاب سے شروع ھوا اور اس کے " ثانوی مدارج " دوآبہ، گجرات اور دکن میں تکمیل پذیر ھوئے۔ دھلی میں اس زبان نے ھریانوی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات قبول کئے اور دھلی سے دکن اور گجرات پہنچ کر یہ زبان مذکورہ تین زبانوں کے مزید اثرات سے محفوظ ھو گئی کیوں کہ شمال اور دکن و گجرات سیاسی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ھو گئے۔ " چناں چہ اس نے (اردو نے) بہت سی وہ خصوصیتیں محفوظ رکھیں جو آج پنجابی سے مشابہ ھیں۔ یہی دراصل وہ راز ھے جو شمال اور جنوب کی اردو میں آج تک اختلاف کا باعث ھے۔" (61) شمال میں یہ زبان اپنی ہم خاندان دوسری ھمسایہ زبانوں کے اثرات کی زد میں رھی اور فارسی زبان کے اثرات بھی اس پر پڑتے رھے اس لئے یہ دکن کی اردو سے جداگانہ حیثیت اختیار کر گئی جب کہ دکن و گجرات میں اردو ان تمام اثرات سے محفوظ رھی اور اپنی قدیم شکل و صورت قائم رکھی یہاں اس میں ادب بھی تخلیق ھوا۔ ان تمام عوامل کا یہ نتیجہ نکلا کہ " شمالی ھندوستانی پر کھڑی کا ایسا گہرا اثر مرتسم ھوا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ھو گئیں اور جو کچھ باقی رھیں وہ مسخ شدہ حالت میں ھیں اسکے برخلاف دکنی میں قدیم سے قدیم شکلیں اور خصوصیتیں بالکل محفوظ رھیں، جن کی بنا پر وہ جدید پنجابی کے بہت کچھ مشابہ ھے۔" (62)

اردو کے ارتقاء کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر زور اس کی تین ادبی بولیوں " گجراتی، دکنی اور شمالی " کا تقابلی جائزہ لے کر ان کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کرتے ھیں۔ ان کے خیال میں ھندوستانی (اردو) چوں کہ برصغیر کے ایک وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان ھے اس لئے مختلف علاقوں میں جغرافیائی ، سیاسی اور معاشرتی اختلاف کی وجہ سے اور ان علاقوں کی مقامی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے اردو کے لب و لہجے میں فرق پیدا ھو جانا ایک فطری امر تھا یہی وجہ ھے کہ گجرات، دکن اور شمال میں اردو مختلف بولیوں میں تقسیم

ہو کر ارتقاء پذیر رہی۔ ڈاکٹر زور نے ان تینوں بولیوں کا تقابلی جائزہ لے کر ان عوامل کی نشان دہی کی ہے جو ان بولیوں میں فرق اور امتیاز پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہ تینوں بولیاں جدا جدا ارتقاء پذیر رہیں۔ یہ تقابلی جائزہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس سے دکن کی اردو اور شمال کی اردو میں اختلافی عناصر کی نشان دہی ہوتی ہے جو اردو زبان کے ماخذ تک پہنچنے میں بھی مدد دے سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخری دو ابواب میں ڈاکٹر زور نے اردو کی اصلاحی تحریکوں (تحریک مظہر (شمال) اور ناسخ کی اصلاحی تحریک (لکھنؤ)) کی افادیت کا جائزہ لیکر ہندی، اردو تقسیم کے مضمرات کی نشان دہی کرتےہوئے ، دونوں نقطہ ہائے نظر میں انتہا پسندی کے رجحان کو اردو کی ترویج کے لئے نقصان دہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کا ماخذ پنجاب کی زبان کو قرار دے کر وہ نقطہ نظر اختیار کیا ہے جو حافظ محمود شیرانی کا ہے۔ وہ خود اس حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ " پنجاب میں اردو کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی (1927ء) سےوہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھے اور وہ بھی اسی نتیجے تک پہنچے تھے جس کی وضاحت حافظ محمود شیرانی نے کی ہے۔ (63) ڈاکٹر زور کو اردو اور پنجابی میں لسانی تعلق کا اشارہ ٹی۔ گراہم بیلی کی تحقیقات سے بھی ملا ہو گا، جن کے ساتھ وہ لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ٹی گراہم بیلی اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔ ڈاکٹر زور نے انہی بنیادوں پر اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کا کھوج لگانا شروع کیا اور اپنی لسانی تحقیق کے نتائج " ہندوستانی لسانیات " میں پیش کر دئیے۔ جس میں انہوں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں کی طرف چند اشارے تو کئے ہیں لیکن دونوں زبانوں کا تاریخی و تقابلی جائزہ پیش نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے اردو کی تین بولیوں دکنی، گجراتی اور شمالی کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے جو اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات میں ایک اچھا اضافہ ہے

" ہندوستانی لسانیات " کے علاوہ ڈاکٹر زور نے اسی موضوع پر " اردو کی ابتداء " کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو " اردوئے معلی " کے لسانیات نمبر میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں انہوں نے اردو کی ابتداء کے نظریات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اردو کی ابتداء اور وطن کے مختلف نظریات میں جو تضادات اور الجھاؤ ہیں وہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان نظریات کا نئے سرے سے لسانیاتی جائزہ لیا جائے۔ ان کا ایک مضمون " اردو اور پنجابی " نقوش لاہور میں پہلی بار 1953ء اور دوسری بار نقوش کے ادب عالیہ نمبر بابت اپریل 1960ء میں شائع ہوا۔ (64) اس مضمون میں انہوں نے " اردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے۔ 1928ء کے بعد اردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن زور کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد تھا کہ وہ بعد کی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم پر آمادہ نہ ہوئے۔ " (65)

لسانیات میں ڈاکٹر زور کی گہری دلچسپی اور یورپ میں معروف ماہر لسانیات کے ساتھ ان کی سرگرمیوں کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو میں ڈاکٹر زور کے لسانیاتی کارنامے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کا اصل لسانیاتی کارنامہ " ہندوستانی فونیٹکس " ہے، لیکن وہ انگریزی زبان میں شائع ہوا اور تاحال اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ (66) ڈاکٹر زور کا علمی پس منظر اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ اگر وہ لسانیات میں کام کرتے رہتے تو اردو لسانیات آج دیگر زبانوں سے اتنی پیچھے نہ ہوتی ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ

> " اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے لکھنے پر مائل کرتے تو اردو زبان اس صنف میں اتنی پچھڑی نہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔ " (67)

اس کے باوجود " ہندوستانی لسانیات " کو اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں اس لیے ایک اہم مقام حاصل ہے کہ اس میں اردو کے لسانی مطالعے کے لئے لسانیاتی مناہج اختیار کئے گئے ہیں۔

اردو میں لسانی موضوعات پر جس زمانے میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے تحقیق کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند علماؑ ایسے بھی تھے جو معاصر لسانیاتی تحقیق سے بیگانہ ہو کر اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں انہی غیر لسانیاتی نقطہ ہائے نظر کے زیر اثر، جو گزشتہ صدی میں پیش کئے گئے تھے اور جنھیں لسانیاتی تحقیق نے رد کر دیا تھا، اردو کے مقامی زبانوں سے لسانی روابط تلاش کر رہے تھے۔ ان میں سیّد سلیمان ندوی، نصیرالدین ہاشمی، اختر اورینوی، عبدالصمد صارم، حسام الدین راشدی اور ڈاکٹر آمنہ خاتون شامل ہیں۔ یہ تمام علماؑ اس امر پر متفق ہیں کہ اردو مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد پیدا ہوئی۔

سیّد سلیمان ندوی (1884 - 1935ء) نے اپنے دو تحقیقی مقالات میں اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ دونوں مقالات ان کی کتاب " نقوش سلیمانی " (1939ء) میں شامل ہیں۔ پہلے مقالے " ہندوستانی میں ہندوستانی " (68) میں وہ اردو کا وطن سندھ کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

> " مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔" (69)

اس کے بعد وہ تاریخی استدلال کے سہارے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

> " عربی، فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے۔ جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی تھی۔ اس زمانہ میں ایران ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا ہے اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آ کر ہندوستان کے

سلطان ناصرالدین قباچہ کے زمانہ تک جو سلطان التمش کا معاصر حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز شقل ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دھلی کو منتقل ہو گیا۔" (70)

اس طرح انھوں نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے میں ترمیم کر کے پہلے اردو کی ابتدا سندھ میں ثابت کی اور پھر اسے ملتان کے راستے لاہور اور وہاں سے دھلی لے گئے۔ جہاں سے اردو معیاری زبان کا درجہ حاصل کر کے ھندوستان کے تمام صوبوں میں پھیل گئی۔

"سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ھیں تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ھے۔ تینوں میں عربی و فارسی کا میل ھے صیغوں کے طریق میں تھوڑا فرق ھے .... موجودہ اردو انھی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ھے۔ یعنی جس کو ھم اردو کہتے ھیں اس کا آغاز ان ھی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ھوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دھلی کی بولی سے جس کو دھلوی کہتے ھیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔" (71)

سید سلیمان ندوی، سندھی، ملتانی اور پنجابی کے مماثل لفظی اشتراک پر نظر رکھتے ھیں اور ان کے صیغوں کے طریق میں فرق کو نظر انداز کر کے تین الگ الگ زبانوں کو ایک زبان کی تین بولیاں قرار دیتے ھیں۔ درحقیقت اس مضمون میں وہ پنجاب کے مقابلے پر سندھ کو اردو کا وطن قرار دینا چاھتے ھیں اور یہاں کی زبان کو دھلی پہنچا کر دارالسلطنت کی معیاری زبان کا درجہ دے کر ھندوستان کے تمام صوبوں میں پھیلا دیتے ھیں تاکہ فضیلت کی دستار پنجاب کے مقابلے پر سندھ کے حصے میں آئے، لیکن وہ تمام تر تاریخی استدلال سے کام لیتے ھیں اور ایک لسانیاتی مسئلے کو الجھا کر تضاد کا شکار ھو جاتے ھیں جب وہ اپنے دوسرے مقالے " اردو کیونکر

ان کے خیال میں
پیدا ہوئی۔ " (72) میں اردو کو مخلوط زبان کہتے ہیں/ ہندوستان کے ہر صوبے کی زبان کے
ساتھ عربی فارسی کے میل جول سے اردو کی پیدائش ہوئی اور وہیں ارتقاء پذیر رہی۔

" اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، " پنجاب اور بنگال، ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی، جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکھنی اور دہلوی ہیں۔ " (73)

اس طرح سیّد سلیمان ندوی اپنے پہلے نظریے سے انحراف کرتے ہیں، دراصل جب انہوں نے دیکھا کہ اردو کا آغاز مختلف علاقوں سے منسوب کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے تو انہوں نے اس اہم لسانیاتی مسئلے کو بڑے سہل انداز میں اس طرح حل کر دیا کہ " آج کل بعض فاضلوں نے " پنجاب میں اردو" اور بعض اہل دکن نے " دکن میں اردو" اور بعض عزیزوں نے " گجرات میں اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے، ان سب کا نام " اردو" رکھ دیا گیا ہے، حالاں کہ ان کا نام پنجابی، دکھنی یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہئیے" (74)

اختر اورینوی نے بھی اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں سیّد سلیمان ندوی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ " سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے قریباً سارے صوبوں میں اردو کی تخلیق اور نشو و نما ہوئی ہے۔ " (75) جیسے جیسے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا میل جول ہوا، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے مقامی زبانوں پر اثرات سے اردو پیدا ہوتی گئی۔ یہی حال صوبہ بہار کا ہے، جہاں " اردو کہیں سے درآمد نہیں کی گئی بلکہ اسی سر زمین میں پیدا ہوئی ہے۔ " (76)

حسام الدین راشدی پر سیّد سلیمان ندوی کے پہلے نظریے کا اثر بہت گہرا ہے، اس لئے

وہ سندھ کو اردو کا وطن قرار دینے پر مصر نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں چوں کہ یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد یہاں کی مقامی بولیوں پر عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات سے وجود میں آئی ہے تو عرب و عراق سے ہزاروں مسلمان خاندان سب سے پہلے سندھ میں آ کر آباد ہوتے ہیں، اس لئے " قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا اور کچھ شک نہیں کہ سندھ اور ملتان ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا۔" (77)

نصیرالدین ہاشمی اردو کا وطن سندھ اور دکن کو تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ ان کے خیال میں ان علاقوں میں آباد ہونے والے مسلمان عربی بولتے تھے جب کہ اردو پر فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ (78) لیکن وہ اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ " یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔" (79) اس لئے وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد وہاں کی مقامی زبان سے مسلمانوں کی زبان کی آمیزش سے اردو کی پیدائش کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں اور اس نظریے کی بھی تائید کرتے ہیں کہ مسلمان شمال سے ایک نیم پختہ اردو زبان دکن لائے۔ یہاں یہ زبان دکھنی کہلائی اور آزادانہ ارتقائی منازل طے کرنے لگی اور یہی زبان شمال میں اردو سے موسوم ہوئی۔ (80)

نصیرالدین ہاشمی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اردو کا وطن دکن کو قرار دیتے ہیں، (81) لیکن ان کی کتاب " دکن میں اردو " سے ایسی کوئی واضح شہادت نہیں ملتی، البتہ وہ یہ دعوی ضرور کرتے ہیں کہ اردو احاطۂ تحریر میں، سب سے پہلے دکن میں آئی۔ " اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلاخوف تردید یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتداً پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی۔ " (82) ان کے اس بیان میں الجھاؤ ضرور ہے اور اس کے آخری حصے سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اردو کی ابتداً دکن میں ہوئی۔ اس تضاد کا ذکر ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو کے آغاز کے نظریوں کا تنقیدی

جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے۔ (83)

عبدالصمد صارم الازہری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی اور دہلی سے نہیں لائی گئی۔ انہوں نے اردو کی تاریخ پر دو مقالات لکھے ہیں، جو ادبی دنیا کے دو مختلف شماروں میں شائع ہوئے، ان کے خیال میں "عربی اور ایرانی وغیرہ الفاظ کو ہندوؤں نے اپنی زبان میں ملایا، ان کی کثرت سے زبان کا حلیہ بدل گیا اور ایک نئی زبان جس کو اردو کہتے ہیں وجود میں آ گئی۔" (84) اور یہ عمل جنوبی ہند میں ہوا، اس لئے اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ وہ اس نقطہ نظر کو کسی صورت قبول نہیں کرتے کہ اردو دہلی سے دکن میں آئی۔ "لیکن یہ بات کہ دہلی سے اردو دکن میں آئی کسی طرح قابل قبول نہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو کا آغاز السنۂ ہند میں عربی الفاظ کے ملنے سے ہوا۔ تو اس کا پہلا مقام جنوبی ہند ہے۔" (85) ان کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اردو ہندوؤں میں پیدا ہوئی کیوں کہ انہوں نے اپنی زبان میں عربی الفاظ کو شامل کرنا شروع کیا اور مسلمانوں نے چوں کہ یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے انہیں مجبوراً اپنی زبان کو چھوڑ کر نئی زبان اختیار کرنا پڑی۔ (86) شمال اور جنوب کی زبانوں کے بارے میں وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ شور سینی شمال اور جنوب کی زبان تھی۔ شمال میں اس نے عربی فارسی کے اثرات سے برج بھاشا کی شکل اختیار کر لی اور جنوب میں اردو کی۔" (87) اپنے دوسرے مضمون "اردو زبان کی تاریخ" میں بھی وہ کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اردو چوں کہ ہندوستانی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کے میل جول سے پیدا ہوئی اور یہ میل جول جنوبی ہند میں ہوا۔ اس لئے اردو جنوبی ہند میں پیدا ہوئی۔ تاریخی واقعات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے جنوبی ہند میں آ کر آباد ہوئے تھے۔" (88)

عبدالصمد صارم کے نقطۂ نظر سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار ڈاکٹر آمنہ خاتون نے دکنی کی ابتداء (1970ء) کے نام سے ایک کتابچے میں کیا ہے۔ جس میں انہوں نے دکنی کو اردو سے ایک علیحدہ زبان قرار دیا ہے اور اس کی ابتداء سر زمین دکن کو قرار دیتی ہیں اس

نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے کہ یہ زبان دہلی سے مسلمانوں کے ساتھ جنوبی ہند میں پہنچی ان کے خیال میں مسلمانوں کے دہلی میں پہنچنے سے بھی کم از کم ساڑھے پانچ سو سال پہلے، دکن میں مرہٹی زبان میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی تھی۔(89) ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر آمنہ خاتون کے اس نظریے پر کڑی تنقید کی ہے ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون کو وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی سے کوئی واقفیت نہیں، کیوں کہ جدید ہند آریائی زبانوں کا ظہور بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون ساتویں صدی عیسوی میں دکنی پر راجستھانی، گجراتی، مرہٹی اور برج بھاشا کے اثرات کا ذکر کر رہی ہیں۔ (90) ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کا یہ استدلال بھی درست ہے کہ جنوبی ہند کے بحری راستوں سے جو عرب مسلمان دکن آئے ان کا واسطہ یہاں کی دراوڑی زبانوں سے پڑا۔ جب کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون مرہٹی میں عربی فارسی کے شمول اور راجستھانی، گجراتی اور برج بھاشا کے اثرات سے دکنی کے وجود میں آنے کی بات کر رہی ہیں۔ (91)

اردو دنیا پر حافظ محمود شیرانی کی " پنجاب میں اردو" کے انتہے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے کہ دو دہائیوں تک اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں جو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے وہ حافظ محمود شیرانی کے نظریے کا رد عمل یا باز گشت ہی تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو کا وطن قرار دیا تو ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علماؔ نے اپنے علاقے کو اردو کا وطن قرار دینے کا رویّہ اختیار کر لیا، جس کے نتیجے میں، سندھ میں اردو، دکن میں اردو، بہار میں اردو اور پھر ہر صوبے میں اردو کی پیدائش کے ثبوت پیش کئے جانے لگے اور پہلے سے دائج کا تعین کر کے، ان کے لئے شواہد اکٹھے کئے گئے، یہ علمی سرگرمی لسانیات میں گراں قدر اضافے کا باعث بن سکتی تھی اگر لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا جاتا اور اس صوبے کی زبان، جس سے اردو کا آغاز ثابت کیا جاتا ہے، لسانیاتی مطالعہ ہوتا۔ اس سے ایک تو مختلف صوبوں کی بولیوں کی لسانیاتی تاریخ سامنے آ جاتی، دوسرے ان زبانوں کے تقابل سے صحیح نتائج بھی اخذ

ہوتے، لیکن ہوا اس کے برعکس، اور محض تاریخی واقعات کی شہادت کو بنیاد بنا کر، بلکہ اس سلسلے میں بھی قیاسات کا سہارا لے کر من پسند نتائج حاصل کئے گئے۔ حتیٰ کہ معاصر لسانیاتی تحقیق کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ سیّد سلیمان ندوی، اختر اورینوی، حسام الدین راشدی، نصیرالدین ہاشمی، عبدالصمد صارم اور ڈاکٹر آمنہ خاتون کے یہاں اسی قسم کا طرز استدلال نظر آتا ہے۔ انہوں نے زیر مطالعہ زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ کرنے کے بجائے محض قیاسات سے کام لیا ہے اور تاریخی واقعات کو ان قیاسات کا سہارا بنایا ہے حالاں کہ اگر تاریخی واقعات کا معروضی جائزہ لیا جاتا تو نتائج اس کے برعکس ہوتے۔

اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں پنڈت دتاتریہ کیفی کا نقطۂ نظر بھی اسی رجحان کا حصہ ہے، جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا ہے۔ کیفی نے اردو کے آغاز و ارتقاء اور وطن کے مسئلے کو اپنے طور پر سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس امر سے متفق ہیں کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ تاریخی واقعات کے حوالے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے ہی، دونوں قوموں کے تجارتی اور سیاسی روابط کے نتیجے میں، ہندوستان میں فارسی کے اثرات قائم ہو چکے تھے۔ (92) اور جب مسلمان فاتحین پنجاب پہنچ کر سکونت پذیر ہوئے تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول اور مقامی زبان پر عربی فارسی کے اثرات کے نتیجے میں "قیاس یہ چاہتا ہے کہ اوّل اوّل ایک چوں چوں کے مرّبے کی سی ادھ کچری، کھچڑی بولی پنجاب میں شروع ہوئی ہو گی۔ پھر پنجاب سے شمال مغربی ہند میں پھیلی۔" (93) اس قیاس کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے وہ مختلف تاریخی واقعات کا حوالہ دینے کے بعد اس قطعی نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ "اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور اس کی پیدائش کے ذمہ دار ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔" (94) کیفی کا تعلق پنجاب سے لیکن وہ دہلی میں سکونت پذیر ہیں اس لئے وہ پنجاب کو اردو کا وطن قرار دینے سے پہلے ایک معذرت کر لینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ "یہاں یہ امر اچھی طرح واضح کر دینا مقصود ہے کہ راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطّے کو اردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا

یہ طرّہ امتیاز ایک سے چھین ، دوسرے کی دستار میں لٹکایا جائے۔" (95) اس کا ازالہ وہ اپنے ایک مضمون " اردو لسانیات " میں کرتے ہیں اور تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں، جب وہ اردو کا وطن دوآبہ گنگا و جمنا کو قرار دیتے ہیں۔

" بہرحال کامل تحقیق اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دسویں صدی کے قریب سورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبہ گنجم میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی اسے مستشرق اور لسّان ہندوستانی کہتے ہیں پھر اس کی دو شاخیں ہو گئیں جس کی وجہ اوّل اوّل رسم الخط تھی ۔ یہ دو شاخیں آپ کی ہندی اور اردو ہیں۔" (96)

منشورات میں شامل ایک اور مضمون " پنجاب میں اردو" میں وہ پھر پنجاب کی طرف آتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

" ـــــ یہ کہنا قرین انصاف ہے کہ واقعات حاصلہ کو ذہن نشین رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے استدلال کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنجاب اردو کے قدیم مسکنوں میں سے ہے۔" (97)

پنڈت دتاتریہ کیفی کے خیالات میں یہ تضاد اور خلط مبحث اس لئے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے ایک لسانیاتی مسئلے کو حل کرنے کا آغاز قیاس سے کیا اور نتیجے کا تعین پہلے سے کر لیا "کیفیہ" کے مباحث میں حافظ محمود شیرانی کے نظریے کی کاملاً تائید کی گئی ہے۔ ان مباحث میں کیفی نے اردو کے ابتداء کے دیگر نظریات کو رد کیا ہے۔ وہ " سندھ کا قضیہ" کے زیر عنوان سندھ میں اردو کے آغاز کے نقطہ نظر کو یک قلم رد کر دیتے ہیں۔" (98) اور اس ذیل میں ان دلائل کی تردید کرنا بھی پسند نہیں کرتے جن کی بنیاد پر سندھ کو اردو کا وطن قرار دیا گیا۔ اس کے برعکس وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ اردو دہلی سے دکن اور گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پہنچی ۔ بلکہ وہ ہندوستان کے جس علاقے میں گئے اردو کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ (99)

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے کیفی کی ان تحقیقات کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ " کیفی نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اگرچہ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے لیکن اس مسئلے پر ان کی معلومات تشنہ ہیں۔ " (100) اس رائے پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ لسانیات کے بارے میں ان کی معلومات تشنہ ہیں اور ان کا طرز استدلال غیر لسانیاتی ہے۔

سیّد احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب " این آوٹ لائن آف انڈین فائلوجی "(1866) کا ترجمہ کیا، جو " ہندوستانی لسانیات کا خاکہ " کے عنوان سے 1948ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں احتشام حسین کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں دیگر لسانیاتی مباحث کے علاوہ اردو کے آغاز و ارتقا کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ وہ اس مسئلے پر معاصر ماہرین لسانیات کے نظریات سے متفق نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں غزنویں کے زمانے میں مسلمان جب پنجاب میں قیام پذیر تھے تو اس وقت پنجاب میں شور سینی اپ بھرنش کی کوئی شکل رائج رہی ہو گی، مسلمانوں کے یہاں سکونت پذیر ہونے سے لسانی اختلاط بھی ہوا ہو گا، لیکن اس کی شہادتیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس لئے کوئی نتیجہ نہیں دکالا جا سکتا۔ (101) البتہ یہاں قیام کے دوران انہوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہو گی، چناں چہ ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے۔ جب مسلمان دھلی کی طرف بڑھے تو انہیں پنجابی سے ملتی جلتی نئی بولیوں سے سابقہ پڑا، اس لئے دھلی کی ان بولیوں، پنجابی، بانگارو (مع ہریانی)، کھڑی بولی اور برج بھاشا کے اثرات اس نئی زبان پر قائم ہوئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لسانی اختلاط سے وجود میں آ رہی تھی۔ ان بولیوں میں کھڑی بولی زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ کھڑی بولی نئے لسانی عناصر جذب کر کے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ (102) اس بحث سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " اردو کی ابتدائی ہیئت ترکیبی میں پنجابی کا زبردست ہاتھ ہے۔ اردو کی صوتی خصوصیات اسے برج بھاشا سے دور رکھتی ہیں لیکن پنجابی اور کھڑی بولی کی صوتی خصوصیات ابتدائی اردو میں پائی جاتی ہیں۔ بعد میں ایسی تبدیلیاں ہو گئیں جنہوں نے اسے پنجابی سے اور دور کر دیا

اور کھڑی بولی نکھرتی گئی۔ یہاں تک کہ محض بول چال کے دائرے سے نکل کر وہ ایک ادبی زبان بن گئی۔" (103)

سیّد احتشام حسین کے ان بیانات میں خاصا خلط مبحث ہے۔ ایک طرف وہ نئی زبان (اردو) پر کھڑی بولی کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف کھڑی بولی کو ایک ادبی زبان (اردو) کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اردو، پنجابی اور کھڑی بولی کی جن صوتی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں ان کی نشان دہی نہیں کرتے۔ اردو کی ابتداء کے مسائل پر اظہار خیال کے بعد انہوں نے اردو کے ارتقاء پر بحث کی ہے۔ لیکن اس بحث میں مذکور، تاریخی حوالے اردو کے لسانی ارتقاء کے بجائے محض اس کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں سیّد احتشام حسین کا نقطۂ نظر ہم عصر ماہرین لسانیات کے نظریات کی باز گشت ہے۔ جس میں مزید الجھاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے۔

اردو کے آغاز و ارتقاء اور وطن کے بارے میں حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کے رد عمل میں قیاس آرائیوں کا جو سلسلہ چلا وہ تو جاری ہی رہا لیکن اس دوران اس موضوع پر قابل قدر تحقیقی کام بھی ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ اس ذیل میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کے عنوان سے 1948ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مروّجہ روش سے ہٹ کر، قیاس آرائی کے بجائے، لسانیاتی نقطۂ نظر اختیار کر کے اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے مسئلے پر تحقیق کو صحیح سمت میں آگے بڑھایا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر حافظ محمود شیرانی کی نسبت زیادہ مدلل اور طرز استدلال زیادہ لسانیاتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا دعویٰ ہے کہ ان کے تحقیقی مقالے میں اردو زبان کے تسلسل کی نشان دہی ویدک زمانہ (1500 ق - م) سے عالم گیر کے عہد تک کی گئی ہے۔" (104) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد اچانک ایک نئی زبان اردو کا ظہور نہیں ہو گیا تھا بلکہ مسلمانوں نے ایک ایسی زبان کو، جو پہلے سے یہاں بولی جا

رھی تھی لیکن ابھی اس کے خط و خال واضح نہیں ھوئے تھے، اختیار کیا اور ان کی سرپرستی میں یہ زبان نکھرتی چلی گئی ۔ اس ذیل میں وہ حافظ محمود شیرانی کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ھیں کہ مسلمان پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ دھلی لائے تھے، ان کے خیال میں حافظ محمود شیرانی نے اردو میں پنجابی کے جن عناصر کی نشان دھی کی ھے یہ وہ عناصر ھیں جو دھلی کے نواح میں بولی جانے والی زبان ھریانی میں بھی موجود ھیں۔ لہذا اردو کا پنجابی پن اس کا ھریانی پن ھے۔" (105) البتہ وہ اس امر میں حافظ محمود شیرانی سے متفق ھیں کہ دکن میں اردو شمالی ھند سے پہنچتی ھے۔ (106) لیکن دکنی کا پنجابی پن، جس کی نشان دھی حافظ شیرانی نے کی تھی دراصل اس کا ھریانی پن ھے۔ اس ذیل میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے پنجابی اور دکنی زبانوں کا تقابلی جائزہ لے کر حافظ محمود شیرانی کے نقطہ نظر کی تردید کی ھے۔ اس سے ان کا یہ نقطہ نظر واضح ھو جاتا ھے کہ مسلمان جس زبان کو اپنے ساتھ دکن لائے وہ زبان انھوں نے دھلی میں پہنچ کر اختیار کی تھی ۔ پنجاب سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ اس لئے وہ دکنی میں نواح دھلی کی دیگر بولیوں ھریانی، برج بھاشا اور کھڑی کے لسانی عناصر کی نشان دھی بھی کرتے ھیں۔ اس ذیل میں انھوں نے دکنی اور ھریانی، دکنی اور میواتی اور دکنی اور کھڑی بولی کا تقابلی جائزہ لیا ھے، جس کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچے ھیں کہ قدیم اردو پر ان بولیوں کے اثرات موجود ھیں۔ وہ محمد حسین آزاد کے اس نظریے کی تردید کرتے ھیں کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ھے اور اردو کا برج بھاشا سے لسانی تقابل کر کے دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیات میں اختلاف کی نشان دھی کرتے ھیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے جدید ھند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا مطالعہ کرنے کے دو اصول بتائے ھیں۔ پہلا یہ کہ ھند آریائی زبان کے ارتقا کی عہد قدیم سے/کرتے ھوئے نشاندھی بالخصوص عہد اپ بھرنش کی ادبیات کا لسانی جائزہ لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ زیر مطالعہ زبان کا تمام ھمسایہ زبانوں کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ (107) اردو کے آغاز و ارتقا کا مطالعہ کرتے ھوئے انھوں نے انہی دو اصولوں کو پیش نظر رکھا ھے۔ گزشتہ صفحات/ میں ڈاکٹر مسعود حسین [illegible]

کے خیالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ وہ اردو کا وطن دھلی کو قرار دے رھے ھیں۔ لیکن وہ کونسی زبان ھے، جسے مسلمان دھلی پہنچ کر اختیار کرتے ھیں اور پھر اپنے ساتھ دکن لے جاتے ھیں، اس زبان کا کھوج ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عہد اپ بھرنش کے ادب سے لگایا ھے۔ شور سینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ھندی کی بولیوں کا اجمالاً لسانی جائزہ لیتے ہوئے لسّانی تسلسل کی نشان دھی 1000ء تک کرتے ھیں۔ اس کے بعد 800ء سے 1300ء تک عہد اپ بھرنش کی تصنیفات کا لسانیاتی جائزہ لیتے ھیں۔ 1300ء سے 1750ء تک کا زمانہ جدید ھند آریائی زبانوں کے ارتقاً کے حوالے سے اھمیت کا حامل ھے۔ لیکن اس دور کی

زبانوں کے تحریری نمونے ناپید ھیں، جس کی وجہ سے اردو کی مسلسل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی اس کے باوجود جو بھی تحریری نمونے دستیاب ھو سکتے ھیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے انکا لسانیاتی جائزہ لیا ھے۔ انہوں نے ان ادوار کے تحریری نمونوں کا اگرچہ دقت نظر سے مطالعہ کیا ھے تاھم لسانیاتی نقطہ نظر سے یہ مطالعہ کئی حوالوں سے نا مکمل کہا جا سکتا ھے۔ انہوں نے قدیم عہد کے ان تحریری نمونوں سے حاصل شدہ لسانی مواد کا تجزیہ کر کے اس زبان کی جو اردو کا ماخذ ھو سکتی ھے، لسانی خصوصیات کا تعین نہیں کیا اور نہ ھی اس کا تاریخی و تقابلی مطالعہ کر کے، زبان کے ارتقائی مدارج کا تعین کیا ھے۔ اردو لسانیات میں جس کی ایک ھی مثال ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب " اردو زبان کا ارتقاً" (1956ء) میں نظر آتی ھے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اردو کے آغاز و ارتقاً اور مولد و منشا جیسے اھم لسانیاتی موضوع پر اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ھیں کہ جدید ھند آریائی زبانوں کا آغاز پراکرتوں سے نہیں بلکہ اپ بھرنشوں سے ھوتا ھے۔ شور سینی اپ بھرنش سے، جو کسی زمانے میں شمالی ھند کی " لنگوا فرینکا " کی حیثیت رکھتی تھی، کھڑی بولی یا ھندوستانی (موجودہ اردو یا ھندی) نے جنم لیا، اور آج دوآبہ کی یہی بولی یعنی کھڑی بولی، ھندوستان کی لنگوا فرینکا بن ھوئی ھے، جو یقیناً اس تاریخی حادثہ کا طفیل ھے کہ مسلمانوں نے دھلی

کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔(109) قدیم اردو پر دھلی کے نواح کی بولیوں ھریانی اور میواتی کے اثرات بھی ھیں، اس لئیے "نواح دھلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ھیں اور "حضرت دھلی" اس کا صحیح مواد و منشا۔" (110)

ڈاکٹر مسعود حسین کا نقطہ نظر اور لسانیاتی تحقیق کا یہ کارنامہ کئی حوالوں سے خاص اھمیت کا حامل ھے، لیکن ان کے اس تحقیقی کام میں کئی مقامات پر خلط مبحث اور تضادات بھی نظر آتے ھیں۔ مثلاً وہ اس کتاب کے مباحث میں شروع سے لیکر آخری باب سے پہلے تک کے ابواب میں کھڑی بولی کو ھندوستانی یا اردو قرار دیتے چلے آتے ھیں اور کئی مقامات پر انہوں نے واضح طور پر لکھا ھے کہ شور سینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی یا ھندوستانی (موجودہ اردو یا ھندی) نے جنم لیا ھے۔(111) لیکن آخری باب کے تمہیدی حصے میں وہ یہ کہہ کر تضاد کا شکار ھو جاتے ھیں کہ "قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ھریانی کے زیر اثر ھوئی ھے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ھیں۔" (112) یہاں کھڑی بولی اردو سے الگ ایک حیثیت اختیار کر لیتی ھے۔ اس تضاد کی نشان دھی ڈاکٹر گیان چند نے بھی کی ھے۔(113) اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین خاں شور سینی اپ بھرنش کی چار شاخیں 1۔ کھڑی بولی یا ھندوستانی (موجودہ اردو) 2۔ راجستھانی 3۔ پنجابی (مشرقی) 4۔ گجراتی اور پہاڑی بولیاں (114) کا تعین کرنے کے بعد اگلے باب میں کہتے ھیں کہ شور سینی اپ بھرنش نے مغربی ھندی کو جنم دیا اور مغربی ھندی چار ذیلی شاخوں میں تقسیم ھو گئی جو یہ ھیں، 1۔ بندیلی 2۔ ھریانی یا بانگڑو 3۔ برج بھاشا (جس میں قنوجی بھی شامل ھے) 4۔ کھڑی بولی یا ھندوستانی ۔(115) اس طرح یہ تضادات خلط مبحث پیدا کرتے ھیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے مقالے کے آخری حصے میں اردو کو کھڑی بولی سے الگ قرار دے کر، اردو پر ھریانی، میواتی اور کھڑی بولی کے لسانی اثرات کی نشان دھی کر کے یہ دعویٰ کیا ھے کہ "نواح دھلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ھیں۔" جب کہ اسی

دھلی ھی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکل پر کام کرنے کی ضرورت ھے۔" (116) اس بیان سے یہ ظاھر ھو رھا ھےکہ نواح دھلی کی بولیوں، ھریانی، کھڑی اور میواتی، میں سے کوئی ایک اردو کا ماخذ ھے اور باقی بولیوں نےاس پر اپنے اثرات ڈالتے ھیں، کھڑی بولی کے حوالے سے مقالے کے اکثر مقامات پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بیانات اس خیال کی تائید بھی کرتے ھیں لیکن مقالے کا آخری باب جس میں کھڑی بولی کو اردو سے الگ قرار دے دیا گیا اور پھر یہ دعویٰ کہ نواح دھلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ھیں، ظاھر کرتا ھے کہ وہ اردو کو نواح دھلی کی بولیوں کا ملغوبہ قرار دے رھے ھیں، اس امر کی نشان دھی ڈاکٹر گیان چند نے بھی کی ھے کہ "وہ تو اردو کو نواح دھلی کی کئی بولیوں ھریانی، کھڑی بولی اور میواتی کا ملغوبہ قرار دیتے ھے۔" (117) در حقیقت ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بیانات کئے تضاد اور ابہام سے ایسا خلط مبحث پیدا ھوتا ھے کہ ان کی تحقیقی صلاحیتوں، لسانیات سے گہری دلچسپی اور علمی مرتبے کے اعتراف کے باوجود ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو کہنا پڑا کہ

> "ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایسے گنجلک اور مبہم و متضاد بیانات سے معمور ھو گئی ھے کہ ان پر ایک سرسری تبصرے کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ھے اور مصنف نے لسانیاتی مسائل سے گہری شغف کا ثبوت دیا ھے۔ لیکن محض جیولز بلاک کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغاز اردو کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ھے۔" (118)

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں جیولز بلاک کے اس نقطہ نظر سے کہ اردو پر ھریانی کے اثرات ھیں اور نواح دھلی کی بولیوں میں اردو کے ماخذ کی تلاش کرنا چاھیے۔ متاثر ھیں۔ اور وہ اپنے مقالے کے آغاز ھی میں اس امر کا اعتراف بھی کرتے ھیں۔(119) اور انھوں نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ھے جو اردو سے

ھریانی کا تعلق ثابت کرنے سے مربوط بھی ھے لیکن اس ذیل میں ان کی تحقیقی کاوش کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس سے نئے حقائق سامنے آتے ھیں، ڈاکٹر زور کا یہ اعتراض کہ " اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اھم فروگزاشت یہ ھوئی ھے کہ انہوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ھریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کئے ھیں۔" (120) یہی اھم فروگزاشت حافظ محمود شیرانی سے بھی ھوئی تھی، حقیقت یہ ھے کہ شمالی ھند کی جدید آریائی زبانوں کے ایک خاص عہد کے تحریری نمونے ابھی تک دستیاب نہیں ھو سکے ھیں۔ اس لئے اردو کی ھمسایہ زبانوں کے جدید نمونوں کا قدیم اردو (دکنی) سے تقابل کیا جاتا رہا ھے۔ اس امر کا اعتراف ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کیا ھے۔(121) البتہ اس تقابل کے نتیجے میں قطعی رائے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نظریات سے سخت اختلاف کرتے ھوئے کڑی تنقید کی ھے لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے " مقدمہ تاریخ زبان اردو" کو عظیم لسانیاتی کارنامہ قرار دیا ھے، ان کا خیال ھے کہ

> " پروفیسر مسعود حسین خاں کی " مقدمہ تاریخ زبان اردو" دھلی(1948ء) اردو کے آغاز و ارتقاء اور اس کی سلسلہ وار تاریخ پر جدید لسانیاتی تناظر میں، اور جدید تحقیقی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی ایک ایسی جامع اور مستند تصنیف ھے جس کی ھم پلہ کوئی دوسری تصنیف آج تک منظر عام پر نہیں آ سکی۔" (122)

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ حق شاگردانہ ادا کرتے ھوئے خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کے مصداق، مقدمہ تاریخ زبان اردو کے تضادات، مبہم بیانات اور خلط مبحث سے صرف نظر کرتے ھیں۔ ورنہ حقیقت یہ ھے کہ " مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں لسانیاتی نقطہ نظر سے بھی بہت سے سقم ھیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نقطہ نظر کے ...

ہریانی کے اثرات کا جائزہ لیا جانا چاہیے، اور ان کی تحقیق کا مرکزو محور یہ ہے کہ اردو کا مواد و منشا حضرت دہلی ہے۔ در حقیقت تحقیق کا مقصد شواہد کے تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں حقائق کو تلاش کر کے نتائج کا اخذ کرنا ہے۔ تحقیقی عمل میں شواہد اور حقائق کی ترتیب و تنظیم اور دلائل کے ایک مربوط نظام کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے یہاں ہمیں ان امور کی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے پیش رووں کے برعکس پہلی مرتبہ اردو کے آغاز و ارتقاؑ اور مواد و منشا کے لسانیاتی مسئلے پر تحقیق کا آغاز صحیح خطوط پر کیا ۔ ہند آریائی زبانوں کے تاریخی ارتقاؑ پر بحث کرتے ہوئے، اردو کے ماخذ کا سراغ لگانے کی کوشش کی ۔ قدیم زبانوں کے تحریری نصوص سے لسانی مواد کا کھوج لگایا ۔ اردو کے جنم بھوم کا تعین کرتے ہوئے، دہلی اور اس کے گرد و نواح کی زبانوں پر، یعنی قدیم اردو کی ہمسایہ زبانوں ، پر نظر رکھی ۔ لیکن انہوں نے قدیم زبانوں کے تحریری نصوص سے حاصل شدہ لسانی مواد کا ، اور اردو کی ہمسایہ زبانوں کے لسانی مواد کا تاریخی و تقابلی مطالعہ نہیں کیا ۔ جس سے اردو کے ارتقائی مدارج کا تعین کر کے اس کے ماخذ کا سراغ لگایا جا سکتا تھا ۔ ان کے یہاں مذکورہ لسانی مواد کی ، جو شواہد کی حیثیت رکھتا ہے، ترتیب و تنظیم اور تجزیاتی مطالعہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ انہوں نے زبانوں کے صوتی مطالعے پر بھی بہت کم توجہ دی ہے۔ در حقیقت ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیق کی بنیاد پہلے سے متعین کئے گئے نتائج پر رکھی ۔ اور ان نتائج کو برحق ثابت کرنے کے لئے شواہد کی جستجو کی گئی ، جس کے نتیجے میں متضاد حقائق یکجا ہو گئے اور تمام دلائل آپس میں گڈمڈ ہو کر اپنی ہی تردید کا سامان بن گئے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق میں یہ سقم اپنی جگہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اردو کے آغاز و ارتقاؑ جیسے اہم مسئلے پر لسانیاتی نقطۂ نظر اختیار کیا۔ اس حوالے سے ان کا یہ استدلال کہ اردو کی ابتداؑ اور ارتقاؑ کا مطالعہ کرنے کے لئے نواح دہلی کی بولیوں کا لسانیاتی جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی تاریخ میں، بہت اہمیت کا حامل ہے۔

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے موضوع پر ان تحقیقی مقالہ " اردو زبان کا ارتقاء" جو 1956ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا، بلاشبہ اس روایت میں ایسا اضافہ تھا، جس کی اس سے پہلے اور بعد میں بھی نظیر نہیں ملتی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یہ تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کے لئے پیش کیا، اور بعد ازاں اس میں تمہیدی حصے کا، جو ہند آریائی زبانوں کی تاریخ پر مشتمل ہے، اضافہ کر کے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ انہوں نے اس مقالے میں اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کا لسانیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اردو کا ہمسایہ زبانوں سے لسانیاتی تقابل کرتے ہوئے اس کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کی ہے۔

گریرسن نے مغربی ہندی کو، جو شور سینی زمرے کی زبان ہے، پانچ بولیوں میں تقسیم کیا، 1۔ کھڑی (اردو) یا ہندوستانی 2۔ ہریانی، جاٹو یا بانگڑو، 3۔ برج بھاشا 4۔ قنوجی، 5۔ بندیلی ۔ (123) کھڑی یا ہندوستانی جو میرٹھ اور دلّی کی بول چال کی زبان تھی، ملک کی معیاری زبان کا درجہ حاصل کر کے اردو کہلائی۔ (124) اس کے ماخذ کا کھوج لگانے کے لئے ضروری تھا کہ مذکورہ بالا پانچ زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین کیا جاتا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین کیا ہے اور کھڑی یا ہندوستانی (اردو) کی دس مخصوص لسانی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے۔ یہ سوال اب بھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) کا ماخذ کیا ہے کیوں کہ مذکورہ پانچ زبانوں کی لسانی خصوصیات کے تقابل اور ہند آریائی زبانوں کے تاریخی جائزے کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ " اردو کی صرفی و نحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا ماخذ شور سینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں۔" (125) اور شور سینی زمرے کی زبان " مغربی ہندی جسے کھڑی اور برج کا سرچشمہ اور ماخذ بتایا جاتا ہے، ایک طرح سے فرضی اور خیالی زبان ہے۔" (126) تو اردو کا ماخذ کون سی اپ بھرنش

ضروری ہے۔ اس لئے کہ " قدیم ہند آریائی زبان کا ڈھانچا اور اس کا کینڈا اگرچہ ایک تھا لیکن اس کے روپ ایک سے زیادہ تھے۔ زبان کے یہ روپ بول چال میں مستعمل تھے۔ ہند و پاکستان کی موجودہ بولیاں قدیم زبان کے ان مختلف اور متنوع روپوں سے اجاگر ہوئیں۔" (127) یہ امر واضح ہو جانے کے بعد کہ برصغیر کی جدید ہند آریائی زبانیں قدیم ہند آریائی زبانوں کے مختلف روپوں کی نئی شکل ہیں، ڈاکٹر شوکت سبزواری نے زبانوں کے ماخذ کا کھوج لگانے کے اس اصول کے پیش نظر کہ " کسی زبان کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، ضروری ہے کہ اس زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے صرفی و نحوی اصول اور صوتی تبدیلیوں کی ارتقائی و تقابلی تاریخ پر نظر رہے۔" (128)، اپنے مقالے میں اردو کی ارتقائی تاریخ کا کھوج لگایا ہے اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ

> " اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ " اردو" اور " پالی " دونوں کا منبع ایک ہے۔ " پالی " ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجہ کو پا کر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی۔" (129)

اس دعوی کی وضاحت پالی اور اردو کی مشترک لسانی خصوصیات کی نشان دہی کر کے کی گئی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ درج بالا اقتباس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو اور پالی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں، ادبی روپ پالی ہے اور بول چال کا روپ اردو، اور یہ

...ں نہیں ہیں جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس سے پہلے اردو اور پالی کو دو الگ الگ زبانیں قرار دیتے رہے ہیں لیکن اس اقتباس میں دونوں کو ایک زبان قرار دینے کے بعد انہیں دو زبانوں کی حیثیت میں مشترک الماخذ بھی قرار دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا اصل لسانیاتی کارنامہ، جس کی مثال کم از کم " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں نظر نہیں آتی، اس کتاب کا دوسرا حصہ " تحقیقی مقالہ " کے عنوان سے ہے، جس میں اردو زبان کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اس کے تدریجی ارتقا کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس ذیل میں صوتی تبدیلیوں، اخذ و اشتقاق کی صورتوں، اسماء مانعہ و اسماء مطلقہ اور افعال و مشتقات میں تغیرات کے مباحث پر سیر حاصل تحقیق کی گئی ہے۔

ہر زبان کا صوتی نظام ہوتا ہے، یہ صوتی نظام زبان کی مخصوص آوازوں اور ان کے باہمی رشتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو کی آوازوں کی بھی ایک تاریخ ہے۔ زبان کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لینے کے لئے ان آوازوں کی تاریخ معلوم کرنا ضروری ہے۔ لفظ منطقی آوازوں کا مجموعہ ہیں۔ ان آوازوں میں رد و بدل سے لفظوں کی شکل میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں اگر لفظ کے معنی بدل جائیں تو یہ معنوی یا صرفی تغیر کہلاتا ہے اور اگر لفظ کی شکل بدلنے سے معنی میں تبدیلی نہ آئے تو یہ تبدیلی صوتی تغیر کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو زبان کی آوازوں میں تغیرات کا جائزہ لیتے ہوئے حرکات و علل کی تبدیلیوں کی تیرہ اقسام سے، حروف صحیح میں تبدیلیوں کی پندرہ اقسام سے اور حروف مخلوط کی تین اقسام سے بحث کی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے تبدیلیوں کے مختلف ادوار کا تقابل کیا ہے، جس سے اردو زبان کی آوازوں کے ارتقا کی نشان دہی ہوتی ہے لیکن یہ ارتقا کی مکمل تاریخ نہیں ہے کیوں کہ ابھی بہت سی درمیانی کڑیاں مفقود ہیں۔" اس لئے جب تک کوئی واضح لسانی شہادت نہ ہو ہم ان متشابہ آوازوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی اصل قرار نہیں دے سکتے۔ " (130)

پہلو بہ پہلو رکھا دیا جائے، اردو میں بھی اخذ و اشتقاق کی یہی صورت ہے۔ لفظوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، اصولی اور تعمیری، اس طرح اشتقاق کی دو قسمیں ہیں، ترکیب و تالیف۔ تالیف الفاظ کی ذیل میں اردو میں سابقوں اور لاحقوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں سابقے، لاحقے کئی قسم کے ہیں، سنسکرت سے ماخوذ سابقے لاحقے دو قسم کے ہیں، تدبھو اور تت سم، ان میں سے چونکہ تدبھو سابقے، لاحقے اپنی تاریخ رکھتے ہیں، اس لئے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اردو میں عربی، فارسی سابقے، لاحقے بھی ہیں، اس لئے ان کی نشاندھی بھی کر دی گئی ہے۔ ترکیب الفاظ کی ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ اردو مرکبات کی دو قسمیں ہیں۔ تت سم اور تدبھو۔ یہ سنسکرت اور فارسی، عربی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں تدبھو مرکبات کی اہمیت کے پیش نظر، ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اسماء ماضیہ وہ ہے جو کسی خاص معنی کے لئے وضع ہوئے اور صرف انہی معنوں میں بولے جاتے ہیں، مولوی عبدالحق نے انہیں لوازم اسم کہا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اسماء ماضیہ کی ذیل میں جنس، عدد، اعرابی حالت اور صلات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اردو میں جنس کی دو صورتیں ہیں لیکن تذکیر و تانیث کی اس زبان میں بہت اہمیت ہے۔ قدیم ہند آریائی زبانوں میں عدد کی تین قسمیں تھیں لیکن اب عدد کی صرف دو قسمیں ہیں، واحد اور جمع ۔ اردو میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے، سنسکرت میں اسم کی اعرابی حالتیں آٹھ تھیں، جو جدید ہند آریائی زبانوں میں بھی موجود ہیں، لیکن سنسکرت کی اعرابی حالتیں تالیفی ہیں اور جدید زبانوں کی تحلیلی، یہی صورت اردو کی ہے، اردو میں اعرابی حالتوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اعرابی لاحقے اور صلے میں فرق کرتے ہوئے اردو میں صلات کی صورتوں پر بحث کی ہے۔

اسماء مطلقہ یا الفاظ عامہ وہ اسماء ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہیں اور جو ہر نوع کے اسماء کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ان کی سات قسمیں ہیں۔ ضمیریں، اسم اشارہ، اسم

موصول ، کنایات، ظروف، حروف استفہام، اسمأ اعداد ، ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کی ہے۔ ضمیروں میں تذکیر و تانیث کا فرق پراکرت عہد تک تھا۔ لیکن اردو میں یہ فرق اب مٹ چکا ہے۔ اردو کے ارتقأ کے سلسلے میں اسمأ اعداد کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی ارتقائی تاریخ اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہےکہ اردو شور سینی پراکرت کی بیٹی نہیں ہےبلکہ اردو کے اسمأ اعداد پالی یا درمیانی عہد کی پراکرتوں کی طرح کسی دوسری عام زبان کی یادگار ہیں، چٹرجی نے اس زبان کو قدیم عہد کی ہندوستانی کہا ہے۔ (132) یہ امر ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اس نظریے کی توثیق کرتا ہے کہ " اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔" اور " اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے۔" (133) ڈاکٹر شوکت سبزواری نےاسمأ اعداد کی مختلف قسموں سے بحث کرتے ہوئے ان کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کی ہے۔

افعال و مشتقات کی ذیل میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بتاتے ہیں کہ سنسکرت میں فعل کی تین قسمیں، واحد ، تثنیہ اور جمع ، تھیں اور ان کے لحاظ سے فعل کے الگ الگ تین روپ ہوتے تھے۔ مگر پراکرت کے اولین عہد میں تثنیہ غائب ہو گیا لیکن اردو میں اسی کمی کے ساتھ جنس کے اعتبار سے فعل میں مذکر کا صیغہ مونث سے الگ ہو گیا ۔ اردو میں مادے پراکرت دور سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور کچھ بعد میں گھڑ لئے گئے ہیں۔ ان کی تین قسمیں ہیں۔ تت سم، تدبھو اور دیسی ۔ (134) ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان اقسام اور ان کے مشتقات کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کی ہے۔ اس ذیل میں درج ذیل مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے، 1۔ اصلی یا اولی مادے 2۔ وضعی یا ثانوی مادے، 3۔ مصدر اور حاصل مصدر، 4۔ تعدیہ، 5۔ فعل معاون، 6۔ مشتقات الفاظ ،7۔ معروف و مجہول، 8۔ افعال کا استعمال، 9۔ صورتیں، 10۔ افعال کی گردان ۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقأ کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریے سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں

(1) " ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی شور سینی سے اردو کا نکاس نہیں مانتے، وہ اس کی جگہ اردو کو پالی کی بیٹی سمجھتے ہیں، پر یہ بات بھی ٹھیک نہیں۔"

(2) " وہ کہتے ہیں کہ " ھو " فعل معاون ایک مستقل اور آزاد مادہ ہے جو پہلوی میں بھی تھا اور پالی میں بھی۔ اردو میں اس کا وجود بتاتا ہے کہ اردو اور پالی مشترک الماخذ ہیں۔"

(3) " وہ کہتے ہیں کہ " تھا " اردھ ماگدھی " ھو تھا " سے نکلا ہے اور اردھ ماگدھی ڈاکٹر سکسینہ کی سمجھ سے پالی سے بہت ملتی ہے اس لئے اردو پالی سے نکلی ہے"(135)

ان بیانات میں سے پہلا بیان ڈاکٹر سہیل بخاری کا اپنا ہے، دوسرا ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب " اردو زبان کا ارتقاء" صفحہ نمبر 88 سے اقتباس ہے اور تیسرے کا پہلا حصہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر 88-89 سے ماخوذ ہے اور آخری حصہ " اس لئے اردو پالی سے نکلی ہے" ڈاکٹر سہیل بخاری کا اضافہ ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پالی اور اردو کو مشترک الماخذ کہا ہے اردو کو پالی کی بیٹی نہیں کہا، لیکن ڈاکٹر سہیل بخاری نے ان کے اس نقطہ نظر کو خلط ملط کر دیا ہے۔ " تھا " کی بحث میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ڈاکٹر سکسینہ کے حوالے سے اردھ ماگدھی کی پالی سے مشابہت کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن یہ نہیں کہا کہ اردو پالی سے نکلی ہے۔ (136) یہ امر ناقابل فہم ہے کہ جب ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ بیان، ڈاکٹر سہیل بخاری کی نظر میں تھا کہ " اردو اور پالی مشترک الماخذ ہیں۔" جس کا حوالہ خود انہوں نے " ھو " کے ماخذ کی بحث میں دیا ہے، تو ڈاکٹر شوکت سبزواری سے یہ دعوی کیوں منسوب کیا کہ اردو پالی کی بیٹی ہے۔ دو مشترک الماخذ زبانیں بہنیں تو ہو سکتی ہیں ماں بیٹی نہیں ہو سکتیں اور یہ امر ڈاکٹر سہیل بخاری کے علم میں ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر گیان چند نے بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات پر تنقید کی ہے۔ وہ ان

کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں کہ کھڑی بولی اس اپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو دلّی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ " لیکن اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ " اردو یا ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے۔" (137) اگر پہلے بیان کو درست تسلیم کیا جائے تو دوسرا بیان بھی درست ثابت ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اردو یا کھڑی بولی اپ بھرنش سے ماخوذ ہے۔ اپ بھرنش کا سلسلہ پراکرتوں سے ملتا ہے، جنھیں قدیم ویدک بولیوں ہی کی ایک شکل کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اختلاف کے لئے طرز استدلال بھی وہی ہونا چاہیے جو ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اختیار کیا ہے، انہوں نے جس طرح اردو کے صرفی و نحوی سرمائے میں تبدیلیوں اور صوتی تغیرات سے بحث کر کے اردو کے ارتقاء کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے اختلاف کے لئے بھی اتنی ہی دقت نظر سے زبانوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ محض چند ضمنی امور سے اختلاف کر کے کسی بھی نظریے کو یکسر رد نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری سے پہلے گریرسن اور چٹر جی نے اردو (ہندوستانی) کے ماخذ کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا، جن کی بنیاد پر انہوں نے اردو کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے لئے اس کا لسانیاتی جائزہ لیا۔ چٹر جی نے اسماء اعداد کی مماثلتوں کی بنیاد پر قدیم عہد کی زبان سے اردو (ہندوستانی) کے ارتقائی سلسلے کو تسلیم کرتے ہوئے اسے قدیم عہد کی ہندوستانی کہا ہے۔ (138) گریرسن بھی یہ کہہ چکا ہے کہ " ہندوستانی (اردو) سنسکرت سے نہیں بلکہ سنسکرت سے ملتی جلتی کسی دوسری آریائی زبان سے نکلی ہے " اور " ہندوستانی برصغیر کی دوسری آریائی زبانوں کی طرح ایک ایسی قدیم ہندوستانی زبان سے ماخوذ ہے کہ جو ویدوں کی زبان سنسکرت سے مشابہ تھی۔ " (139) ایسے ہی ماہرین لسانیات کے خیالات کی روشنی میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کو اردو کے ماخذ کا سراغ ملا تو انہوں نے اس کے ارتقائی مدارج کا کھوج لگانے کے لئے اردو اور اس کی ہمسایہ زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا یہ کام لسانیاتی طرز استدلال اختیار کرنے اور اردو کا لسانیاتی نقطہ نظر سے تاریخی و تقابلی

مطالعہ کرنے کے حوالے سے " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات " کی روایت میں ایک ایسی روشن مثال ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی ۔ حتیٰ کہ اس موضوع پر ان کی دوسری کتاب " داستان زبان اردو " (1961ء) ، بھی لسانیاتی تحقیق کے اس معیار تک نہیں پہنچتی جو " اردو زبان کا ارتقاء " کا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو چند ضمنی امور سے اختلاف کے باوجود تسلیم کرنا پڑا کہ " اردو زبان کا ارتقاء" میں " جدید لسانیاتی نقطہ نظر سے کام لیا گیا ہے اور اس کے آخری ابواب میں اردو کے اکثر و بیشتر الفاظ کے صوتی و لسانیاتی ارتقاء پر فنی طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے سے آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک نئے زاویہ نگاہ سے اردو کے ارتقاء پر غور کرنے کا امکان سجھائی دیتا ہے اور وہ ہے پالی زبان سے اردو کا تعلق پالی بھی اردو کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور ان دونوں میں ایک ایسی مشابہت نظر آتی ہے جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ " (140)

" اردو زبان کا ارتقاء" کی اشاعت سے اردو دان طبقے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اس میں پالی کو اردو کا ماخذ قرار دیا گیا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ نہ تھی ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو اور پالی کی مماثل لسانی خصوصیات کی بناء پر دونوں زبانوں میں لسانی قرابت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دونوں کا مشترک ماخذ قدیم زمانے کی کسی ویدک بولی کو قرار دیا تھا۔ اور ان کے خیال میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ اس کی طرف دیگر ماہرین لسانیات اشارے کر چکے تھے۔ جس کی تفصیل وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ،

" ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں ، یہ درست نہیں۔ میں وہی کہتا ہوں جو جولس بلاک ، گریرسن ، چٹرجی اور دوسرے آئمہ فن نے کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو جس زبان سے ارتقاء پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی ۔ سنسکرت ، پالی ، شور سینی پراکرت،صفیں اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد

ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ میں نے "داستان" میں اس بول چال کی قدیم پراکرت اور اپ بھرنش کی تشخیص و تعین کی کوشش کی ہے۔ اس لئے عام اہل علم کی روش سے ہٹ کر تاریخی ترتیب بدل کر میں نے اردو کی خصوصیات میں اور ان کی نشان دہی کرتا اور قدیم سے قدیم تر زبانوں میں ان کا کھوج لگاتا اوپر تک چلا گیا ہوں۔" (141)

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اس بیان کے آخری حصے سے یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ انہوں نے "داستان زبان اردو" میں اسی نقطۂ نظر اور لسانیاتی طرز استدلال سے کام لیا ہوگا، جس کا مظہر "اردو زبان کا ارتقاء" ہے۔ لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے، "داستان زبان اردو" اردو زبان کے آغاز کی داستان یا تاریخ ہے، اس کے ارتقاء کی تاریخ "اردو زبان کا ارتقاء" میں دی گئی ہے۔ "داستان زبان اردو" میں اردو کے ارتقاء کے مباحث ضمناً آئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ان کا یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ

"میرا تحقیقی مقالہ "اردو زبان کا ارتقاء" 1956ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو زبان کا نشو نما دکھایا گیا تھا اور اس کے صرفی، نحوی، صوتی سرمائے کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد اس کے آغاز اور ماخذ کے متعلق کچھ مختصر اشارے کئے گئے تھے۔ "داستان زبان اردو" ان مختصر اشارات کی ترجمان ہے۔"

اس بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ "چنانچہ میں نے ضروری سمجھا کہ اول اول اردو کا تاریخی ارتقاء دکھاؤں، اس کے بعد اس کے آغاز کو بحث میں لاؤں۔ "داستان" کا موضوع خاص طور سے اردو کا آغاز ہے۔ اس میں شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے اور ان تمام سوالات کے جواب دئیے گئے ہیں جو اردو کے آغاز ...

میں معاون ہیں۔" اور وہ سوالات یہ ہیں " اردو میں اردو زبان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اردو کا ارتقاء، نشو و نما، مزاج و منہاج، فطرت، سرشت ہنوز تاریکی میں ہے۔ اردو آریائی خاندان کے کس گھرانے سے ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی جدید آریا نسل کی زبانوں اور بولیوں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ اس کے موجودہ خط و خال کب اور کہاں ابھرے؟ کن زبانوں سے اس نے کسب فیض کیا؟ کن منازل سے گزر کر وہ ارتقاء کے اس درجے تک پہنچی؟ ان سوالات کا اردو کے ماخذ اور اس کے آغاز یا ارتقاء سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں، اس کا ماخذ طے نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے آغاز کے بارے میں صحیح، تعصب سے پاک اور علمی بنیادوں پر استوار رائے نہیں دی جا سکتی۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھا، " اردو کے آغاز اور ماخذ کے بارے میں آج تک جو نظریے پیش کئے گئے ہیں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے ---- ان پر میں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے---- اپنی طرف سے میں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔" (142) ان اقتباسات میں " داستان زبان اردو" کے مباحث کا تعین کر دیا گیا ہے۔

" داستان زبان اردو" ایک مقالے کی صورت میں رسالہ " اردو" میں 1958ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں نظرثانی اور دو ابواب کے اضافے کے ساتھ 1961ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

اردو زبان اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس کے مختلف ناموں کی تاریخی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ " اردو قدیم زبان ہے۔ مسلمانوں کی ہند میں آمد سے پہلے بھی وہ دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس کا قدیم نام کیا تھا یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کو اردو مسلمانوں کی آمد کے بعد کہا گیا۔" (143)

اردو کے آغاز، اس کے وطن اور ماخذ کی تحقیق کرنے سے پہلے ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو

کی لسانی خصوصیات کا تعین کرتے ہیں کیوں کہ ہر زبان اپنی مخصوص لسانی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جو اسے مشترک لسانی خصوصیات رکھنے والی ہمسایہ زبانوں اور اس کے خاندان کی زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ کسی زبان کے آغاز کا مسئلہ اس کی مخصوص لسانی خصوصیات کے آغاز کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جب کوئی زبان اپنی الگ لسانی خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہے تو یہی اس کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ ہر زبان اپنی لسانی خصوصیات کے ساتھ ایسی مشترک لسانی خصوصیات کی بھی حامل ہوتی ہے، جو اس کے خاندان کی دیگر زبانوں میں بھی ہوتی ہیں۔ ان مشترک لسانی خصوصیات سے زبانوں کے رشتوں کا تعین ہوتا ہے۔ کسی زبان کی لسانی خصوصیات اس کے لفظی، صوتی، صرفی و نحوی سرمائے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جس میں اس کی اپنی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ اور مشترک خصوصیات بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے تمام تر لسانی سرمائے کو سات اجزاء میں تقسیم کیا ہے، جو دراصل اردو کے اجزائے ترکیبی ہیں، وہ یہ ہیں : 1۔ مفرد الفاظ ، 2۔ مرکب الفاظ، 3۔ بنیادی الفاظ ، 4۔ تعمیری کلمے ، 5۔ حروف ربط ، 6۔ ضمیریں ، 7۔ صرفی نحوی اصول اور قاعدے ، اس حوالے سے اردو کی مخصوص لسانی خصوصیات بارہ ہیں۔

1۔ کا ۔ کی ، 2۔ سے ، 3۔ میں ۔ پر ، 4۔ نا ، 5۔ تا ، 6۔ "را" ، 7۔ گا ، 8۔ س ، 9۔ کو ، 10۔ نے ، 11۔ تک ، 12۔ " ـــوں "

ان میں سے پہلی آٹھ کا تعین چٹر جی نے کیا ہے اور آخری چار کا اضافہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کیا ہے۔ اور اردو کا مخصوص لسانی سرمایہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ (الف) مفرد الفاظ (ب) افعال و حروف (ج) اصول صرف و نحو ـــ اردو کی مخصوص لسانی خصوصیات اس کی ساخت، ڈھانچہ یا کینڈا ہے اور لسانی سرمایہ اس کا گوشت پوست ، جب سے اس کی لسانی خصوصیات نے الگ حیثیت اختیار کی ، اردو نے ایک بولی کا درجہ حاصل کیا۔ ان خصوصیات کا ابھرنا اور نمایاں ہونا اردو کی ابتداء یا اس کا آغاز ہے۔" (144)

اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ "داستان زبان اردو" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے مخلوط زبان کے نظریوں سے بحث نہیں کی اور انہیں

غیر سنجیدہ نظریات کہہ کر رد کر دیا ہے۔ مخلوط زبان کے نظریات کے علاوہ جو بھی نظریات پیش کئے گئے ، انھیں سنجیدہ نظریات قرار دے کر، ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس ذیل میں محمد حسین آزاد ، حافظ محمود شیرانی ، سید سلیمان ندوی ، ڈاکٹر زور، چٹر جی ، ھیورنلے، گریرسن چارلس لائل اور گراھم بیلی کے نظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کا ذکر اس کتاب میں کہیں بھی نہیں آیا۔ جو تعجب کا باعث ہے۔ جب کہ حافظ محمود شیرانی کے نظریے پر ایک علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے، ان تمام مباحث کی ذیل میں اردو، پنجابی اور برج کی لسانی خصوصیات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے جس سے تینوں زبانوں میں مماثلتوں اور اختلاف کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جس سے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں کہ " برج اور اردو کی خصوصیات ـــ اس امر کی گواہ ہیں کہ اردو کا لسانی سرمایہ زیادہ پیچیدہ اور بعض حیثیتوں سے زیادہ قدیم ہے۔ وہ برج سے کسی طرح بھی ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ " (145)

اردو اور پنجابی اپنی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں اور دونوں زبانوں کے لسانی سرمائے کا تقابل یہ ثابت کرتا ہے کہ

" پنجابی اور اردو کے مختلف فیہ سرمایہ میں سے اردو سرمایہ کی قدامت اردو کو پنجابی سے مختلف زبان ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس پر مشترک سرمایہ کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ اردو سے پنجابی میں منتقل ہوا ہے۔ " (146) اس لئے پنجابی کو اردو کی اصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اردو کے مولد و منشا کا مسئلہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسئلے کے ساتھ منسلک ہے اور اس ذیل میں بھی مختلف نقطہ ھائے نظر کا اظہار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ان نظریات کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اردو چوں کہ اس اپ بھرنش سے ترقی پا کر موجودہ روپ میں آئی ہے، جو دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی ، اس لئے اس کا مولد دہلی ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے اردو کے لسانی مزاج سے بحث کرتے ہوئے قدیم زبانوں کے

تحریری نصوص سے لسانی مواد کا تجزیہ کر کے اردو کے موجودہ روپ میں آنے کے زمانے کا تعین کیا ہے، جو ان کے خیال میں گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ (147)

اردو نے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے ہمسایہ زبانوں پر بہت اہم اثرات مرتب کئے، ان سے لسانی سطح پر کچھ لیا اور کچھ دیا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان عناصر کی نشان دہی کی ہے جو اس لین دین کے نتیجے میں اردو اور اس کی ہمسایہ زبانوں میں ملتے ہیں۔ انہوں نے خصوصاً پنجابی پر اردو کے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے خیال میں " اردو (ہندوستانی) دوآبے کی زبان ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ آس پاس کی تمام زبانوں نے اس سے فیض اٹھایا۔ ان میں پنجابی بھی ہے اور راجستھانی و گجراتی بھی۔" (148) اردو میں صرفی و نحوی نشو و نما اپنے فطری انداز میں ارتقاً پاتا رہا اور اردو سادگی پسندی کی طرف مائل رہی کیوں کہ ہر زبان میں تبدیلی کا رخ سادگی اور آسانی کی طرف ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اجمالاً اردو میں ان صوتی، صرفی نحوی عناصر کی نشان دہی کی ہے، جو اردو کے ارتقائی سفر میں پیچیدگی سے سادگی کی منزل تک پہنچے۔ ان کے خیال میں " اردو صرف و نحو کے لحاظ سے مختصر ترین زبان ہے۔" اور " اردو صرف و نحو آج ان تمام غیر ضروری پیچیدگیوں سے پاک ہے جو کبھی اردو کے قدیم ترین دور میں اس سے چمٹی ہوئی تھیں۔" (149)

اردو کے ارتقائی سفر میں ایک ایسا مقام بھی آیا جب یہ اپنے وطن سے نکل کر دکن میں پہنچیں۔ اس طرح اردو شمالی ہندوستان اور دکن میں مختلف ماحول اور سیاسی و سماجی اور لسانی اثرات کے تحت ارتقائی مدارج طے کرتی ہے۔ دکن میں اس نے اپنی اصل سے جدا ہو کر بدیسی زبانوں کے زیر اثر اور شمال میں اپنے وطن میں رہ کر اپنے خاندان کی زبانوں کے زیر اثر مختلف روپ بدلے۔ اس لئے آج دکن کی اردو اور شمالی ہند کی اردو میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان عناصر کی نشان دہی کی ہے جو اردو کے دونوں روپوں میں فرق کو واضح کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے دکنی اردو پر اس کی ہمسایہ زبانوں کے اثرات کی

تحریری نمونوں کا اجمالاً تنقیدی و تحقیقی اور لسانیاتی جائزہ لیا ہے۔ جن کی مختلف محققین نے اردو کے ارتقاً کے مباحث میں مثالیں دی ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں " اردو کا ارتقاً دکھانے کے شوق میں ہمارے اکثر اہل علم، اردو کی شخصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور اردو کی معاصر زبانوں کے نمونے اردو کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔" (150) جیسے برج، اودھی اور راجستھانی اردو کی ہمسایہ زبانیں ہیں۔ اردو اور ان زبانوں میں لسانی مشابہتیں بھی ہیں لیکن یہ اردو سے الگ زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان زبانوں کے قدیم تحریری نمونوں کو اردو کے ارتقاً کے مباحث میں مثال کے طور پر نہیں پیش کرنا چاہیے جب کہ ایسا ہوتا رہا ہے جو مناسب طرز عمل نہیں ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس ذیل میں مختلف مثالوں سے بحث کی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بیانات میں کہیں کہیں تضاد کا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں " اردو زبان کا ارتقاً " کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جہاں وہ اردو اور پالی کو ایک زبان کے دو روپ، بول چال کا روپ اور ادبی روپ، قرار دینے کے بعد کسی مقام پر دونوں زبانوں کو الگ الگ زبانیں بھی قرار دیتے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کو مغربی ہندی کے حوالے سے ان کے بیانات میں تضاد کا اشتباہ پیدا ہوا ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب " اردو کی لسانی تشکیل " میں شامل ایک مضمون " اردو کے آغاز و ارتقاً کے نظریے " میں کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری " داستان زبان اردو " میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ " اردو نے قدیم مغربی ہندی سے ترقی پا کر موجودہ روپ اختیار کیا۔ " لیکن اگلے ہی صفحے پر وہ مغربی ہندی کو خیالی زبان ، ذہنی تجرید یا منطقی اپج قرار دیتے ہیں۔ جس سے فوراً غلط مبحث کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے لیکن در حقیقت پہلے بیان کے بعد انہوں نے مغربی ہندی کی لسانی خصوصیات کا تعین کرنے میں مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے تحریری نمونوں کی عدم دستیابی کا حوالہ دیا ہے۔ اور اس ذیل میں ایک مختصر بحث کے بعد اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ مغربی ہندی ایک فرضی زبان ہے۔ (151) پہلی نظر میں واقعتاً تضاد

کا اشتباہ ہوتا ہے۔ لیکن غائر مطالعے سے یہ اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا اسلوب بہت عمدہ ہے اور انہوں نے لسانیات جیسے خشک اور دقیق موضوع کو اپنے اسلوب کی شگفتگی اور روانی سے دلنشیں بنا دیا ہے لیکن ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کے لاینحل مسائل نے ان کے مباحث میں بھی الجھاؤ اور ابہام پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی یہ رائے ایک حد تک درست ہی ہے کہ " ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو اور کھڑی بولی کے متعلق جو باتیں کی ہیں ان میں کچھ وزن ہے، لیکن اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی اور ہندوستانی وغیرہ سے متعلق ان کی بہت سی باتیں کافی گنجلک اور مبہم ہیں اور ان میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔" (152)

" اردو لسانیات " (1966ء) ڈاکٹر شوکت سبزواری کے لسانیات کے موضوع پر مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں سے پانچ مقالات " تاریخی و تقابلی لسانیات " کے مباحث کی ذیل میں آتے ہیں۔ پہلے تین مقالات " اردو کی اصل اور ابتداء "، " اردو زبان کا ارتقاء "، اور " اردو کی ساخت اور سرشت " تین توسیعی خطبات ہیں، جو پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں دیئے گئے تھے۔ اور باقی دو مقالات " ترادفی مرکبات " اور " دخیل الفاظ " ہیں۔ ان مقالات کا موضوع اردو کا آغاز و ارتقاء ہے، لیکن یہاں اس موضوع اور اس کے متعلقات پر سرسری بحث کی گئی ہے۔ درحقیقت ان مقالات کا مقصد مذکورہ موضوع کا تعارفی جائزہ پیش کرنا ہی ہے۔ یہ موضوعات " اردو زبان کا ارتقاء " اور " داستان زبان اردو " میں تفصیل سے زیر بحث آ چکے ہیں۔ البتہ " اردو کی ساخت اور سرشت " میں اردو کے صوتی سرمائے پر صوتیاتی نقطۂ نظر سے اجمالاً بحث کی گئی ہے لیکن اس کا تنقیدی جائزہ اور اردو صوتیات کی ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے لسانی مطالعے کی ذیل میں پہلی بار لسانیاتی مناہج اختیار کئے ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے میں لسانیاتی طرز استدلال کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اردو کے آغاز کی جستجو کرتے ہوئے اس کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کی ہے اس

مثال پیش کی ہے اس لئے اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں ان کا مقام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشا کے بارے میں مختلف ماہرین لسانیات کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف تو رہا لیکن اس امر پر سب متفق رہے کہ اردو ایک آریائی زبان ہے اور اس کا تعلق برصغیر کی جدید ہند آریائی زبانوں سے ہے ۔ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا نام اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشا کے مسائل کا مطالعہ مروّجہ اور تسلیم شدہ نظریات سے یکسر ہٹ کر ایک مختلف زاویہ نگاہ سے کیا۔ ان کے خیال میں شمالی ہند کی زبانیں دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اردو بھی اپنی ہمسایہ زبانوں کی طرح دراوڑی زبان ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ برصغیر کے ماہرین لسانیات مغربی لسانیات کی تقلید میں غلط نظریات کے زیر اثر رہے جب کہ خود انہوں نے مغربی ماہرین لسانیات کے سحر سے آزاد ہو کر ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس طرح اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ آج بھی ہندوستان میں وہی زبانیں بولی جا رہی ہیں جو آریاؤں کے ہندوستان میں آمد کے وقت بولی جاتی تھیں کیوں کہ ہندوستانی زبانوں کی ساخت یا کینڈا (ڈھانچہ) ہندوستانی ہے۔ اس لئے انہیں ہندوستانی یا دراوڑی کہنا چاہیے۔ (153) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہےکہ آریا جو زبانیں بولتے ہوئے آئے تھے ان کا کیا ہوا تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آریاؤں کی زبانوں کے ساتھ وہی ہوا جو ہر بدیسی زبان کے ساتھ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کی عربی فارسی کے ساتھ ہوا اور جو انگریزوں کی انگریزی کے ساتھ ہوا، آریاؤں کی زبانیں بھی مقامی زبانوں کے ساتھ گھل مل کر ختم ہو گئیں۔(154) یہاں انہوں نے ہندوستانی (دراوڑی) زبانوں کی ان خصوصیات کی نشان دہی کی ہے جو آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو ہمیشہ ہندوستانی یا دراوڑی زبان ہے جو جنم جنم سے اس دیس میں بولی جا رہی ہے۔ (155)

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشا کے بارے میں پیش کئے گئے تمام نظریات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان تمام دلائل کو رد کرتے ہیں، جو ڈاکٹر شوکت سبزواری محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، نصیرالدین ہاشمی اور سیّد سلیمان ندوی نے پیش کئے ان کے خیال میں اردو زبان کے مختلف ناموں نے لوگوں کو دھوکے دئیے ہیں، اس لئے وہ اردو کے ناموں پر ایک طویل بحث کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کا قدیم نام "کھڑی بولی" ہے جس سے اس کے دیس کا بھی کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ہر بولی کا ایک دیس ہوتا ہے جس کے نام پر اس زبان کا نام رکھا جاتا ہے اور جب تک اس دیس کا کھوج نہ لگایا جائے اس کے ماخذ کا سراغ نہیں مل سکتا۔ (156) اردو کے مختلف ناموں میں سے چار نام ہندی، ہندوی، دھلوی اور ہندوستانی ایسے ہیں جو کسی نہ کسی علاقے سے نسبت ظاہر کرتے ہیں اور ان علاقوں کے نام کے ساتھ "ی" کا لاحقہ لگا کر زبان کے نام کو ظاہر کیا گیا ہے، اسی طرح "کھڑی کا نام بھی انہیں چاروں سے ملتا ہے جس کا پچھ لگوا (ی) اس کے دیس "کھڑ" سے اپنا ناتا دکھلا رہا ہے اور کھڑ کا بول کھنڈ یا کھونڈ کا چھوٹا روپ ہے۔ یوں کھڑی بولی کا مطلب ہوا کھڑ ۔ کھنڈ یا کھونڈ کی بولی (کھنڈی ۔ کھونڈی) اور کھنڈ یا کھونڈ اڑیسا (بھارت) کے پچھم کا دیس کہلاتا ہے۔ اس دیس میں آج جو بولی بولی جا رہی ہے اسے بھی کھڑی یا کھڑیا کہتے ہیں۔ اردو میں آوازوں کی بدلائی کے جو اصول ملتے ہیں ان سے کھونڈ اور گونڈ ایک ہی بول کے دو روپ ہیں۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کھونڈ دیس کو گونڈ پانا یا گونڈوانا بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی ایک بہت ہی پرانی جات گونڈ کا دیس ہے اور اس کی بولی آج بھی کھڑی بولی کہلاتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہی اردو کی اصلی جنم بھوم ہے جس میں وہ ہزاروں برس سے بولی جا رہی ہے اس لئے اردو کو اس دیس میں ڈھونڈنا چاہیے۔" (157)

اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشا کے مسائل کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کی طویل مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ اردو سمیت برصغیر کی تمام مقامی زبانیں آریاؤں کی آمد سے بھی پہلے ہزاروں سال سے اب تک مسلسل بولی جا رہی ہیں اور اس عرصے میں ان زبانوں کی

آوازیں، اصولوں اور ڈھانچوں میں کوئی فرق یا تبدیلی نہیں آئی ۔ البتہ ان کا رسم الخط بدلتا رہا ہے ۔ اردو بھی ہندوستان کی ان قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے جو پہلے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی ۔ جس کی وجہ سے یہ دھوکا ہوا کہ اردو مسلمانوں کی آمد کے بعد پیدا ہوئی. زبان کسی دوسری زبان سے پیدا نہیں ہوتی ۔ ہر زبان اپنی موجودہ اور اصلی روپ میں ہمیشہ سے بولی جاتی رہی ہے۔ یہی حال اردو کا ہے جو پشاچی ، شور سینی ، ماگدھی یا اردھ ماگدھی گروہ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اردو مہاراشٹری جتھے کی دراوڑی زبان ہے جو زمانۂ قدیم میں دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح گھڑی گئی اور تب سے اب تک مسلسل اپنے جنم بھوم " کھنڈیس" میں بولی جا رہی ہے۔ جس پر اس کا نام کھنڈی یا کھڑی رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے ان نظریات سے اختلاف کی خاصی گنجائش ہے۔ وہ شمالی ہند کی جدید ہند آریائی زبانوں کو دراوڑی زبانیں قرار دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی تاریخی شہادت یا لسانی شہادت پیش نہیں کرتے، انہوں نے زبانوں کے ان دونوں گروہوں کا تاریخی و تقابلی جائزہ بھی نہیں لیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کی بنیاد محض یہ امر ہے کہ آریا جو زبانیں بولتے ہوئے ہندوستان میں آئے وہ یہاں کی مقامی زبانوں کے ساتھ گھل مل گئیں اور اپنا وجود ان میں گم کر دیا کیوں کہ ہندوستان میں ہر حملہ آور قوم کی زبان کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اس ذیل میں وہ مسلمانوں اور انگریزوں کی فارسی اور انگریزی کی مثال دیتے ہیں لیکن یہ فراموش کر دیتے ہیں آریا بڑے بڑے گروہوں کی صورت میں یہاں آ کر مستقل سکونت پذیر ہو گئے تھے جب کہ انگریز اور مسلمان ٹولیوں کی صورت میں آئے اور ان کا اپنے مستقر سے مسلسل تعلق قائم رہا۔ اگر ڈاکٹر سہیل بخاری کا درج بالا استدلال درست ہے تو یہ دراوڑوں پر بھی صادق آتا ہے جو آریاؤں سے چند ہزار سال پہلے حملہ آوروں کی صورت میں آئے تھے اور اپنی دراوڑی زبانیں بولتے رہے اور اس وقت کی مقامی زبانیں کول اور منڈا زبانیں اختیار نہیں کیں۔

اردو کے وطن کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اسے کھنڈیس کی بولی قرار دیا ہے۔

یہ کھونڈ دیس کہاں ہے؟ ڈاکٹر سہیل بخاری اسے اڑیسہ (بھارت) کے پچھم کا دیس قرار دیتے ہیں جب کہ جغرافیائی حوالوں سے یہ غلط ہے کیوں کہ اڑیسہ مشرقی بھارت میں واقع ہے اور وہاں ہند آریائی زبان " اڑیہ " بولی جا رہی ہے اور اس کے پچھم میں " بستر " ریاست تھی جہاں اب بھی " چھتیس گڑھی " بولی جاتی ہے۔ اڑیسہ کے مغرب میں تقریباً* تین سو میل کے فاصلے پر بھائی پردیش کا مشرقی حصہ جو سی۔ پی۔ سے منسلک ہے، خاندیش کہلاتا ہے۔ سی۔ پی۔ کا ایک شہر " کھنڈوا " ہے جو اڑیسہ کے مغرب میں سینکڑوں میل دور واقع ہے لیکن یہ علاقہ خاندیش نہیں کہلاتا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کھونڈ دیس کو " گونڈیانا " یا " گونڈوانا " بھی کہتے ہیں۔ گونڈوانا ایک ریاست یا مملکت کا نام رہا ہے، جو جغرافیے میں شمالی سی۔ پی۔ میں ہے۔ اس علاقے کی آخری حکمراں رانی درگاوتی کا دارالخلافہ " گڑھ منڈلا " جبل پور سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ گونڈوانا میں دراوڑوں کی ایک شاخ " گونڈ " کے لوگوں کا گروہ بھی آباد ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر سہیل بخاری کی یہ بات سچ ہے کہ گونڈوانا ایک بہت ہی پرانی قوم " گونڈ " کا دیس ہے۔ لیکن یہ لوگ جو کبھی " گونڈی " زبان بولتے تھے اپنی زبان ترک کر کے وہاں کی مروجہ زبان اردو یا ہندی/ اختیار کر چکے ہیں، جو ان لوگوں کی گونڈی زبان سے بالکل مختلف زبان ہے۔ گونڈی زبان اب بھی بولی جاتی ہے لیکن یہ صرف چند گھروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور وہاں کی عام زبان کی حیثیت نہیں رکھتی البتہ اس کے نمونوں سے گونڈی اور اردو یا ہندی کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے گونڈوانا کا جغرافیائی تعین کرتے ہوئے اسے اڑیسہ (بھارت) کے پچھم کا دیس قرار دے کر ٹھوکر کھائی ہے۔ گونڈوانا ریاست کا علاقہ اڑیسہ سے شمال مغرب کی جانب واقع تھا۔ یہ ریاست اکبر کے زمانے میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ (158) ان حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا استدلال بعض اشکال پوچ ہی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو میں آریائی اور دراوڑی عناصر کی نشان دہی کی ہے لیکن

کی لسانی خصوصیات کا تعین کر کے اردو اور دراوڑی زبانوں کے مماثل عناصر کا لسانی تجزیہ و تقابل کرنا چاہیے تھا۔ ان کی نسبت پروفیسر خلیل صدیقی نے " زبان کیا ہے؟ " (1989ء) (صفحہ 279 تا 280) میں لسانیاتی زاویۂ نگاہ سے آریائی اور دراوڑی زبانوں میں مماثل عناصر کی نشان دہی کر کے ان کا لسانیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ لیکن انہوں نے یا دیگر ماہرین لسانیات نے ، جن میں چٹر جی ، گنڈرٹ، کاڈویل ، آر۔ شرٹ، پشل اور کسٹل شامل ہیں(تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی ۔) اور جنھوں نے دراوڑی زبانوں اور ان کے آریائی زبانوں پر اثرات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے وجود کی نفی کر کے سارے خطے کی تمام زبانوں کو دراوڑی قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے کیا ہے، البتہ برصغیر کی دراوڑی اور ہند آریائی زبانوں پر لسانیاتی تحقیق کرنے والے ماہرین لسانیات زبانوں کے دونوں گروہوں پر ایک دوسرے کے اثرات کی نشان دہی ضرور کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا دعویٰ ہے کہ وہ مغربی ماہرین لسانیات کے مقلد نہیں ہیں لیکن اس معاملے میں ان کا دعویٰ کاملاً درست نہیں ہے کیوں کہ دراوڑی زبانوں پر آریائی زبانوں کے اثرات کو وہ تسلیم کرتے ہیں، لیکن دنیا کے تمام ماہرین لسانیات کے نظریات کے برعکس وہ ہند آریائی زبانوں کو بھی دراوڑی قرار دیتے ہیں جس کا لسانیاتی استدلال بھی نہیں دیتے تو ان کے نظریات کو ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے لفظوں میں محض " ایجادبندہ " ہی کہا جائے گا۔ ان کے خیال میں " اس قسم کے مفروضات و نظریات کو کسی علمی بحث کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ انہیں محض " ایجادبندہ " ہی کہا جا سکتاہے۔" (159)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی دوسری کتاب " اردو کی کہانی " (1975ء) میں انہی نظریات کو دہرایا ہے۔ ہند آریائی زبانوں کو دراوڑی قرار دیتے ہوئے وہ اردو کو بھی دراوڑی زبان کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندو پاک کی تمام بولیاں ٹھیٹھ ہندوستانی یعنی دراوڑی ہیں اور اردو بھی انہی میں شامل ہے۔ یہ کوئی نئی زبان نہیں ہے بلکہ آریاؤں کی آمد سے بھی پہلے کی زبان ہے اور تب سے آج تک مسلسل بولی جا رہی ہے۔ اس لئے اسے جدید ہند آریائی میں شمار کرنے والے غلطی پر ہیں۔ (160) اردو کے جنم بھوم کے بارے میں بھی وہ اپنے اسی خیال کو

دھراتے ھیں۔ جس کا اظہار " اردو کا روپ " میں کیا ھے۔ البتہ اب " کھڑ دیس" کے محل وقوع میں ذرا سی تبدیلی کر لی ھے۔ ان کے خیال میں اردو کا جنم بھوم کھڑ دیس یا کھنڈ دیس ھے۔ اس حصے میں " کھڑیا " نام کی ایک زبان بولی جا رہی ھے، جو اردو ھو سکتی ھے۔ اردو ھندوستان کے مہاراشٹری گھرانے کی بولی ھے اور سی ۔ پی کے مشرقی (پوربی) حصّے میں بولی جاتی ھے جو مشرق (پورب) میں اڑیسا، شمال (اتر) میں چھتیس گڑھ اور جنوب (دکن) میں تلنگانے سے گھرا ھوا ھے۔ (161) " اردو کا روپ " میں انہوں نے کہا کہ اڑیسہ (بھارت) کے مغرب میں کھنڈ دیس واقع ھے۔ اب کہتے ھیں کہ اردو کے وطن کھنڈ دیس کے مشرق میں اڑیسا ھے۔ اردو کو مہاراشٹری گھرانے کی بولی قرار دیتے ھیں، جو سی ۔ پی کے مشرقی حصے میں بولی جاتی ھے، جب کہ مہاراشٹر کا جنوبی سی ۔ پی یعنی ناگ پور، برار، ریاست حیدرآباد کے مغربی حصے اور بمبئی پریذیڈنسی میں گجرات اور کاٹھیاوار کا علاقہ چھوڑ کر باقی علاقوں پر مشتمل ھے۔ یہ علاقہ ڈاکٹر سہیل بخاری کی بیان کردہ سمت کی مخالف سمت میں واقع ھے۔ مہاراشٹر کے علاقے میں مراٹھی زبان بولی جاتی ھے۔ جس علاقے کی نشان دھی ڈاکٹر سہیل بخاری نے کی ھے وہ علاقہ " بستر سٹیٹ" پر مشتمل تھا اور وھاں کی زبان " چھتیس گڑھی " ھے۔ اس کے علاوہ مرھٹی یا تلگو وھاں نہیں بولی جاتیں۔ جس " کھڑیا " بولی کا ذکر ڈاکٹر سہیل بخاری نے کیا ھے، وہ اس علاقے میں تو کیا پورے برصغیر میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ (162) رھا کھڑی بولی کی قدامت کا مسئلہ تو گیان چند اس ذیل میں لکھتے ھیں کہ "کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ان کا قیاس اس لئے بے بنیاد ھے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ، للو لال اور سدل مسر نے اسے یہ نام دیا۔ ان کے ذھن میں نہ کھڑ دیس ھو گا نہ وھاں کی کھڑیا بولی۔ اردو کو اس سے ماخوذ کرنا اور بھی دور ازکار ھے۔" (163)

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کے اس مفروضہ وطن سے اردو کی ھجرت اور ھندوستان بھر میں اس کے سفر یا در بدری کی ایک ھوش ربا داستان بیان کرتے ھیں۔ اردو مذھبی مبلغوں، بھکشوؤں، پنڈتوں کے ساتھ شمالی ھندوستان پہنچی اور آگرے میں سکونت اختیار کر لی ۔ وھاں

اکبری راج میں سارے پہو،پس میں پھیل گئی۔ شاہ جہاں کے ساتھ دہلی پہنچی اور وہاں سے مغلوں کے ساتھ سارے ہندوستان میں پھیل کر مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہوئی مختلف بولیوں کی شکل اختیار کر لی۔ (164) اردو کی تاریخ اور ارتقاء کی یہ داستان، اردو کے اس مفروضہ وطن کی تائید کرتی ہے، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہوا، اور ان کے خود ساختہ نظریات کی آئینہ دار ہے، جن کی اردو کی تاریخی و تقابلی لسانیات میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے " اردو کی کہانی " میں ان مباحث کے بعد سنسکرت اور ویدک زبانوں کے تحریری نصوص میں اردو الفاظ کی موجودگی کی نشان دہی بھی کی ہے، کیوں کہ ان کے خیال میں رگ وید میں جن شاعروں کے بھجن ملتے ہیں، ان میں سے کچھ شاعر اردو بھی جانتے تھے اس لئے ان کے بھجنوں میں اردو کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ (165)

واضح ہو کہ اردو سے مراد موجودہ اردو ہی ہے کیوں کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کے خیال میں اردو آریاؤں کی آمد سے بھی پہلے سے ہندوستان میں مسلسل بولی جا رہی ہے۔ اور یہ اس وقت سے اسی شکل میں بولی جا رہی ہے، جس شکل میں آج بولی جاتی ہے۔ ان کے اس بے سروپا خیال کو ڈاکٹر گیان چند نے " لسانی مالیخولیا " قرار دیا ہے۔

> " رگ وید میں ایسے بھی شاعر ہیں جو اردو بول سکتے تھے۔ قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ ایسے لسانی مالیخولیا سے ان کی طبیعت منغض کی۔ " (166)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے سنسکرت اور ویدک زبانوں کے تحریری نمونوں سے جن الفاظ کی طویل فہرست دی ہے، ان سے اردو کے ارتقاء پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ کیوں کہ ان کا نہ تو لسانی تجزیہ کیا گیا ہے اور نہ ہی تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ الفاظ سب ہی ہندآریائی زبانوں میں عموماً ملتے ہیں۔ انہیں صرف اردو کے الفاظ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی یہ تمام تحقیقی کاوش حقائق کی تلاش کے بجائے قیاس آرائیوں اور بے تکے مفروضات میں

الجھ کر رہ گئی ہے اور سعئی لاحاصل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر ڈاکٹر گیان چند کی یہ رائے صائب ہے کہ

" زبان متفرق الفاظ کا نام نہیں بلکہ صرفی و نحوی اصولوں کے مطابق فقروں اور جملوں کی ساخت کا ہے۔ کیا رگ وید یا سنسکرت، پالی، پراکرت، اپ بھرنش میں اردو یا کھڑی بولی کا ایک بھی جملہ ملتا ہے۔ کھوکھلے بلند بانگ دعووں سے اردو کے ناواقف قارئین کو مرعوب کرنا مقصد ہو تو دوسری بات ہے۔" (167)

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کے بارے میں ایسے بلند بانگ دعوےٰ کرتے ہی رہے اور " اردو کا روپ " (1971ء) سے لے کر " اردو کی کہانی " (1975ء) اور ایک طویل مضمون " اردو زبان کا ارتقا " تک، جو 1988ء میں ادب لطیف ۔ سالنامہ کے شمارہ نمبر 11، 12 جلد 54 میں شائع ہوا، اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ۔ البتہ یہ مضمون، ان کی کتابوں کے برعکس، ہندی آمیز مصنوعی اردو کے بجائے، عام اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ مضمون کا عنوان زبانوں کے بارے میں ان کے خیالات سے متصادم ہے کیوں کہ وہ زبانوں میں ارتقا کے تصور کو مغربی ماہرین لسانیات کی سمجھ کا پھیر سمجھتے ہیں، جس کا اظہار اس مضمون میں بھی کیا ہے۔ ان کے خیال میں دنیا کی تمام زبانیں، اپنے آغاز کے پہلے دن سے آج تک اپنی اصل صورت ہی میں مسلسل بولی جا رہی ہیں۔ (168) اس مضمون میں انہوں نے اردو کے وطن کے جغرافیائی محل وقوع میں ایک بار پھر تبدیلی کی ہے۔ اب ان کے خیال میں " کھڑی بولی علاقہ کھڑ کی بولی ہے اور کھڑ غالباً اڑیسا کے جنوب میں سمندر کے قریب واقع ایک کٹا پھٹا علاقہ ہے کیوں کہ کھڑ کے متبادل الفاظ کھنڈ اور کاٹ ہیں اسی علاقے میں جارج گریرسن کے قول کے مطابق کھڑیا اور کٹیالی نامی دو ملتی جلتی سی زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ جن کا ہلکا سا خاکہ اس نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں دیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بھی لس کھڑی بولی کی جنم بھوم ہے۔" (169)

ڈاکٹر سہیل بخاری کے ان تصورات گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

عین الحق فریدکوٹی اردو اور پنجابی کو دراوڑی زبان قرار دے کر دونوں زبانوں کے مماثل ذخیرہ الفاظ کی بنیاد پر پنجابی کو اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے میر امن سے حافظ محمود شیرانی تک، اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں پیش کئے گئے تمام نظریات کو رد کر دیا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں ان تمام حضرات نے اردو کے سرمایۂ الفاظ کے مختلف عناصر، اس کی صرف و نحو اور صوتی پہلوؤں کا مطالعہ کئے بغیر غلط نظریات قائم کر لئے۔ (176) لیکن خود انہوں نے اردو اور پنجابی کی لسانی خصوصیات کو جانچے، پرکھے بغیر یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اردو پنجابی سے مشتق ہے۔ (177) اور اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی ۔

" جب ہم اردو زبان کے لغوی سرمائے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی ۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادیٔ سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلۂ نسب پنجابی اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادیٔ سندھ میں مروّج تھی ۔ " (178)

اردو اور پنجابی کے لسانی رشتوں اور اس کے ارتقائی سلسلے کے بارے میں یہ فیصلہ اگر کسی لسانی مطالعے یا تقابلی جائزے کے بعد دیا گیا ہے تو اس کی جھلک تک، اس اقتباس سے پہلے نظر نہیں آتی ۔ البتہ مذکورہ بیان کے بعد اردو زبان کی تاریخ کی تحقیق کے ایک عظیم منصوبے کے پسندیدہ موضوعات کی فہرست ضرور دی ہے اور اس ارادے کا اظہار کیا ہے کہ بشرط زندگی یہ منصوبہ مکمل کیا جائے گا۔ (179) ان موضوعات میں سے چند ایک پر سرسری مباحث اس کتاب

میں شامل ہیں۔ اس کتاب کے ساتویں باب میں پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں اضافی اور مفعولی علامتوں کے اشتراک پر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں باہمی صوتی اور گرامری مطابقت نیز سرمایۂ الفاظ کا گہرا اشتراک موجود ہے۔ (180) اس سے پہلے وہ پنجابی کو اردو کی اصل اور دونوں زبانوں کی دراوڑی زبانیں قرار دے چکے ہیں لیکن اس کتاب کے آٹھویں باب میں انہوں نے سنسکرت اور پراکرتوں پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اردو کو آریائی زبان ثابت کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ وہ سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی کو ہند آریائی گروہ کی زبانیں قرار دیتے ہیں۔ (181) اور اردو، سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی کے مشترک سرمایہ الفاظ کی مختصر فہرست دینے کے بعد لکھتے ہیں۔ "یہ لفظی اشتراک ان زبانوں کے ہم اصل ہونے کا واضح ثبوت ہے۔" (182) اس جیسے تضادات ان کی کتاب کے بیشتر حصوں میں نظر آتے ہیں، جن کی طرف ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے، کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔(183) در حقیقت اس کتاب کے مختلف ابواب عین الحق فریدکوٹی کے متفرقہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ یہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے "اردو نامہ" اور صحیفہ میں شائع ہو چکے تھے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1- لسانیات کی تاریخ ۔ روزنامہ "امروز" استقلال نمبر، 15 اگست 1954ء (کتاب کا پہلا باب)

2- زبان کے میکانکی پہلو ۔ اردو نامہ۔ شمارہ 11، جنوری تا مارچ 1963ء (کتاب کا دوسرا باب)

3- وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات ۔ اردو نامہ ۔ شمارہ 6، اکتوبر تا دسمبر 1961ء (کتاب کا دوسرا باب)

(یہ مضمون پنجابی زبان میں "پنجابی دیاں جڑاں" کے عنوان سے "پنجابی ادب" میں شائع ہوا ۔ تاریخ نامعلوم)

4- پنجابی زبان اور دراوڑی زبانوں میں اضافی اور مفعولی علامتوں کا اشتراک ۔ صحیفہ، شمارہ 44، جولائی 1968ء (کتاب کا ساتواں باب)

5- سنسکرت اور پراکرتیں ۔ اردو نامہ ۔ شمارہ 35، جنوری 1970ء (کتاب کا آٹھواں باب)

مضمون کتاب میں شامل نہیں ہے۔)

6۔ وادیٔ سندھ اور ترکی و تاتاری زبانیں ۔ اردو نامہ ۔ شمارہ 15، جنوری تا مارچ 1964ء
(کتاب کا نواں باب)

" پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں اضافی اور مفعولی علامتوں کا اشتراک " کی اشاعت کے بعد " دراوڑی زبانوں کی اضافی اور مفعولی علامتیں " کے عنوان سے پروفیسر خلیل صدیقی کا مقالہ دو قسطوں میں، صحیفہ کے شمارہ نمبر 51، اپریل 1970ء اور شمارہ نمبر 52، جولائی 1970ء میں شائع ہوا۔ جس میں عین الحق فریدکوٹی کی معروضات پر کڑی تنقید کی گئی اور لسانیاتی دلائل سے کام لے کر ان کی غلطیوں کی نشان دھی کی گئی۔ " سنسکرت اور پراکرتیں " کے اشاعت کے بعد اسی عنوان سے پروفیسر خلیل صدیقی کا مقالہ " اردو نامہ " شمارہ 31، اپریل تا جون 1968ء میں اور سیّد قدرت نقوی کا مضمون " سنسکرت اور پراکرتیں " اردو نامہ ۔ شمارہ 30، جنوری 1968ء میں شائع ہوئے، جن میں عین الحق فریدکوٹی کے مضمون پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مضمون نگاروں نے عین الحق فریدکوٹی کے استدلال کے کمزور پہلوؤں کی نشان دھی کی۔ " سنسکرت اور پراکرتیں " کے عنوان سے ھی عین الحق فریدکوٹی کے دوسرے مضمون کی (جو کتاب میں شامل ھے) اشاعت کے بعد پروفیسر خلیل صدیقی کا مقالہ اسی عنوان سے اردو نامہ کے شمارہ 39، مئی 1971ء میں شائع ہوا۔ جس میں فاضل مقالہ نگار نے لسانیاتی استدلال سے کام لے کر عین الحق فریدکوٹی کے تصورات کو باطل قرار دیا۔

ھند آریائی زبانوں پر دراوڑی زبانوں کے اثرات کی نشان دھی درج ذیل مغربی لسانیات کر چکے تھے۔

آر۔ کالڈویل۔
(A Comparative Grammer of the Dravidian - Madras, 1961.)

جارج شرٹ
(Traces of a Dravidian Elements in Sindhi - The Indian Antiquary, Vol.VII - 1878.)

آر۔ پشل ۔
(Comparative Grammer of the Prakrat Languages, Translated from the German by Subhadra, Dehli, 1957.)

جی۔ بلاک (The Gramatical of Dravadian Language, Poona, 1954.)

این۔ کینڈل۔ (On the Dravidian Element in Sanskrit Dictionaries - London. Indian Antiquary, Aug; 1872.)

یہ مختصر ترین فہرست ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ماہرین لسانیات ہیں، جنہوں نے برصغیر کی آریائی اور دراوڑی زبانوں کا سال ہا سال کے براہ راست مطالعے کے بعد، زبانوں کے دونوں گروہوں پر ایک دوسرے کے اثرات کا جائزہ لے کر مماثل عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن کسی نے بھی دراوڑی زبانوں کے مقابلے پر ہند آریائی زبانوں کے وجود کی نفی نہیں کی۔ عین الحق فریدکوٹی اور ڈاکٹر سہیل بخاری ان مغربی ماہرین لسانیات کے تحقیقی کارناموں کا بہ نظر غائر مطالعہ کر کے دراوڑی اور آریائی مماثل عناصر کی نشان دہی کر دیتے تو کسی حد تک لسانیاتی تحقیق کا حق ادا ہو جاتا، لیکن انہوں نے تو محض ذخیرۂ الفاظ کی فہرست دی اور ان کی غلط توجیہہ کی۔ عین الحق فریدکوٹی یہ تو کہتے ہیں کہ " مشرقی محققین اکثر مغرب کی کاسہ لیسی ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ " (184) لیکن خود انہوں نے بھی مغربی ماہرین لسانیات سے ہی خوشہ چینی کی ہے۔ انکی کتاب میں دی گئی تمام تر مثالیں اسی خوشہ چینی کا ثبوت ہیں، انہوں نے دراوڑی زبانوں اور آریائی زبانوں کا براہ راست مطالعہ تو نہیں کیا۔ یہ مغربی لسانیات سے استفادہ ہی تو ہے۔ بلکہ یہ ادھورا استفادہ ہے۔ ان معنوں میں کہ وہ اپنی کتاب میں دی گئی مثالوں میں سے اکثر کی صحیح توجیہہ ہی نہیں کر سکے۔ انہیں مغرب کی اس کاسہ لیسی میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، کیوں کہ وہ لسانیات ایسے دقیق علم کی تفہیم ہی نہیں کر سکے اور اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔

" اردو زبان کی قدیم تاریخ " میں عین الحق فریدکوٹی نے اردو کے آغاز و ارتقأ اور مولد و منشا کے مسائل پر بہت ہی کم توجہ دی ہے اور لسانیات کے دیگر موضوعات پر زیادہ اظہار خیال کیا ہے، اگر ان مباحث کو بھی مرکزی موضوع کی طرف سمیٹ لیا جاتا تو شاید بہتر نتائج

[illegible] یہ کتاب جو اپنے موضوع سے ہٹ کر منتشر خیالات کا مرقع بن گئی ہے، اردو کے

آغاز و ارتقا کے مسائل کا احاطہ نہیں کر سکی ۔ اس کا احساس مصنف کو بھی ہے۔ اس لئے انہوں نے اردو کی تاریخ کے موضوع پر الگ سے تحقیق کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے (جس کی نشان دھی گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے) ۔ عین الحق فریدکوٹی کی اس تحقیقی کاوش " اردو زبان کی قدیم تاریخ " کا لسانیاتی زاویہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے تو " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں اس کی حیثیت محض " قیاس آرائیوں " سے زیادہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک مقالے، اردو کے نام اور آغاز کے نظریے" میں، جو "لسانی مطالعے" (1973ء) میں شامل ہے، اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں پیش کئے گئے، نظریات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں انہوں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی اردو اور اس کی ہمسایہ زبانوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ بلکہ اس ذیل میں مختلف نظریات کا دقت نظر سے تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کر کے اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں اور کھڑی بولی اردو کا قدیم روپ ہے، اس لئے اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے، 1 ۔ کھڑی بولی کا آغاز ، 2 ۔ کھڑی بولی کے اردو روپ دھارنے کا زمانہ ۔ کھڑی بولی گیارھویں بارھویں صدی میں اس اپ بھرنش سے ابھری جو دلی، میرٹھ اور مرادآباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی ۔ اس اپ بھرنش کا نام ہنوز نا معلوم ہے کیوں کہ اردو رسم الخط میں اس کے نمونے نہیں ملتے، دیوناگری کھڑی بولی سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ کھڑی بولی میں عربی ، فارسی الفاظ کے شامل ہونے سے اردو کا روپ متشکل ہوا، اور یہ عمل ابتدا میں مدھیہ دیش یعنی دلی اور مغربی یو۔پی میں ہوا ہو گا ۔(185)

ڈاکٹر گیان چند کی علمی و ادبی حیثیت مسلمہ ہے وہ لسانیات کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں، اس مضمون میں انہوں نے اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں پیش کئے گئے نظریات کا لسانیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لے کر صائب رائے کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی کتاب " اردو کی لسانی تشکیل " (1985ء) ان کے تحقیقی

مقالات پر مشتمل ہے، جن میں سے چار مقالات تاریخی و تقابلی لسانیات کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ " اردو کے آغاز و ارتقاء کے نظریے" میں انہوں نے ان نظریات کا جو " اردو کے آغاز اور وطن " کے حوالے سے پیش کئے جا چکے ہیں، تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے اور لسانیاتی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ ان کے خیال میں اردو کو " مخلوط زبان " قرار دینا محض قیاس آرائی ہے۔ اردو نہ تو پچن زبان ہے اور نہ ہی کری اول، بلکہ اس کا بنیادی ڈھانچہ اسی قدیم زبان پر قائم ہے، جو اس کی اصل و اساس ہے۔ اس لئے اردو کو کھچڑی زبان سمجھنا ایک گمراہ کن نظریہ ہے لیکن اردو کی پیدائش کا مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرانا اس سے بھی زیادہ گمراہ کن تصور ہے کیوں کہ اردو کی پیدائش کے اصل ذمے دار ہندو ہیں نہ کہ مسلمان۔ (186)
مسلمانوں نے ہندوستان میں فاتحین کی حیثیت سے سکونت اختیار کر لینے کے کافی عرصے کے بعد یہاں ہندوؤں میں بولی جانے والی عام بول چال کی زبان اختیار کر لی اور اپنی زبانیں رفتہ رفتہ ترک کرتے گئے۔ یہی زبان مسلمان صوفیوں نے بھی سیکھی اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا، البتہ مسلمانوں کی زبانوں کے اثرات سے یہ زبان جو اب اردو کہلاتی ہے، مزید نکھر گئی اور تیزی سے ارتقائی مدارج طے کرنے لگی۔ (187)

" اردو کا ادبی و لسانی ارتقاء " (شمالی ہند میں) میں، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے خیال میں اردو کی اصل شور سینی اپ بھرنش ہے، جو مدھیہ دیش میں بولی جاتی تھی۔ اپ بھرنش سے جدید ہند آریائی زبانوں کے ابھار کا زمانہ ہی اردو کے ابھار کا زمانہ ہے، لیکن اردو کا باقاعدہ ارتقاء 1193ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اردو کو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ منسوب کرنا غلط ہے کیوں کہ اردو کا ابھار مسلمانوں کے دہلی میں آمد (1193ء) سے تقریباً دو سو سال قبل یعنی 1000ء کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ البتہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔ (188) اردو کے ابتدائی دور یعنی اس کے ابھار کے زمانے (1000ء تا

کا ڈھانچہ " اوبھنش " کی بنیادوں پر قائم ہے، جو اپ بھرنشں دور آخر کی یادگار ہے۔ اردو کو اپ بھرنشں سے ماخوذ قرار دینے کے بعد انہوں نے اپ بھرنشں اور اردو کی آوازوں اور قواعدی شکلوں میں مماثل عناصر کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ان آوازوں اور قواعدی شکلوں کی نشان دہی بھی کی ہے، جو اس دور میں اردو زبان میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ چوں کہ زبان کی لسانی خصوصیات کا تعین اس زبان کے لسانی سرمایے کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے " پیش اردو " کے لسانی سرمایے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جو (1) بدھ سدّھوں، ناتھوں، جینوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب مذہبی تخلیقات، (2) ہیم چندر کے پیش کردہ اپ بھرنشں کے دور آخر کے نمونے (3) ڈنگل اور پنگل میں شاعری کے نمونے اور (4) مسعود سلمان کی شاعری کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ (189) اس لسانی سرمائے کی مدد سے انہوں نے اس دور کی چند لسانی خصوصیات کا تعین کیا ہے جو بعد کی اردو میں ارتقاء پذیر ہوئیں، (1) اسماء صفات اور افعال / آ / پر ختم ہوتے ہیں، (2) زمانۂ حال بنانے کے لئے مادے کے ساتھ لاحقہ " ت " کا استعمال کیا جاتا ہے، (3) ماضی مطلق بنانے کے لئے مادے کے ساتھ یا، یا، ئیا، کا استعمال کیا جاتا ہے۔ (4) اردو ضمائر میں ہم، تم، مجھ، تجھ، وہ (وہ) میرا، میرے، آپ، اپنے، جو، ان وغیرہ کا ارتقاء 1000ء تا 1200ء کے دوران عمل میں آ چکا تھا۔ (5) کا، کی، کے حروف کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ (190)

اردو کا باقاعدہ آغاز بارھویں صدی کے آخر (1193ء) میں ہوا، جب مسلمان فاتحین دہلی پہنچے۔ ان کے ساتھ مختلف زبانیں بولنے والوں کی کثیر تعداد تھی۔ ان کی زبانوں اور نواح دہلی کی چار بولیوں، ہریانی، کھڑی، برج اور میواتی، کے اثرات " پیش اردو " پر مرتب ہوئے نیز اس زبان میں فطری تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور وہ ابتداً ہندوی، ہندی ریختہ اور بعد میں اردو کہلائی۔ (191) یہاں سے یہ زبان مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی، دکن اور شمالی ہند میں 1200ء تا 1700ء کے دور کی زبان کو " قدیم اردو " کہا جا سکتا ہے۔ (192) دکن میں قدیم اردو کے تحریری نمونے ملتے ہیں لیکن شمالی ہند میں

قدیم اردو کے تحریری نمونے نہیں ملتے، خصوصاً چودھویں، پندرھویں اور سولہویں صدی کے دور کے قدیم اردو کے تحریری نمونے ناپید ہیں، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے 1200ء تا 1700ء کے دور کے ادبی و لسانی سرمایے کا تعین کیا ہے۔ (1) صوفیائے کرام کے ملفوظات، (2) کتب تواریخ اور دیگر فارسی کتابوں میں اردو کے نمونے (3) امیر خسرو کی شاعری (4) نام دیو، کبیر اور گرو نانک کے کلام میں اردو کے نمونے (5) مستقل تصانیف جن میں بکٹ کہانی، عاشور نامہ، وفات نامہ بی بی (فاطمہ)، مثنوی معجزہ انار، کتب شتک، خالق باری، قصیدہ در لغات ہندی، فقہ ہندی شامل ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس لسانی سرمایے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ مغلوں کا زوال شروع ہوا تو فارسی کا چلن بھی ختم ہونے لگا اور اردو بول چال کی زبان سے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس دور کے ادبی نمونوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ تاریخ زبان اردو کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ (193) اس صدی کے ختم ہونے تک شمالی ہند میں ایک صاف ستھری، ادبی اور ٹکسالی زبان ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ (194) ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس دور کے شعراء کے کلام کی لسانی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے۔ اس دور کو انھوں نے اردو کے ارتقاء کا عبوری دور قرار دیا ہے اور انیسویں صدی کے آغاز کو اردو کے جدید دور کا آغاز قرار دے کر فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو جدید دور کا اولین نقش قرار دیا ہے۔ (195)

"قدیم اردو اور ہریانی" میں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو پر ہریانی کے اثرات کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں اردو اپنے ارتقاء کے اولین دور میں نواح دہلی کی بولیوں، ہریانی، کھڑی، برج اور میواتی سے متاثر ہوئی ہے۔ ان میں سے ہریانی نے اردو کو اس کے ابتدائی عہد میں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ (196) اردو پر ہریانی کے اثرات کو دیگر ماہرین لسانیات نے بھی تسلیم کیا ہے، جس کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے قدیم اردو اور قدیم ہریانی کے ساتھ ساتھ جدید ہریانی کے لسانی سرمائے کا

تقابلی مطالعہ کر کے دونوں زبانوں کی مماثل لسانی خصوصیات کا تعین کیا ہے۔ جس سے دونوں زبانوں کے لسانی تعلق کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے جس کے مطابق وہ اردو کا ماخذ کھڑی بولی کے بجائے ہریانی کو قرار دیتے ہیں۔ (197) اس حوالے سے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، ڈاکٹر گیان چند سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خ کی تائید کرتے ہیں۔ اختلاف اور تائید کی اس بحث میں الجھ کر وہ اردو پر ہریانی کے اثرات کے حوالے سے دونوں زبانوں کے لسانی تعلق کو ماں بیٹی کے رشتے میں بدل دیتے ہیں۔

" دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کے باریک اختلافات کی نشان دہی اور ان کے لسانیاتی تجزیے کے بعد ہم ہریانی کو اردو کا نقطہ آغاز ماننے پر مجبور ہیں۔ " (198)

جب کہ اس مضمون کے آغاز میں اردو پر ہریانی کے لسانی اثرات کی بات کرتے ہیں،

" اردو کو اس کے ابتدائی عہد میں سب سے زیادہ ہریانی نے متاثر کیا ہے۔ "(199

" قدیم اردو کا سرمایہ الفاظ " میں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو میں سنسکرت، دیسی دراوڑی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے دخیل الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔ سنسکرت، تت سم اور تدبھو، دونوں قسم کے الفاظ اردو میں ملتے ہیں اور دیسی بھی، دیسی سے مراد ان غیر آریائی زبانوں کے الفاظ ہیں جو دراوڑی زبانوں یا آسٹرک زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عربی، فارسی الفاظ اپنی اصل یا بدلی ہوئی صورت میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے سنسکرت تدبھو الفاظ میں صوتیاتی تبدیلیوں کے رجحان کی نشان دہی کی ہے، اس موضوع پر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے " اردو زبان کا ارتقا " میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس مضمون میں ذخیرۂ الفاظ کی محض فہرستیں دی ہیں، ان الفاظ کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اردو کے ارتقا کا جائزہ نہیں لیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے مذکورہ بالا چار مضامین میں پہلے دو، زیادہ قدرو قیمت

کے حامل ہیں کیوں کہ ان میں شامل مباحث سے اردو کے لسانی مطالعے کی ذیل میں اردو کے آغاز اور وطن کے حوالے سے چند نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔ پہلا مضمون " اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے " اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ہے کیوں کہ اس میں اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں پیش کئے گئے تمام نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون اپنے مباحث کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس مضمون میں اردو کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے چند مخفی گوشے منظر عام پر آئے ہیں۔

اردو کے آغاز و ارتقا اور مولد و منشا کے مباحث کی ذیل میں میرامن سے میرزا خلیل بیگ تک اردو کے لسانی مطالعے کے تاریخی و تقابلی رویے کا لسانیاتی نقطۂ نظر سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ میر امن سے اردو کے آغاز اور وطن کے حوالے سے قیاس آرائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ محمد حسین آزاد کے نیم لسانیاتی نقطۂ نظر کے سامنے آنے سے رکا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ محمد حسین آزاد کے بعد حافظ محمود شیرانی نے پہلی بار لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو کا مطالعہ کیا اور پنجابی سے اس کے لسانی رشتوں کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے، جنھوں نے یورپ میں ماہرین لسانیات کی زیر نگرانی لسانیات کے موضوعات پر تحقیقی کام کیا تھا، اردو کے لسانیاتی مطالعے کی ایک جھلک پیش کی۔ اور اردو کے آغاز و وطن کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کے نظریات کی تائید کی۔ حافظ محمود شیرانی کے نظریات کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ دوبارہ چل نکلا، لیکن اب طرز استدلال تحقیقی تو تھا لسانیاتی ہرگز نہ تھا۔ اب بھی ان قیاس آرائیوں کی بنیاد مخلوط زبان کا پرانا تصور ہی تھا لیکن اردو کے وطن کے حوالے سے اختلافات پیدا ہوتے رہے۔ چوں کہ حافظ شیرانی نے اردو کا وطن پنجاب کو قرار دیا تھا۔ اس لئے برصغیر کے مختلف علاقوں کے علما نے یہ اعزاز اپنے علاقے کو دینے کے لئے قیاسات کا طومار باندھ دیا اور اس کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔ اس دوران ڈاکٹر مسعود [illegible] سنجیدگی سے اس مسئلے پر توجہ دی اور لسانیاتی استدلال اختیار کر کے اردو کے

آغاز اور وطن کے مسائل پر تحقیق کا صحیح رخ متعین کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس کوشش میں اخلاص تو ہے لیکن لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کے یہاں سقم رہ گئے۔ انہوں نے اردو کے قدیم روپ کی تشکیل کی تاکہ اس کے آغاز و ارتقاء کا کھوج لگایا جا سکے۔ اس حوالے سے ان کا مقام و مرتبہ مسلمہ حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ہم عصر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس روایت میں پہلی بار اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد منشاء کے مسائل کے مطالعے کے لئے لسانیاتی مناہج اختیار کئے اور اردو کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کی۔ اس لئے اردو کے لسانی مطالعے کی ذیل میں ان کا تحقیقی کام ایک ایسی حیثیت کا حامل ہے، جس کی نظیر، اس روایت میں اب تک نہیں ہے۔ اردو کے لسانی مطالعے کی ذیل میں قیاس آرائیوں اور بلند بانگ دعووں کا سلسلہ بھی جاری/رہا ہی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فریدکوٹی نے نئے پن اور انوکھے پن کی جستجو میں اردو کو دراوڑی زبان قرار دیا لیکن مسلّمات کو رد کرنے کے لئے ان کے یہاں لسانیاتی استدلال کہیں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ اس لئے ان کے نظریات کی حیثیت مفروضات اور قیاسات سے زیادہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر گیان چند ایک صاحب نظر محقق ہیں، انہوں نے اردو کے آغاز اور وطن کے نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر صائب رائے کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو کے مطالعے کے لئے لسانیاتی مناہج اختیار کر کے اس روایت میں ایک اچھی مثال قائم کی ہے اس ذیل میں ان کے جستہ جستہ مضامین ان کے لسانیاتی شعور کا بہترین مظہر ہیں۔

اردو کی وجہ تسمیہ اور مختلف نام

زبانیں عموماً قوم یا علاقے کی نسبت سے موسوم ہوتی ہیں لیکن اردو کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کا نام کسی قوم یا علاقے سے نسبت نہیں رکھتا ہے۔ ہماری زبان کے نام " اردو " کی وجہ سے اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے نظریات میں خلط مبحث پیدا ہوا ہے کیوں کہ " اردو " سے لشکر یا چھاؤنی کے معنی مراد لئے گئے ۔ اس لئے اردو، لشکر کی زبان قرار پائی اور اردو کے آغاز کو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ منسلک کر کے دھلی کو اردو کا وطن قرار دیا گیا۔ اس بنیاد پر جہاں جہاں مسلمانوں کی سب سے پہلے آمد کا ثبوت ملا، اس علاقے کو اردو کا وطن اور ان کی آمد کے زمانے کو اردو کا آغاز قرار دیا گیا۔ قیاس آرائیوں کا ختم نہ ہونے والا یہ سلسلہ چلتا ہی رہا ۔ اردو کی وجہ تسمیہ اور اس کے مختلف ناموں کی تحقیق کا مسئلہ اگرچہ ہمارے موضوع " اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات " کے مباحث میں شامل نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع " اردو کی وجہ تسمیہ اور مختلف نام " کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اردو کے آغاز کے بعد اسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ مختلف ادوار میں اردو کے مروّجہ ناموں کی نشان دہی حکیم شمس اللہ قادری (اردوئے قدیم) اور سیّد سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی) نے کی ہے اور اس ذیل میں، حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اردو) ڈاکٹر شوکت سبزواری (داستان زبان اردو) ، ڈاکٹر سہیل بخاری (اردو کا روپ) ، اور ڈاکٹر گیان چند (لسانی مطالعے) نے تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اردو کو ہندی، ہندوی، زبان ہندوستان، ہندستانی یا ہندوستانی ، ریختہ، گجری، دکنی کے نام دئیے گئے ہیں۔ انگریزوں نے اسے ہندوستانی کے علاوہ مورس کا نام بھی دیا۔ ہندو اھل علم نے اسے کھڑی بولی کہا۔ اسے زبان اردوئے معلیٰ، اردو کی زبان اور زبان اردو کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا رہا

ہے لیکن اس زبان کے نام " اردو " کو ایسا قبول عام نصیب ہوا کہ باقی سب نام کتابوں میں رہ گئے اور " اردو " کا چلن اب تک ہے۔

تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی رائج رہا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے بقول " اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے جو حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی 902 ھ کے رسالہ " خوش نغز " میں ملتی ہے۔ " (200) اس کی تائید ڈاکٹر چیٹر جی کے اس بیان سے ہوتی ہے " اردو کا نام ہندی (قدیم تر ہندوی) ہندوستانی اور اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔ " (201) چوں کہ یہ زبان دہلی میں بولی جاتی تھی اس لئے امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ بہاء الدین باجن نے اردو کو زبان دہلوی کہا۔ (202) حافظ محمود شیرانی کے بیان سے اس امر کی تائید ہوتی ہے " شیخ باجن متوفی 912 ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "(203) اردو کا نام ہندوستانی بھی مروّج رہا ہے۔ تاریخی حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے یہ نام انگریزوں نے دیا۔ ڈاکٹر گریرسن اس کے استعمال کی قدیم ترین تاریخ مسٹر یول (ULE) کے حوالے سے 1616ء بتاتے ہیں۔ (204) مسلمانوں نے اس کا استعمال شاہ جہاں کے عہد سے شروع کیا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامے میں اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ (205) ملّا وجہی سب رس (1634ء) میں اردو کو زبان ہندوستان لکھتے ہیں۔ (206) جب اردو مسلمانوں کے ساتھ جنوبی ہندوستان پہنچتی ہے تو وہاں گجرات میں " گجری " اور دکن میں " دکنی " کہلاتی ہے۔ دکن اور گجرات کے شعراء اور اہل قلم نے جنوبی ہند کی اردو اور شمالی ہند کی اردو میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے اپنی زبان کو گجری یا دکنی کہا اور شمالی ہند کی اردو کو ہندی یا ہندوستانی ، چناں چہ شاہ برہان الدین جانم کے شعروں میں اس زبان کے لئے گجری (جس سے مراد گجراتی اردو ہے) اور رستمی (1649ء) اور شاہ ملک (1666ء) کے شعروں میں اس زبان کو دکنی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (207) اٹھارویں صدی میں انگریزوں نے اردو کو " مورس " کا نام دیا۔ " سب سے پہلے مشہور مستشرق کول بروک نے اسے " مورس "

(مسلمانوں کی زبان) کہا" (208) اور پھر اٹھارویں صدی میں اس زبان کے لئے انگریزی میں اسی نام کا چلن رہا۔

اردو شعراء نے ، اٹھارویں صدی کے وسط میں اس زبان کو " زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد " کہنا شروع کیا اس کا حوالہ سب سے پہلے میر تقی میر کے یہاں نکات الشعراء (1752ء) میں ملتا ہے۔ (209) رفتہ رفتہ یہ " زبان اردوئے معلیٰ " اور پھر " اردوئے معلیٰ " کہلانے لگی۔ ذکر میر میں " زبان اردوئے معلیٰ " اور قائم کے مخزن نکات (1754ء) میں " اردوئے معلیٰ " کا ذکر آتا ہے۔ (210) زبان اردوئے معلیٰ ، رفتہ رفتہ صرف " زبان اردو " کہلانے لگی یہ نام علی ابراھیم خاں خلیل کے تذکرے گلزار ابراھیم (1198ھ) میں ملتا ہے۔ (211) میرامن نے " باغ و بہار " کے مقدمے میں اردو کے لئے " زبان اردو " کے بجائے " اردو کی زبان " کا نام اختیار کیا ہے۔ " حقیقت اردو کی زبان ، کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔ " (212)

اردو زبان کے لئے " اردو " کے استعمال کی قدیم ترین مثال میر محمد مائل دہلوی کے یہاں ، جو قائم کے شاگرد تھے ، ملتا ہے۔ ان کا دیوان 1176ھ مطابق 1761ء میں مرتب ہوا۔ ان کے دیوان میں اردو زبان کے لئے " اردو " کا استعمال ملتا ہے۔ (213) ان کے بعد مصحفی کے ایک شعر میں اردو زبان کے لئے " اردو " کا ذکر ہے۔

خدا رکھے ، زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق یہ شعر 1195ھ سے پہلے کا ہو سکتا ہے۔ (214) مرزا جان تپش نے اپنے دیوان مرتبہ 85-1784ء میں لکھا ہے " اسی طرح لفظ " اردو " اس زبان کے لئے مختص ہو گیا۔ " (215) حافظ محمود شیرانی کے مطابق مغربی مصنفین میں گلکرائسٹ نے پہلی بار " قواعد زبان ہندوستانی " میں (1796ء) میں اردو کا استعمال کیا۔ (216) انشاء اللہ خاں انشاء ، دریائے لطافت (1807ء) میں اردو کی ابتداء کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے

ہوئے لکھتے ہیں " جس کا نام اردو رکھا۔" (217)

اردو زبان کے لئے ایک نام " ریختہ" بھی مروّج رہا ہے لیکن یہ نام صرف اردو شاعری کی زبان کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا بیان اہم ہے۔

" اردو میں ادب کی ابتداء شعر سے ہوئی اور شعر کی غزل سے ۔ امیر خسرو (1325ء) نے سب سے پہلے فارسی آمیز اردو غزل کہی جس کا نام ریختہ پڑا، پھر اس تعلق سے اس زبان کو ریختہ کہا گیا۔ جو غزل کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔" (218) ریختہ غزل کی زبان تھی جس میں فارسی کی آمیزش ہوتی تھی ۔ اردو کا ایک نام " کھڑی بولی " بھی دیا گیا ہے۔ مغربی مصنفین میں گلکرسٹ نے اردو کو کھڑی کے نام سے یاد کیا۔(219) ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کے اس نام " کھڑی بولی " کو سب سے قدیم قرار دیتے ہیں۔(220) لیکن ڈاکٹر گیان چند جین ان کے استدلال کو رد کرتے ہیں، ان کے خیال میں " کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ان کا قیاس اس لئے بے بنیاد ہے کہ انیسویں صدی کی ابتداء میں گلکرسٹ، للو لال اور سدل مصر نے اسے یہ نام دیا۔" (221) اس ذیل میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا بیان بھی ڈاکٹر گیان چند کی تائید کرتا ہے " ہندو اہل علم نے اسے " کھڑی بولی " کے نام سے یاد کیا، للو جی لال سدل مصر نے 1803ء کے لگ بھگ کھڑی بولی کا نام لیتے ہیں۔" (222) ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کے لئے 1803ء سے پہلے کھڑی بولی کا نام رائج نہیں تھا۔

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک اردو کے لیے مختلف نام مروّج رہے لیکن انیسویں صدی سے اس کے لئے " اردو" کا نام استعمال کیا جانے لگا جس کا چلن تاحال جاری ہے۔ اردو کے معنی لشکر کے ہیں اس لئے ابتداء میں اردو کے آغاز اور وطن کے بارے میں غور و فکر کرنے والوں کو یہ اشتباہ ہوا کہ یہ لشکر کی زبان رہی ہو گی ۔ اردو میں عربی فارسی الفاظ کثرت سے شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے بھی اس قیاس کو تقویت ملی اور اردو کو مسلمان فاتحین کے لشکر سے منسوب کر دیا گیا، مسلمانوں کے لشکر میں مختلف زبانیں بولنے والے سپاہی شامل تھے اس لئے اردو میں مختلف زبانوں کے دخیل الفاظ کی آمیزش سے یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ اردو

"ملواں زبان " ھے۔ اس طرح غیر لسانیاتی نقطہ نظر رکھنے والے اھل علم نے اس زبان کے نام
" اردو " سے جو مفروضہ قائم کیا تھا وہ قیاس آرائیوں کے ایک طویل سلسلے میں بدلتا چلا گیا۔
اور اردو کے آغاز کو مسلمانوں کی ھندوستان میں آمد کے ساتھ منسلک کر دیا گیا، جیسے مسلمانوں
کی آمد سے پہلے یہاں اس زبان کا کوئی وجود ھی نہ تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ منسلک
کرنے، اور زبانوں کے میل جول سے نئی زبان کے وجود میں آنے کے اس مفروضے نے اس تصور کو
ابھارا کہ مسلمان جس علاقے میں سب سے پہلے وارد ھوئے وہی اردو کا وطن ھے اور وہاں کی زبانوں
کی آمیزش سے اردو کا ظہور ھوا ھے۔ یوں دھلی کے بجائے پنجاب کو اردو کا وطن قرار دیا گیا۔
اسی تصور کے زیر اثر سندھ کو، اور اس سے بھی پہلے مسلمان تاجروں کی حیثیت سے جنوبی
ھندوستان کے سواحل مالابار کے علاقوں میں آئے تھے، اس لئے دکن کو اردو کا وطن قرار دیا گیا۔ جب
اردو کے اتنے بہت سے وطن ھو گئے تو قیاس آرائیوں کے اس سلسلے کو مزید طول ملا اور دعویٰ کیا
گیا کہ مسلمانوں کے لشکر دھلی فتح کرنے کے بعد جہاں کہیں بھی پہنچے وہاں کی مقامی زبانوں
سے مسلمانوں کی زبانوں کے میل جول سے، ایک نئی مخلوط زبان اردو وجود میں آتی گئی۔ گویا ہر
علاقے کی مختلف مقامی زبانوں پر عربی فارسی کے اثر سے ایک جیسی یا ملتی جلتی مخلوط زبان
اردو وجود میں آ گئی۔ مسلمانوں نے زبان کا پودا دھلی سے لیا اور اسے ھندوستان کے مختلف
علاقوں میں لگاتے گئے جہاں وہ نشو و نما پا کر چھتنار درخت بنتا گیا۔

اردو کے لغوی معنوں کی توضیح سے، اردو زبان کے آغاز اور وطن کے بارے میں جن
مفروضات اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ھوا وہ مذکورہ بالا لسانی مغالطے تک پہنچ کر بھی
ختم نہ ھوا۔ ان قیاس آرائیوں اور مفروضات کا پس منظر جہاں ان مفروضات کے خالق اھل علم کا
غیر لسانیاتی نقطہ نظر ھے وہاں اس زبان کا نام " اردو " بھی ھے، جو اس زبان کو بولنے
والی قوم یا اس علاقے سے جہاں یہ زبان بولی جا رہی ھے، نسبت نہیں رکھتا، لیکن محض کسی
زبان کے نام کے لغوی معنوں کو بنیاد بنا کر اس کے آغاز و ارتقا اور وطن کا کھوج لگانا اور
قیاسی استدلال کی بنیاد پر مفروضات قائم ایک غیر لسانیاتی طرز عمل ھے، جس کی لسانیات کی

دنیا میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اردو اور دیگر زبانوں میں لسانی روابط کے مباحث کا تاریخی و تقابلی رویّہ

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے مباحث میں، اردو کے دیگر زبانوں سے لسانی روابط کا لسانیاتی جائزہ دو حوالوں سے لیا جاتا رہا ہے۔ ایک اردو کے ماخذ کی تحقیق کے حوالے سے دوسرے اردو کے ارتقاء میں دیگر زبانوں کے اثرات کے حوالے سے، لیکن اردو کے دیگر زبانوں پر اثرات کے حوالے سے لسانی روابط کے مباحث بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو تحقیق ہوئی ہے، ذیل میں اس کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کے۔ ایس ـ بیدی کی تصنیف "تین ہندوستانی زبانیں" (1961ء) اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، جس میں انہوں نے پنجابی، اردو اور ہندی زبانوں کے آغاز و ارتقاء کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد تینوں زبانوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر لسانیاتی نہیں ہے اور انہوں نے زبانوں کے آغاز کے حوالے سے مخلوط زبان کے تصور کو ہی بنیاد بنایا ہے۔ ان کے خیال میں پنجابی، اردو اور ہندی مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد عربی فارسی اور مقامی زبانوں کے میل جول کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ وہ جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز کا زمانہ 900ء سے پہلے قرار دیتے ہیں اور ان کے خیال میں 1000ء تک یہ زبانیں نکھری ہوئی شکل میں رونما ہوئیں۔ (223) پشاچی اپ بھرنش سندھ سے پنجاب تک بولی جا رہی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ کئی شاخوں میں تقسیم ہوئی اس کی دو شاخیں ڈھکی اور کیکئی تھیں، جن میں سے پہلی کی جانشین پنجابی اور دوسری کی لہندا ہے۔ اس طرح یہ دونوں پشاچی اپ بھرنش کی بیٹیاں ہیں۔ (224) یہاں تک ڈاکٹر کے۔ایس بیدی کا نقطۂ نظر ایک حد تک لسانیاتی ہے لیکن موجودہ پنجابی کی ابتداء کی ذیل میں ان کا نقطۂ نظر یکسر غیر لسانیاتی ہو جاتا ہے اور وہ پنجابی کو مخلوط زبان قرار دیتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں محمد بن قاسم کی آمد کے بعد جب مرکزی حیثیت ملتان کو حاصل
ہوئی تو ملتانی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش نے ایک نئی پیدا ہونے والی زبان کی
بنیاد رکھ دی جس کا مرکز ملتان شہر تھا۔ (225) اور عہد غزنوی میں جب مرکزی حیثیت
لاہور کو حاصل ہوئی تو اطراف و جوانب سے لوگ لاہور میں جمع ہونے لگے اس طرح ملتان سے اس
نئی زبان نے اپنے ابتدائی خد و خال کے ساتھ لاہور ہجرت کی اور یہاں نکھری ہوئی شکل میں
نمودار ہوئی۔ جب مسلمان دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو یہ زبان ان کے ساتھ دہلی پہنچی ، اسی
زبان کی ایک شاخ پنجاب میں پرورش پاتی رہی اور مغل عہد میں پنجابی کے نام سے موسوم ہوئی
دوسری شاخ جو دہلی میں نشو و نما حاصل کرتی رہی ، مغل عہد میں اردو کے نام سے موسوم
ہوئی لیکن اردو نام اختیار کرنے سے پہلے بھی زبان مقامی زبانوں اور سنسکرت کے اثرات سے ایک
نئی شکل اختیار کر کے کھڑی بولی کہلائی۔ کھڑی بولی میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی آمیزش
سے جو زبان وجود میں آئی وہ اردو کہلائی۔ اردو فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور کھڑی
بولی نے دیو ناگری رسم الخط اختیار کیا اور ہندی کہلائی۔ (226)

ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی پنجابی ، اردو اور ہندی کے آغاز و ارتقاء کے الگ الگ جائزے
میں مذکورہ بالا خیالات کو ہی دہراتے چلے جاتے ہیں ، جس سے ان کے یہاں تکرار اور بعض
اوقات تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے، مثلاً صفحہ 62 پر انہوں نے پنجابی اور لہندا کو شکی
اور کیکئی کی جانشین اور پشاچی اپ بھرنش کی بیٹیاں قرار دیا ہے اس طرح پنجابی اور لہندا
بہنیں ہوئیں لیکن صفحہ 99 پر وہ ملتانی یا لہندا کو پنجابی کی بیٹی قرار دیتے ہیں۔
انہوں نے تینوں زبانوں کے ارتقاء کا الگ الگ جائزہ لیا ہے لیکن جن تحریری نمونوں کا حوالہ
دیا ہے، ان کا لسانی تجزیہ اور تقابلی جائزہ نہیں لیا جس سے ان زبانوں کے ارتقائی مدارج
کی نشان دہی ہوتی۔ در حقیقت اس ذیل میں انہوں نے جو مباحث پیش کئے ہیں وہ لسانی
ارتقاء کے بجائے ادبی ارتقاء کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ موجودہ ہندی کو " کھڑی بولی
ہندی " لکھتے ہیں۔ (227) جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ 1803ء میں ہندو اہل

علم للو جی لال، صدل مسر نے اردو کو کھڑی بولی کہا (228) انہوں نے پنجابی، اردو اور ھندی کو پشاچی زمرے کی زبانیں قرار دیا ھے، جو صحیح نہیں ھے۔ لیکن چوں کہ انہوں نے ملتان کی زبان میں عربی فارسی کے اثرات سے پہلے ایک مخلوط زبان کا ظہور ثابت کرنا تھا، جس سے پنجابی، اردو اور ھندی زبانیں پھوٹیں، اور ملتان کے علاقے میں بولی جانے والی زبان لہندا پی شاچی زمرے سے تعلق رکھتی ھے اس لئے انہوں نے تینوں زبانوں کو بھی شاچی زمرے کی زبانیں قرار دے دیا جب کہ لہندا پشاچی زمرے کی زبان ھے اور پنجابی، اردو ھندی، شور سینی زمرے کی زبانیں ھیں۔ (229)

پنجابی، اردو اور ھندی کے آغاز و ارتقا پر الگ الگ بحث کرنے کے بعد ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی نے تینوں زبانوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ھے اور ان کے باھمی لسانیاتی رشتوں کے تعین کی کوشش کی ھے لیکن ان مباحث میں بھی ان کا نقطہ نظر غیر لسانیاتی ھی ھے۔ انہوں نے ان تینوں زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین نہیں کیا۔ نہ ھی ان زبانوں کے مشترکہ لسانی سرمایہ کا لسانی تجزیہ اور تقابل کیا ھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان زبانوں کے ایک دوسرے پر اثرات کی نشان دھی بھی نہیں کی ھے۔ ان کا استدلال یہ ھے کہ " تینوں زبانیں ایک ھی زبان سے پیدا ھوئی ھیں۔ اس لئے ان میں بنیادی اور لسانیاتی مشابہت آج بھی پائی جاتی ھے۔ " (230) اگرچہ اب ان کے رنگ و روپ میں فرق نمایاں ھو چکا ھے۔ لیکن بناوٹ بلحاظ کینڈا تینوں زبانیں ایک ھیں۔ (231) جہاں تک تینوں زبانوں میں لسانیاتی مشابہتوں کا معاملہ ھے تواردو اور ھندی کی حد تک یہ دعویٰ درست ھو سکتا ھے لیکن پنجابی اور اردو میں لسانی مشابہتوں اور دونوں کے مشترک ماخذ کے نقطہ نظر کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں (مقدمہ تاریخ زبان اردو) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو زبان کا ارتقا) میں دونوں زبانوں کے تقابلی جائزے کے بعد رد کر چکے ھیں اور اس سلسلے میں ان کا استدلال زیادہ لسانیاتی ھے۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی نے تینوں زبانوں میں لسانیاتی مشابہتوں کی تفصیل مشترک صرفی و نحوی عناصر کی نشان دھی کر کے اور مشترک الفاظ کی فہرست کی صورت میں، جو ان زبانوں نے

عربی ، فارسی ، ترکی ، سنسکرت، مقامی زبانوں ، پرتگالی ، فرانسیسی ، انگریزی زبانوں سے لئے ہیں، دی ہے۔ لیکن ان دخیل الفاظ اور مشترک صرفی و نحوی عناصر کا لسانی تجزیہ اور تقابل کر کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے ان کا استدلال غیر لسانیاتی ہے اور جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت مفروضات یا قیاس آرائیوں سے زیادہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر مہرعبدالحق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ " ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق " لسی عنوان سے کتابی صورت میں 1967ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے ملتانی زبان کے آغاز و ارتقا" اور ضمنی طور پر اردو کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے دونوں زبانوں کا تقابلی جائزہ لے کر اردو اور ملتانی کے قدیم روابط کی نشان دہی کی ہے۔ مقالے کے ابتدائی ابواب میں ہند آریائی زبانوں کی نسبی تقسیم کے مباحث کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں میں پنجابی ،لہندا اور ملتانی کا مقام متعین کیا ہے۔ انہوں نے گریرسن کے " لنگوسٹک سروے آف انڈیا " سے ان تینوں زبانوں کے نمونے لے کر ان کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور ان زبانوں میں مشترک خصوصیات کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ان میں اختلاف کو واضح کیا ہے اور ان نتائج تک پہنچے ہیں کہ 1۔ پنجابی لہندا سے الگ زبان ہے۔ (232) اور 2۔ ملتانی اور لہندا، الگ الگ زبانیں ہیں، ہر چند دونوں میں لسانی اشتراک موجود ہے، لیکن اختلاف اس قدر نمایاں ہے کہ دونوں کو الگ الگ زبانیں قرار دینا پڑتا ہے۔(233) ملتانی کو پنجابی اور لہندا سے الگ زبان ثابت کرنے کے بعد وہ اسے سندھی کی چھوٹی بہن قرار دیتے ہیں۔(234) لیکن ان کے یہ تصورات محل نظر ہیں اور ان میں اس وقت ابہام پیدا ہو جاتا ہے جب وہ ملتانی کو زمانہ قبل از تاریخ سے بھی قدیم زبان قرار دیتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں یہ زبان آریاؤں کی آمد سے بھی پہلے سے ملتان کی سر زمین پر آنے والی قوموں کی زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہوئی اپنی اصلیت پر قائم رہی۔ (235) تو پھر اس زبان کا تعلق زبانوں کے کس خاندان سے ہے، آریائی ، دراوڑی، کول یا منڈا، اس امر کی وضاحت ان صفحات میں نہیں کی گئی۔

ملتانی کو سندھی کی چھوٹی بہن قرار دے کر وہ دونوں زبانوں کو متحد الاصل قرار دیتے

ھیں۔ ان کے خیال میں دونوں زبانیں قدیم زمانے میں ایک تھیں لیکن جب ملتان کی ریاست زیریں سندھ سے الگ ھو گئی تو ملتانی زبان اپنی الگ حیثیت میں ترقی کرنے لگی، اس طرح ملتانی اور سندھی کو علیحدہ ھوئے تقریباً ساڑھے بارہ سو سال ھوئے۔ (236) ایک طرف وہ ملتانی اور سندھی کو بہنیں قرار دیتے ھیں، دوسری طرف زبانوں میں ماں، بیٹی یا بہن کے رشتوں سے انکار کرتے ھیں۔ (237) اور مقالے کے آخری حصے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ھوئے ملتانی کو مخلوط زبان قرار دیتے ھیں۔ " وادیٔ سندھ میں عربی فارسی، بلوچی، ترکی وغیرہ زبانوں کے اختلاط سے جو نئی زبان پیدا ھوئی وہ یہی زبان تھی جسے آج ھم ملتانی کہتے ھیں۔"(238) اس طرح ان کے خیالات میں تضاد کا اشتباہ پیدا ھوتا ھے۔

ملتانی زبان پر ھمسایہ زبانوں کے اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر مہر عبدالحق نے عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کے ساتھ پنجابی، لہندا، پشتو، اور بلوچی کے اثرات کی نشان دھی بھی کی ھے اور ملتانی زبان میں ان زبانوں کے دخیل الفاظ کی فہرست دی ھے۔ ملتانی زبان کے لسانی سرمائے کی نشان دھی کرتے ھوئے ملتانی زبان کے قدیم ادب سے جدید ادب تک کے نمونے دئیے گئے ھیں لیکن ان نمونوں کا لسانی تجزیہ کر کے ملتانی زبان کے ارتقاء کی نشان دھی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اسی مقالے میں ملتانی زبان کے قواعد بھی ترتیب دئیے ھیں اور اس ذیل میں ایک وضاحت بھی کر دی ھے کہ چوں کہ ملتانی ایک بے میل قسم کی زبان ھے اور مختلف زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی ھے اس لئے اس کی قواعد میں ان زبانوں کے عناصر بھی موجود ھیں، اس کے ساتھ ھی انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ھے کہ قواعد کی ترتیب کی ذیل میں مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کو پیش نظر رکھا ھے۔ (239)

ملتانی زبان کی حیثیت اور اصلیت کا تعین کرنے کے بعد ڈاکٹر مہر عبدالحق ملتانی اور اردو کے روابط کی جستجو کرتے ھیں، ان کے خیال میں اردو اور ملتانی کا پہلا تعلق یہ ھے کہ دونوں ایک ھی جیسے حالات کے زیر اثر وجود میں آئیں یعنی جیسے مسلمانوں کے ھندوستان میں آمد سے اردو وجود میں آئی ویسے ھی سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے ملتانی وجود میں

آئی ۔ (240) اور ملتانی سے اردو کا دوسرا تعلق یہ ہے کہ اردو کا ذخیرۂ الفاظ جن چشموں کا مرہون احسان ہے۔ ملتانی زبان کا ذخیرۂ الفاظ بھی انہی چشموں سے فیض یاب ہوا ہے۔"(241)

اردو کا ملتانی سے تیسرا تعلق یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے اصول و قواعد میں اشتراک ہے۔ دونوں زبانوں کے اصول و قواعد کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے، اس تقابل کی بنیاد حافظ محمود شیرانی کا یہ قول ہے کہ اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔(242) ۔ اردو اور ملتانی کے درمیان مذکورہ روابط میں سے پہلے دو کی لسانیاتی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اصول و قواعد کا اشتراک البتہ اہمیت کا حامل ہے لیکن ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اس ذیل میں جس طرح اختلاف کو کھینچ تان کر اشتراک ثابت کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ مزید یہ کہ اصول و قواعد کا یہ تقابل لسانیاتی نقطہ نظر سے نامکمل ہے کیوں کہ اس میں دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین کئے بغیر محض ان عناصر کو ہی زیر بحث لایا گیا ہے جن میں زیادہ سے زیادہ اشتراک ہے۔ یہ مماثل لسانی عناصر عموماً ہند آریائی زبانوں میں ملتے ہیں جیسے یہ کہنا کہ " سابقوں، لاحقوں کا استعمال اردو بھی کرتی ہے اور ملتانی بھی ۔" (243) اور " دونوں زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں تقریباً ساٹھ فیصد کا اشتراک ہے۔" (244) ذخیرۂ الفاظ کا اشتراک اردو اور ملتانی کے علاوہ اردو اور پنجابی، اردو اور ہریانی حتیٰ کہ اردو اور داروڑی زبانوں میں بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق اردو اور ملتانی کے روابط پر تفصیلی مباحث کے بعد اس طرح اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں جو یہ ہے

" 1۔ وادیٔ سندھ میں عربی فارسی بلوچی ترکی وغیرہ زبانوں کے اختلاط سے جو نئی زبان پیدا ہوئی وہ یہی زبان تھی جسے آج ہم ملتانی کہتے ہیں۔

2۔ صوبہ ملتان ملک سندھ کا ترقی یافتہ صوبہ تھا۔ 111 ھجری میں خودمختار بن گیا تھا اور یہاں کا تمدن ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثال تھی ۔ جیسا کہ عرب سیاحوں نے شہادت دی ہے۔

3۔ یہ نئی زبان جو وادیٔ سندھ کے شمالی اور ترقی یافتہ حصے میں تیار ہوئی یہاں سے

چل کر لاھور پہنچی ۔ چنانچہ 1025 ھجری اور اس سے پہلے کی لاھوری زبان کے نمونے ملتانی اثرات کی غمازی کرتے ھیں ۔

4۔ پنجاب میں اس نئی زبان پر پنجابی نے اثر ڈالا اور اس کی ھئیت اور بدل گئی اور یہ دو آتشہ زبان بن گئی ۔

5۔ یہ دو آتشہ زبان دھلی اور اس کے نواح میں پہنچی تو وھاں کی زبانوں نے اس پر اتنا اثر ڈالا کہ یہ ان بولیوں میں ضم ھو کر رہ گئی اور ایک نئی زبان اردو کے نام سے عالم وجود میں آ گئی ۔ " (244)

سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مخلوط زبان کا ھیولا تیار ھوا جو سیال حالت میں مسلمانوں کے ساتھ لاھور پہنچی اور یہاں پنجابی کے زیر اثر پروان چڑھتی رھی ، جب دارالخلافہ دھلی منتقل ھوا تو یہ زبان بھی مسلمانوں کے ساتھ دھلی پہنچی اور نشو و نما حاصل کر کے اردو سے موسوم ھوئی ۔ اردو دھلی سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ھندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ، یہ قیاس آرائیاں ڈاکٹر مہر عبدالحق سے پہلے بھی ھوتی رھی ھیں ۔ سیّد سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی) اور کے ۔ ایس ۔ بیدی (تین ھندوستانی زبانیں) نے اردو کے آغاز کے بارے میں بھینہٖ ایسے ھی تصورات پیش کئے ھیں ۔ جنہیں ماھرین لسانیات نے قیاسی مفروضات سے زیادہ اھمیت نہیں دی ھے ۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا نظریہ بھی اسی ذیل میں آتا ھے ۔ ان کے مقالے کا موضوع ملتانی زبان کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لینا اور اردو سے ملتانی کے لسانی تعلق پر روشنی ڈالنا تھا ۔ کسی زبان کے آغاز و ارتقاء کا کھوج لگانے سے پہلے اس زبان کی لسانی خصوصیات کا تعین کر لینا چاھیے تاکہ ممکنہ ماخذ/ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے صحیح سمت کا تعین ھو سکے ۔ اس کے بعد ایک ھی خاندان کی زبانوں سے لسانی تقابل کرنا چاھیے اور اس کے لئے لسانیاتی مناھج اختیار کرنا چاھئیں ، اس کی بہترین مثال ھمیں ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو زبان کا ارتقاء) کے یہاں نظر آتی ھے ۔ ڈاکٹر مہر عبد الحق نے لسانیاتی مناھج اختیار نہیں کئے اس لئے وہ زبانوں کے تعلق کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے ھیں ۔ اردو اور ملتانی

کا تعلق لسانیاتی ہی ہو سکتا ہے۔ یہ لسانی تعلق نسبی یا تاریخی ہو سکتا ہے یا ہمسایہ زبانوں کا۔ دونوں صورتوں میں اس تعلق کی وضاحت کے لئے لسانیاتی مناہج اختیار کرنا چاہئیں۔ پہلی صورت میں متحدہ ماخذ کی جستجو کرنا ہے اور دوسری صورت میں دونوں زبانوں پر ایک دوسرے کے لسانی اثرات کا جائزہ لینا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق اردو اور ملتانی کے لسانی تعلق کا ہی تعین نہیں کر سکے ہیں، اس لئے ان کے مقالے میں اس لسانی تعلق کی وضاحت بھی نہیں ہوتی ہے۔

" اردو سندھی کے لسانی روابط " (1970ء) شرف الدین اصلاحی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جو اسی عنوان سے مرکزی اردو بورڈ نے شائع کیا ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے اردو اور سندھی کے مشترک لسانی عناصر کی نشان دہی کر کے دونوں زبانوں کے قریبی لسانی روابط کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ انہوں نے لسانیاتی مناہج اختیار کئے ہیں تاہم کہیں کہیں ان کا طرز استدلال غیر لسانیاتی ہو گیا ہے۔ خصوصاً جب وہ اردو اور سندھی کے ان مشترک لسانی عناصر کی، جو جدید ہند آریائی زبانوں میں عموماً مشترک ہیں، اہمیت پر زور دے کر اردو اور سندھی کو متحد الاصل قرار دیتے ہیں تو ان کا رویّہ غیر لسانیاتی ہو جاتا ہے۔

شرف الدین اصلاحی، مخلوط زبان کے تصور کو رد کرتے ہوئے، اردو اور سندھی کو آریائی زبانیں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس خیال کی بھی نفی کرتے ہیں کہ اردو کا مولد سندھ ہے وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شور سینی اپ بھرنش، مغربی ہندی کے واسطے سے اردو کی اصل ہے اور اس کا علاقہ دوآبہ ہے۔ (245) انہوں نے ماہرین لسانیات کی اکثریت سے اتفاق کرتے ہوئے وراچڈ اپ بھرنش کو سندھی کی اصل تسلیم کیا ہے۔ (246) لیکن وہ اردو اور سندھی کو متحد الماخذ قرار دیتے ہوئے جو استدلال اختیار کرتے ہیں وہ کمزور ہے۔ ان کے خیال میں آریاؤں کا ایک گروہ سندھ میں آباد ہوا، جن کی بولی آج سندھی کہلاتی ہے اور آریاؤں کا ایک اور گروہ مدھیہ دیش میں آباد ہوا، جن کی بولی آج اردو کہلاتی ہے۔ اگرچہ

کڑی میں دونوں ایک زبان کی دو بولیاں تھیں۔ (247) اس حوالے سے یہ سگی بہنیں نہیں تو رشتے کی بہنیں ضرور ہیں۔ (248) یہ رشتہ تو تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں ہو سکتا ہے کیوں کہ سلسلہ نسب کی ابتدائی کڑی میں سب متحد الماخذ ہیں۔ اس طرح شرف الدین اصلاحی جان بیمز کی تقسیم السنہ کو درست تسلیم کرتے ہوئے انڈک کلاس کی دس زبانوں میں سے ہندی (اردو جسے بیمز نے ہندی کہا ہے) اور سندھی کو ایک ہی خاندان کی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ (249) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ماہرین لسانیات نے جن میں ہیورنلے، گریرسن، جٹرجی، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، شامل ہیں، اردو اور سندھی کو دو مختلف زمروں کی زبانیں قرار دیا ہے۔ اس بحث کے آخر میں شرف الدین اصلاحی اردو اور سندھی کو ہم وطن قرار دیتے ہیں کیوں کہ دونوں نے ہندوستان میں نشو و نما حاصل کیا اور ارتقائی منازل طے کیں۔ ان کی یہ دلیل بھی تمام جدید ہند آریائی زبانوں پر صادق آتی ہے۔ اردو اور سندھی کی ایک وجہ اشتراک انہوں نے یہ بھی بیان کی ہے کہ دونوں زبانوں پر عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ چوں کہ یہ وہ اثرات ہیں جو دونوں زبانوں نے مشترک ذرائع سے قبول کئے ہیں اس لئے وہ ان دونوں میں وجہ اشتراک ہیں۔ (250)

سندھی پر اردو کے اثرات کی ذیل میں شرف الدین اصلاحی نے اردو کے ان لسانی اثرات کی نشان دہی نہیں کی جو لنگوافرینکا کی حیثیت سے سندھی پر مرتب ہوئے ہیں گے۔ البتہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ سندھی کے قدیم شعراء اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے سندھ میں اردو شاعروں کے ناموں کی فہرست دی گئی ہے لیکن ان کے کلام کے نمونے نہیں دئیے گئے۔ جدید شعراء کے بھی صرف نام دئیے ہیں، اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ سندھ میں اردو ادب، سندھی بولنے والوں میں بھی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اردو زبان عام سندھیوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ شرف الدین اصلاحی کے خیال میں قیام پاکستان سے پہلے اردو پر سندھی کے اثرات کی نشان دہی نہیں ہوتی البتہ قیام پاکستان

کے بعد اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد سندھ کے شہروں میں آباد ہوئی لیکن ان کی زبان پر سندھی کے اثرات اتنے زیادہ نہیں ہیں البتہ اندرون سندھ میں اردو بولنے والے طبقے پر سندھی کے اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن یہ اثر بھی چند گنے چنے لفظوں تک محدود ہے، جو عام اردو بولنے والوں کی زبان پر نظر آتا ہے۔

اردو اور سندھی کے مشترک لسانی عناصر پر شرف الدین اصلاحی نے بھرپور بحث کی ہے ان کے خیال میں اردو اور سندھی میں حروف و حرکات کا اشتراک نظر آتا ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے دونوں زبانوں میں مشترک حروف ابجد کی نشان دہی بھی کی ہے اور سندھی کی مخصوص آوازوں کی علامات کی وضاحت بھی کی ہے۔ اردو اور سندھی کے نظام اصوات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ " اردو سندھی کے نظام اصوات میں بڑی یگانگت ہے۔ اس یگانگت کی وجہ ان دو متحدالاصل زبانوں کا خونی رشتہ اور ثقافتی ورثہ ہے۔ یہ دونوں زبانیں ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد و احفاد ہیں۔" (251) یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ نظام اصوات میں اس قسم کی ہم آہنگی تقریباً تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں نظر آتی ہے۔ جب کہ شرف الدین اصلاحی صرف اردو اور سندھی کے نظام اصوات کی یگانگت پر توجہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے نظام اصوات کی توضیح کے لئے اردو اور سندھی کے صوتیوں کا چارٹ دیا ہے، جس سے آوازوں کی درجہ بندی کر کے ان کے مقام ادا (مخارج) کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ مصمت صوتیوں کا تقابلی چارٹ بھی دیا گیا ہے جس سے دونوں زبانوں میں اشتراک اور اختلاف کی نشان دہی ہوتی ہے ۔ اردو اور سندھی کی وہ آوازیں جنہیں صوتیے کا درجہ دیا گیا ہے۔ انہیں ان زبانوں کی بنیادی آوازیں ثابت کرنے کے لئے اقلی جوڑوں کے سیٹ بنائے گئے ہیں تاکہ ان میں صوتی تضاد و تقابل کو نمایاں کر کے انہیں بنیادی آوازوں کا درجہ دیا جا سکے۔

زبانوں میں صوتی تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے۔ بولنے والوں کی مختلف صوتی عادتیں اور لب و لہجے کا فرق صوتی تغیر و تبدل کی وجہ سے بنتا ہے۔ اردو اور سندھی

میں بھی صوتی تغیرات کی مثالیں ملتی ہیں۔ شرف الدین اصلاحی نے اردو اور سندھی کے ان صوتی تغیرات کی مثالیں دی ہیں، جن کی وجہ سے مشترک الفاظ میں اختلاف نمایاں ہو گئے ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔ (252)

--- قدیم ہند آریائی کا " و" جدید ہند آریائی زبانوں میں " ب" سے بدل گیا ہے، سندھی نے " و" برقرار رکھا ہے۔

--- سندھی میں اردو ت، ٹ سے بدل جاتی ہے اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

--- سندھی متحرک الآخر اور اردو ساکن الآخر زبان ہے۔

--- اردو سندھ کے مابین صوتی تبدیلیوں کا ایک مظہر حرکات ثلاثہ کا اشباع ہے، یا اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

--- اردو کے وہ تمام الفاظ جو " الف" یا " ہ" پر ختم ہوتے ہیں۔ سندھی میں واوٗ مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔

--- سندھ میں تقلیب صوتی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ وغیرہ

صوتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو اور سندھی میں ایسے مشترک الفاظ کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن کی صورتیں ایک جیسی ہیں لیکن معنی اور محل استعمال کے لحاظ سے وہ مختلف ہیں۔ شرف الدین اصلاحی نے ایسے الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔

اردو اور سندھی دو مستقل زبانیں ہیں ان کا منبع و مخرج ایک سہی لیکن ان کی راہیں مختلف ہیں اس لئے الفاظ کی تعمیر و تشکیل میں ان کے مابین اختلافات ہیں جو خاصے گہرے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو مماثل ہیں اور شرف الدین اصلاحی کے خیال میں دونوں زبانوں کے خاندانی تعلق کی آئینہ دار ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں تشکیل الفاظ کے دونوں طریقے 1۔ اشتقاق اور 2۔ ترکیب بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور ایسے ان گنت الفاظ ہیں جو دونوں زبانوں میں ایک ہی قاعدے سے بنے ہیں، انہوں نے اشتقاق اور ترکیب سے شکیل پانے والے ایسے الفاظ کی مثالیں دی ہیں جن کی تعمیر ایک جیسے قاعدے سے ہوئی ہے۔

البتہ کہیں کہیں اختلاف کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

اردو اور سندھی کے صرفی ، نحوی عناصر میں اشتراک کے ساتھ اختلاف بھی ملتا ہے لیکن شرف الدین اصلاحی نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے ان مشترک عناصر کی نشان دہی کی ہے جن سے ان دونوں زبانوں کے مقامات اشتراک و اتصال واضح ہو سکیں۔ " ہماری بحث کا مقصد تمام تر مشترک عناصر کی نشان دہی کرنا ہے۔" (253) ان میں سے چند مشترک عناصر یہ ہیں :- (254)

-- اسم کی تعریف، قسمیں اور ان کی مثالیں قریب قریب دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔

-- دونوں زبانوں میں جنس کی صرف دو صورتیں پائی جاتی ہیں۔

-- مذکر سے مونث بنانے کا عام قاعدہ مشترک ہے۔ البتہ اختلاف بھی ہے لیکن اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔

-- اردو اور سندھی میں عدد کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں اور تمام جدید ہند آریائی میں یہی صورت ہے۔

-- دونوں زبانوں کے بیشتر فعلی مادے مشترک ہیں۔

-- معروف سے مجہول بنانے کا قاعدہ دونوں زبانوں میں بے حد مشترک ہے۔

-- فعل امر بنانے کا طریقہ دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔

اسی طرح " نحوی اعتبار سے ان میں بہت کم اختلافات کا سراغ ملتا ہے۔ نحوی قاعدے اکثر دونوں میں ایک سے ہیں۔ ان میں جملوں کی ساخت ایک ہی ڈھنگ پر ہوتی ہے۔" (255) مشترک نحوی قاعدوں اور اس سلسلے میں مثالوں پر بحث کے بعد شرف الدین اصلاحی نے اردو اور سندھی کے مشترک ذخیرۂ الفاظ کی فہرست دی ہے۔ جو دونوں زبانوں کے دخیل الفاظ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ دخیل الفاظ ہندی ، عربی ، فارسی ، ترکی ، انگریزی اور یونانی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقالے کے ضمیمہ جات میں ایسے الفاظ کی فہرست دی گئی ہے جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں

اور اسمائے اعداد سے ہے۔ ضمیمہ نمبر 2 میں اردو ، سندھی اور انگریزی کے جملوں کی فہرست دی گئی ہے۔

زبانوں میں لسانی روابط کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ وہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں تو متحد الماخذ ہو سکتی ہیں لیکن اگر ایک ہی خاندان کے دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھتی ہیں تو ان کے ماخذ میں بھی فرق ہوگا اگرچہ ان کی لسانی خصوصیات میں کتنا بھی اشتراک کیوں نہ ہو۔ دو ہمسایہ زبانیں بھی مشترک لسانی عناصر کے باوجود مختلف الماخذ ہو سکتی ہیں البتہ ہمسایہ زبانوں کے ایک دوسرے پر لسانی اثرات بہت زیادہ ہوتے ہیں، جن کا مطلب کہا جا سکتا ہے کہیں کہ یہ مشترک لسانی عناصر دونوں زبانوں کے ارتقاء پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اردو اور سندھی ایک ہی خاندان، ہند آریائی خاندان، کی دو زبانیں ہیں لیکن دونوں دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ گریرسن کی تقسیم السنہ کے مطابق اردو زبانوں کے اندرونی گروہ اور سندھی بیرونی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر چٹر جی کی تقسیم کے مطابق سندھی شمال مغربی زبانوں کے گروہ میں اور مغربی ہندی (اردو کی جد امجد) درمیانی علاقے کی زبانوں کے گروہ میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے زبانوں کو ان کی صرفی اور صوتی خصوصیات کے پیش نظر تین زمروں میں تقسیم کیا ہے جس کے مطابق سندھی پیشاچی یا دردی زمرے میں اور مغربی ہندی شورسینی زمرے میں شامل ہیں۔ شرف الدین اصلاحی ، جان بیمز کی تقلید کرتے ہیں، جس نے ہند جرمانی (ہند یورپی) خاندان کی ایک شاخ " انڈک " کی گیارہ ذیلی شاخوں میں ہندی (جس سے اردو مراد لی جا سکتی ہے) اور سندھی کو شامل کیا ہے، لیکن بیمز کی تقسیم ابتدائی نوعیت کی تھی جسے بعد میں جدید تحقیق کی روشنی میں رد کر دیا گیا ۔ اس لئے اب بیمز کی تقسیم السنہ کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگرچہ شرف الدین اصلاحی نے اس تقسیم سے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ اردو اور سندھی دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں تاہم انہوں نے مختلف گروہوں پر توجہ نہیں دی البتہ یہ تسلیم کیا ہے کہ اردو شورسینی اپ بھرنش سے اور سندھی وارچڈ اپ بھرنش سے نکلی

ہیں جو دو مختلف علاقوں کی اپ بھرنشیں ہیں لیکن جوں کہ وہ ہند آریائی خاندان سے تعلق
رکھتی ہیں اس لئے متحد الماخذ ہیں، اس طرح انہوں نے زبانوں کے متحد الماخذ ہونے کا جو اصول
بنایا ہے اس کے مطابق تمام جدید ہند آریائی زبانیں متحد الماخذ ہیں ان کی یہ بات ایک حد
تک سچ بھی ہے لیکن اس طرح زبانوں کی الگ الگ شناخت تو نہیں ہو سکتی ان کے لسانی رشتوں
کا تعین ہو سکتا ہے نہ ہی نسبی رشتوں کا۔ شرف الدین اصلاحی اردو اور سندھی کو بہنیں
ثابت کرنا چاہتے تھے ۔ اس لئے وہ کھینچ تان انہیں اس منزل تک لے گئے جہاں اردو اور سندھی
تو نہیں البتہ ان کی مورث اعلیٰ بہنیں تھیں، پھر وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر ارتقائی
منزلیں طے کرنے لگیں اور مزید جدا جدا شاخوں میں تقسیم ہوتی چلی گئیں ان کی جدید
صورتیں آج کی جدید ہند آریائی زبانیں ہیں جن میں اردو اور سندھی بھی شامل ہیں جو
زبانوں کے مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے آپس میں لسانی اختلافات بھی رکھتی ہیں
اور ہم خاندان ہونے کی وجہ سے لسانی اشتراک بھی۔ لیکن یہ اشتراک وہ ہے جو تمام جدید
ہند آریائی زبانوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر شرف الدین اصلاحی اردو سندھی
کے تقابلی مطالعے میں سندھی کی جگہ کسی اور جدید ہند آریائی زبان کو رکھ دیں اس زبان
کے لسانی سرمائے سے مثالیں دیں تو بھی لسانی اشتراک سامنے آئے گا ۔ اور اسی قسم کے نتائج سامنے
آئیں گے۔ جو اردو اور سندھی کے تقابلی جائزے سے سامنے آئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ وہ مشترک
لسانی خصوصیات ہیں جو تقریباً تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں کم و بیش ملتی ہیں۔ اس
لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرف الدین اصلاحی نے اردو سندھی کے لسانی روابط کا مطالعہ کرتے
ہوئے اگرچہ لسانیاتی مناہج اختیار کئے تاہم ان کا رویہ غیر لسانیاتی ہے۔ انہوں نے صرف ان مشترک
لسانی خصوصیات پر نظر رکھی جو جدید ہند آریائی زبانوں میں عموماً نظر آتی ہیں لیکن اردو
اور سندھی کے لسانی اختلافات پر توجہ نہ دی جب کہ یہ بہت ضروری تھا ۔ اگر وہ دونوں زبانوں
کی لسانی خصوصیات کا تعین کر کے آگے بڑھتے تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آ سکتے تھے۔ وہ اردو
اور سندھی کے لسانی روابط کا مطالعہ ایک دوسرے پر لسانی اثرات کے حوالے سے ڈائیلیکٹالوجی

(Dilectology) کی ذیل میں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا بھی نہیں کیا۔ ان کے تحقیقی کام کے مختلف حصے، جیسے آوازوں کے مباحث اور صوتی تغیرات خاصے اہم ہیں اور ان پر بہت محنت اور توجہ دی گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس سے اردو اور سندھی کے لسانی روابط کا کوئی نیا پہلو سامنے نہیں آتا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" اسی عنوان سے مرکزی اردو بورڈ لاہور کے زیر اہتمام 1982ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں انہوں نے کشمیری زبان کا اردو زبان سے تقابلی مطالعہ کر کے، مشترک لسانی عناصر کی نشان دھی کی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے کشمیری زبان کے آغاز و ارتقاء اور اس کے اردو سے لسانی روابط کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

کشمیری زبان کو عام طور پر پی شاچی یا دردی زمرے کی زبان قرار دیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر یوسف بخاری نے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کیا وہ کشمیری کو بروشسکی زبان قرار دیتے ہیں البتہ اس پر پی شاچی زبانوں کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ مختلف ماہرین لسانیات کے نقطہ ہائے نظر سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "کشمیر کے ابتدائی لوگ ناگ تھے جن کی ابتدائی زبان بروشسکی تھی۔ بروشسکی اور پشاچہ لوگوں کی زبان سے قدیم پساچہ معرض وجود میں آئی۔ یہ زبان وادی کشمیر کے پہاڑی سلسلوں میں بولی جاتی تھی۔ جب آٹھویں صدی قبل مسیح میں آریہ جہلم کے کنارے کنارے آباد ہونے لگے تو قدیم پساچہ اور جدید آریاؤں کے ملاپ سے نئی زبان وجود میں آئی۔ یہ وادی کی زبان تھی۔ جسے جدید پساچہ کہیں گے یہی کشمیری زبان تھی۔ یہ جہلم کے آر پار کشمیر میں بولی جانے لگی۔ ہمیں اس زبان کا روپ یا اس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا ہے۔ لہذا جس دور میں ہمیں اس کی تحریری دستاویزات ملی ہیں ہم اسی دور کو قدیم کشمیری زبان کہیں گے۔ کیوں کہ بحث کشمیر سے اور کشمیری زبان سے ہے جس کو ہم کوشر کہیں گے۔" (256)

ڈاکٹر یوسف بخاری کے خیال میں آج تک تمام ماہرین لسانیات ایک روایتی رائے پر کاربند

رہ کر اس مغالطے کا شکار رہے کہ کشمیری کی اساس دردی زبان پر ہے جب کہ نہ دردستان ہے اور نہ وہاں کی کوئی دردی زبان ہے، جس کی تصدیق ڈاکٹر لائٹنر کی تحقیق سے ہوتی ہے۔ جس کے مطابق دردستان ایک دیو مالائی علاقہ تھا۔ لہذا ایک خیالی زبان پر کشمیری زبان کی اساس قائم نہیں کی جا سکتی۔ (257) لیکن انہوں نے ڈاکٹر لائٹنر کے جس بیان کو نقل کیا ہے اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ دردستان کوئی دیو مالائی سر زمین تھی یا دردی خیالی زبان ہے۔ در حقیقت ڈاکٹر یوسف بخاری نے ڈاکٹر لائٹنر کے بیان کی غلط تفہیم و تشریح کی ہے۔

اردو اور کشمیری زبانوں کے لسانی روابط پر بحث کرتے ہوئے وہ دونوں زبانوں میں قریبی تعلق کی نشان دہی کرتے ہیں اور اس کی بنیاد جان بیمز کی تقسیم السنہ کو بناتے ہیں جس کے مطابق شور سینی اپ بھرنش کی گیارہ شاخوں میں ہندی اور کشمیری بھی شامل ہیں وہ اس تقسیم سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

" ہندی یا ہندوستانی جسے ہم اردو زبان کہیں گے اور کشمیری زبان آپس میں قریب کا تعلق رکھتی ہیں۔" (258)

اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف بخاری نے اردو اور کشمیری زبانوں میں درج ذیل لسانی روابط کی نشان دہی کی ہے۔ (259)

- کشمیری اور اردو میں عربی اور فارسی کے دخیل الفاظ ملتے ہیں، اس لئے دونوں زبانوں کو ارتقائی منازل طے کرنے میں ایک جیسی دشواریوں یا آسانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔
- کشمیری زبان لہجاء، مشرقی پنجابی اور مغربی ہندی عنصر سے مرکب ہوئی ہے اور اردو کے شانہ بشانہ ترقی کرتی رہی۔
- اردو اور کشمیری زبان کا بھی شورسینی اپ بھرنش ماخذ ہونے کی حیثیت سے قریبی رشتہ ہے۔
- کشمیری اور اردو دونوں ایک ہی جیسے حالات اور عوامل کے زیر اثر وجود میں آئیں اور

-- دونوں زبانیں مختلف قوموں کے اختلاط کا نتیجہ ہیں۔

-- دونوں زبانوں نے ہر زمانے میں مختلف قوموں کے اثرات قبول کئے اس سلسلے میں دونوں زبانوں کا لسانی رد عمل اور ارتقاء ایک جیسا ہے۔

-- اردو اور کشمیری کے جغرافیائی تعلقات بھی دونوں کے لسانی روابط کے آئینہ دار ہیں۔

-- دونوں زبانوں نے عربی ، فارسی اور انگریزی کے اثرات قبول کئے۔

اردو اور کشمیری زبانوں میں اس قسم کے روابط کو کسی صورت میں لسانی روابط قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ دو مختلف زبانوں کو کھینچ تان کر ایک ایسے رشتے میں جوڑنے کی کوشش ہے جو غیر لسانیاتی رشتہ ہے۔

ڈاکٹر یوسف بخاری نے کشمیری زبان پر اردو کے اثرات کا ذکر کیا ہے جو زیادہ تر اردو اور کشمیری میں مشترک عربی و فارسی کے الفاظ کے حوالے سے ہے اسی طرح اردو پر کشمیری کے اثرات کے حوالے سے بھی کشمیری کے چند الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے جو اردو زبان میں خال خال ملتے ہیں۔

" اردو اور سندھی کے لسانی روابط " (1970ء) (شرف الدین اصلاحی) کا لسانی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اگر سندھی کی جگہ کسی بھی جدید ہند آریائی زبان کا نام لکھ دیا جائے اور اس زبان کی خصوصیات کی تفصیل دے دی جائے تو وہ دونوں زبانوں کے مشترک عناصر ہوں گے۔ اس کا عملی ثبوت ڈاکٹر یوسف بخاری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے " کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ " میں دیا ہے۔ اس مقالہ میں ابواب کی ترتیب، عنوانات ، ذیلی عنوانات اور ان کے مباحث بعینہٖ وہی ہیں ، جو "اردو اور سندھی کے لسانی روابط " میں شامل ہیں ، کہیں کہیں ذرا سی ترمیم کر لی گئی ہے۔ یا صوتیات کی ذیل میں چند دقیق مباحث کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس طرح " کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ "(1982

ایک اعتبار سے " اردو اور سندھی کے لسانی روابط " (شرف الدین اصلاحی) کا چربہ ہے۔ یہ اس حد تک چربہ ہے کہ اس کے بیشتر صفحات " اردو اور سندھی کے لسانی روابط " کے صفحات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ابواب کے تمہیدی جملے، ذیلی عنوانات کی ترتیب اور توضیحی جملے تک ایک جیسے ہیں۔ اس طرح اسے چربے کے بجائے سرقہ، قرار دینا زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ " کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ " میں سرقے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جن میں سے چند ایک کا حوالہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

اردو کے کشمیری زبان پر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر یوسف بخاری لکھتے ہیں

" تہذیبی تعلق کے سلسلے میں اب تک جن اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، وہ ایسے تھے جو اردو اور کشمیری زبان نے مشترک ذرائع سے قبول کئے، اس لئے وہ ان کے مابین وجہ اشتراک ہیں۔ " (260)

یہی جملے جن میں کشمیری کی جگہ سندھی کا لفظ موجود ہے " اردو سندھی کے لسانی روابط " میں صفحہ نمبر 86 پر " اردو کا اثر سندھی پر " کے زیر عنوان موجود ہیں۔ اسی طرح اسی بحث میں ایک اور پیراگراف ہے۔

" فارسی چوں کہ غیر ملکی زبان تھی اور اردو یہاں کی ہی پیداوار تھی۔ اس کی پیدائش میں بہت سی باتیں تھیں جو ہندوستان کی تقریباً تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ زبانیں آپس میں اجنبی نہیں سمجھی جاتی تھیں اور جب بھی یہ مغل عساکر کے ساتھ دلی سے نکل کر اطراف و جوانب میں پہنچیں تو ہر جگہ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان تھی جو اپنی خوبیوں اور ہمہ گیری کی وجہ سے ہر جگہ ہم آہنگ نظر آنے لگی۔" (261)

یہ پیراگراف ذرا سے رد و بدل کے ساتھ، مثلاً مغل سالاروں کی جگہ مغل عساکر لکھ دیا ہے، " اردو و سندھی کے لسانی روابط " کے صفحہ نمبر 87 سے سرقہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مذکورہ

پیراگراف میں یہ جملے،

" شمالی ہند بے شک اردو کی پیدائشی جگہ ہے۔ تقریباً ہر صوبے میں اس کی تاریخ لکھی جا چکی ہے، مثلاً دکن میں اردو، پنجاب میں اردو، بہار میں اردو ۔" (262)

جنم بھوم کا ترجمہ " پیدائشی جگہ" اور شعر و ادب کی تاریخ کے بجائے "اسکی تاریخ" کی تبدیلی کے ساتھ " اردو سندھی کے لسانی روابط" کے صفحہ نمبر 88 سے لیا گیا ہے۔

" کشمیری زبان کا اردو پر اثر" کے مباحث میں مثالوں میں ردو بدل کے ساتھ وہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے، جو شرف الدین اصلاحی کا ہے۔ اس ذیل میں سرقہ کی مثال درج ذیل پیراگراف ہے۔

" چنانچہ کشمیری مہاجر، دکاندار، خوانچہ فروش اور پھیری والے جب گاہک کو پکارتے ہیں تو آواز وہ اردو میں ہی دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ چیزوں کے نام کشمیری زبان ہی میں لیں گے۔ پیاز کو گنڈہ کہیں گے۔ بادام کو بادم اور انگور کو دچھ سے پکاریں گے۔ وہ ان چیزوں کے کشمیری نام سے صرف کشمیری کو دیکھ کر نہیں پکارتے بلکہ ان کا خطاب زیادہ تر اردو بولنے والے ہی سے ہوتا ہے۔" (263)

یہ پیراگراف خفیف سی تبدیلیوں اور مثالوں میں کشمیری اشیاء کے ناموں کے ساتھ " اردو اور سندھی کے لسانی روابط" سے سرقہ کیا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے " اردو اور سندھی کے لسانی روابط" سے صرف چند مثالیں ہی دی جا رہی ہیں۔ " کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" میں صرف مذکورہ کتاب سے ہی نہیں بلکہ " ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" (1967ء) ڈاکٹر مہر عبدالحق اور " اردو زبان کا ارتقاء" (1956ء) ڈاکٹر شوکت سبزواری، سے بھی سرقہ کی مثالیں ملتی ہیں، دونوں کتابوں سے ایک ایک مثال ذیل میں دی جاتی ہے۔ کشمیری اور اردو

کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر یوسف بخاری لکھتے ہیں۔

"کشمیری زبان کا اردو کے ساتھ سب سے بڑا اور پہلا تعلق یہ ہے کہ جن حالات کے پیش نظر اردو وجود میں آئی ہے بالکل انہی حالات کے زیر اثر کشمیری زبان نے بھی جنم لیا ہے اور جن عوامل کے کارفرما ہونے سے اردو پیدا ہوئی انہی عوامل کے پیش نظر کشمیری بھی معرض وجود میں آئی ہے" (264)

یہ پیراگراف خفیف سی تبدیلیوں کے ساتھ مثلاً منصۂ شہود کا ترجمہ معرض وجود کر کے، "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" (ڈاکٹر مہر عبدالحق) کے صفحہ نمبر 494-495 سے سرقہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد کی مباحث کا چربہ "کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" کے صفحات نمبر 72-73 پر موجود ہے۔

"کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" میں سنسکرت اور کشمیری زبان کے تعلق کے مباحث میں، سنسکرت اور پراچہ زبانوں کو ہمسایہ زبانیں قرار دینے کے بعد، ہمسایہ زبانوں کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے، ڈاکٹر یوسف بخاری لکھتے ہیں۔

"ہمسایہ زبانیں فطری طور پر ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ ان کی باہمی مماثلت اور بعض خصوصیات میں اشتراک کی وجہ یہ نہیں کہ ان کی اصل ایک ہے اور وہ سب ایک زبان سے متفرع ہوئی ہیں، بلکہ وہ پڑوس میں بولی جانے والی زبانیں ہیں جنہیں ساتھ ساتھ ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ متحد الاصل زبانوں کی ساخت، ان کا کھنڈا اور ان کا نظام ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ماحول اور حالات میں نشو و نما پاتی ہیں اس لئے اس بنیادی اتحاد کے باوجود بہت سے اصول و قواعد میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہیں اور آس پاس کی زبانوں سے بعض صرفی و نحوی خصوصیات لے کر کچھ سے

یہی پیراگراف من و عن " اردو زبان کا ارتقا" (ڈاکٹر شوکت سبزواری) کے صفحہ نمبر 45 پر موجود ہے۔ یہ تمام تر پیراگراف، جو سرقہ کی مثالوں کے طور پر دئیے گئے ہیں، کسی بھی کتاب یا مصنف کے حوالے کے بغیر " کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ " کے صفحات پر موجود ہیں۔

ڈاکٹر یوسف بخاری نے کشمیری زبان کے آغاز کے حوالے سے جو مباحث پیش کئے ان میں خاصا تضاد نظر آتا ہے۔ وہ کشمیری کو بروشسکی سے ماخوذ قرار دیتے اور اس پر پشاچہ کے اثرات کبھی تسلیم کرتے ہیں، پھر اس کے بعد وہ دونوں کے اختلاط سے قدیم پشاچہ کے ظہور کی بات کرتے ہیں، پھر اس میں مشرقی پنجابی اور مغربی ہندی کے عناصر کی آمیزش بھی کر دیتے ہیں، لیکن اچانک اردو اور کشمیری کو شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ کبھی کشمیری زبان کو ہند ایرانی خاندان کی یادگار قرار دیتے ہیں اور پھر کشمیری کو آریائی زبانوں سے مختلف بھی سمجھتے ہیں۔ در حقیقت انہوں نے مختلف قسم کے تصورات کو خلط ملط کر دیا ہے اور کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں، اس لئے ان کے یہاں تضاد اور ابہام پیدا ہو گیا ہے، جو ان کے غیر لسانیاتی شعور کا مظہر بھی ہے۔ دو زبانوں کے تقابلی جائزے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیات کا تعین کر کے ان کا تقابل کیا جائے، مشترک عناصر کی نشان دہی کی جائے اور اختلاف کو بھی نمایاں کیا جائے تاکہ دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کا تعین ہو سکے اور ان کے لسانی روابط کی وضاحت ہو سکے، یا دو زبانوں کے تقابل سے ان کے مشترک ماخذ کا تعین کیا جاتا ہے۔ کشمیری اور اردو دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔ اس لئے یہ صورت یہاں ممکن نہ تھی اور پہلی صورت میں تقابلی مطالعے کے تقاضے ڈاکٹر یوسف بخاری نے پورے نہیں کئے ہیں، انہوں نے اردو اور کشمیری زبانوں کا جو تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اس سے دونوں زبانوں میں کسی بھی نوعیت کے لسانی روابط کی توضیح و تشریح نہیں ہوتی ہے۔

اردو اور دیگر زبانوں، پنجابی، ہندی، ملتانی، سندھی اور کشمیری، کے تقابلی مطالعے کے مباحث میں، اردو اور ہندی متحد الماخذ ہیں جب کہ پنجابی، ملتانی، سندھی اور

کشمیری اردو کے مقابلے پر زبانوں کے مختلف گروہوں سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان زبانوں سے اردو
کے تقابلی مطالعے کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی جو مشترکہ ماخذ کی تلاش کے حوالے سے زبانوں کے
تقابل کی ہوتی ہے۔ زبانوں کے تقابلی جائزے کی دوسری صورت ہمسایہ زبانوں کے ایک دوسرے پر
اثرات کا جائزہ لینے کی ہے۔ پنجابی کے علاوہ باقی تین زبانوں میں تقابل کی یہ صورت بھی
ممکن نہیں ہے۔ زبانوں کے تقابل کی تیسری صورت لنگوا فرینکا کے مقامی زبانوں پر اثرات اور
مقامی زبانوں کے اس لنگوا فرینکا پر اثرات کا مطالعہ کرنے کی ہے۔ اس حوالے سے اردو، ملتانی،
سندھی، اور کشمیری زبانوں کا مطالعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر مہر عبدالحق، شرف الدین
اصلاحی اور ڈاکٹر یوسف بخاری نے اس طرف بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ اگر اس طرف توجہ دی جاتی
اور اس نقطۂ نظر سے ان زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تو یہ اردو لسانیات میں قابل قدر
اضافہ ہوتا۔ اور ڈائلیکٹالوجی (بولیوں کی سائنس یا بولیوں کا علم) کی ذیل میں بھی ایسا
تحقیقی کام ہوتا جس کی مثال ابھی تک اردو میں نہیں ہے۔

اردو اور دیگر زبانوں کے تقابلی جائزے یا لسانی روابط کے حوالے سے جو تحقیق ہوئی
ہے اس کا لسانیاتی جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ شرف الدین اصلاحی نے لسانیاتی
مناہج اختیار کئے ہیں اگرچہ ان کا رویہ کہیں کہیں غیر لسانیاتی ہے۔ تاہم انہوں نے لسانیاتی
مطالعے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور صوتیات کی ذیل میں انہوں نے قابل قدر اضافہ کیا
ہے۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی، ڈاکٹر مہر عبدالحق اور ڈاکٹر یوسف بخاری کے رویے غیر لسانیاتی
لسانیات اردو میں
ہیں اور انہوں نے لسانیاتی مناہج بھی اختیار نہیں کئے۔ اس لئے وہ/تاریخی و تقابلی/ روایت میں
کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔

اردو میں، تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے مباحث کا دائرہ، اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے مسائل تک محدود رہا ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں اس سنجیدہ مسئلے کا مطالعہ غیر لسانیاتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کا ایک سبب تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات سے عدم واقفیت بھی ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے مسائل کے علاوہ تاریخی و تقابلی لسانیات کے دیگر اہم مباحث کو نظر انداز کیا جاتا رہا تاریخی و تقابلی لسانیات کے مباحث کا دائرہ محض زبان کے آغاز اور وطن کے مسائل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زبانوں میں لسانی تغیرات کا مطالعہ، زبانوں کی تاریخی و تقابلی گرامر کی تشکیل، اور سب سے بڑھ کر اس مطالعے کے لئے لسانیاتی مناہج کا استخراج اور ان کی ترتیب و تنظیم کے مسائل بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ زبانوں کی تقابلی گرامر ہی تاریخی و تقابلی لسانیات کی بنیاد ہے۔ مغرب میں ان موضوعات پر قابل قدر کام ہوا ہے۔ مستشرقین نے ہند آریائی زبانوں کے مطالعے اور ان کی تقابلی گرامروں کی تشکیل پر اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ مغربی ماہرین لسانیات نے لسانی تغیرات کے عمیق مطالعے کے بعد صوتی تغیرات کے قوانین وضع کئے اور تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات پر سیر حاصل مباحث کے نتیجے میں لسانیاتی مناہج کا استخراج کیا، لیکن اردو دنیا نے تاریخی و تقابلی لسانیات کو اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے مباحث کے دائرے ہی میں محدود کر کے رکھ دیا۔ حالاں کہ تاریخی و تقابلی لسانیات میں زبانوں کے آغاز اور وطن کے مسائل محض ضمنی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث خال خال ہی نظر آتے ہیں، ابتداء میں تو اس مسئلے پر سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو کے آغاز اور وطن کے مباحث میں ضمنی طور پر کہیں کہیں ان مسائل کی محض جھلک سی نظر آ جاتی ہے۔ یا کسی ایک آدھ مضمون کی صورت میں ضمنی حیثیت میں ان مباحث کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ یا ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مقالے " اردو زبان کا ارتقاء" (1956ء) سے تاریخی و تقابلی لسانیات

کے مناھج کا استخراج کیا جا سکتا ھے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے، البتہ ان مسائل پر سنجیدگی سے توجہ دی ھے، انھوں نے " زبان کا ارتقا" (1977ء) اور " زبان کیا ھے؟ " (1989ء) میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث کا جائزہ لے کر ان سے متعلق مسائل کا احاطہ کیا ھے۔

زبانیں، جب تک بولنے والوں کی زبانوں پر رہتی ھیں تغیر پذیر رہتی ھیں۔ بولنے والوں کا مزاج، لب و لہجہ، صوتی عادتیں، سماجی و معاشی ضرورتیں، سیاسی و جغرافیائی حالات، اجتماعی نفسیات، نسلی اختلاط، لسانی اختلاط جیسے عوامل لسانی تغیرات پر اثر انداز ھوتے رھتے ھیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات، لسانی تغیرات کا مطالعہ کر کے، ان کا رخ متعین کرتی ھے اور زبانوں کے ارتقائی مدارج کی نشان دھی کرتی ھے۔ اس طرح مطالعہ کے لئے لسانیاتی مناھج اختیار کئے جاتے ھیں، جن کا استخراج زبانوں کے مطالعے ھی سے کیا جاتا ھے۔ زبانوں میں صوتی، صرفی، نحوی اور معنوی تغیرات رونما ھوتے رھتے ھیں یہ لسانی تغیرات کہلاتے ھیں، ان میں عموماً صوتی تغیرات پر زیادہ توجہ دی جاتی رھی ھے کیوں کہ صوتی تغیرات ھی صرفی و نحوی ارتقا کا سبب بن جاتے ھیں، اس ذیل میں پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ھیں کہ

> " ماھرین لسانیات نے صرفی، نحوی اور معنویاتی تبدیلیوں کے مقابلے پر صوتی تغیرات کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی ھے کیوں کہ یہ زیادہ صریحی ھوتے ھیں اور ان کی جانچ پڑتال زیادہ صحت کے ساتھ ھو سکتی ھے۔ یہ تغیرات عموماً کلموں میں ھوتے ھیں، اس لئے صرفی و معنویاتی ارتقا کو بھی کسی قدر انھی کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ھے۔ یہ تغیرات عموماً زیادہ باقاعدگی سے بھی ملتے ھیں، اس لئے ان کی تعمیم سے قواعد و ضوابط کا استنباط ممکن ھے۔ معنویاتی تبدیلیوں کی تعمیم اور قوانین کا استنباط ممکن نہیں، اس لئے زبان کے سائنسی مطالعہ میں صوتی تغیرات کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ھے۔" (266)

صوتی تغیرات تعمیری یا اساسی بھی ہوتے ہیں اور اتفاقی بھی ، ایسے صوتی تغیرات جو کسی زبان کے تمام سرمایہ کلمات میں یا اس کے معقول حصے میں باقاعدگی سے ملتے ہیں تعمیری اساسی یا دامیاتی کہلاتے ہیں اور اگر یہ تغیرات خال خال ملیں یا تعمیری تغیرات کے برعکس ہو تو انہیں " اتفاقی " تغیرات کہتے ہیں۔ (267) صوتی تغیر سے کلمے میں کوئی نئی آواز نہیں پیدا ہوتی بلکہ کلمے میں موجود آوازیں اپنی جگہ بدل لیتی ہیں یا اسی زبان کی دوسری آوازوں سے بدل جاتی ہیں یا حذف ہو جاتی ہیں ، البتہ دخیل کلموں کی ایسی آوازیں جو زبان میں موجود نہیں ہوتیں قریب المخرج آواز میں بدل جاتی ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے صوتی تغیرات کی نوعیتوں کے حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صوتی تغیرات کئی نوعیتوں کے ہوتے ہیں ، پروفیسر خلیل صدیقی نے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مصمتے کی مصوتے میں تبدیلی کو انگریزی میں Vocalization سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں مصمتہ ، مصوتے سے بدل جاتا ہے اسی طرح مرکب مصوتے مفرد ہو جاتے ہیں اور مصوتوں کو طویل اور قصیر بنا کر بھی صوتی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ اس کا دارومدار لہجے ، صوتی ماحول اور ملفوظ بنانے کی عادتوں پر ہوتا ہے۔ مصوتے کو کھینچنے یا طویل بنانے کے عمل کو " اشباع " کہتے ہیں۔ اردو میں یہ رجحان کسی قدر ملتا ہے ، جیسے تند ، سندور ، بلوا ، کو تونِد ، سیندور اور بیل بنا لینا ۔ مصوتوں کو قصیر بنا لینے سے بعد کے مصمتے مشدد ہو جاتے ہیں۔ جیسے چادر کو چدر ، جاقو کو چکو کہا جاتا ہے۔ کلمے کے دو مختلف سلیبل کے پاس پاس ادا ہونے والی ہم مخرج آوازوں کو متجانس کر لینے یا باہم جذب کر لینے کا رجحان ملتا ہے ، جیسے " ر " اور " ل " پاس پاس ہوں تو دونوں کو " ر " یا دونوں کو " ل " بنا لیا جاتا ہے۔ صوتی تغیرات میں اصوات کا اضافہ یا سقوط بھی ہوتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ کلمے میں اصوات کے اضافے کی تین صورتیں ہیں ، کلمے کے آغاز میں اضافہ ، درمیان میں اضافہ اور آخر میں اضافہ ۔ اسی طرح اصوات کے سقوط کی دو صورتیں ہیں ، آغاز میں سقوط جیسے اناج اور ابھیتر کا الف حذف کر کے ناج اور بھیتر کہا جاتا ہے۔ کلمے کی آخری آواز کا سقوط جیسے ، ندراء

چھایااور پگھنی نے تبدیلیوں کی کئی صورتوں کے بعد ضد ، چھاؤں اور بہن کی صورت اختیار کر لی ۔ کلموں کی آخری آواز کا سقوط اردو کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اردو آخری مصوتے کو تو بالکل گوارا نہیں کرتی ۔ صوتی تغیر کی ایک صورت تقلیب کہلاتی ہے۔ جس میں کلمے کی اندر کی آواز اپنی جگہ بدل لیتی ہے جیسے گرہ سے گھر، عوامی اردو میں فصیل سے صفیل مطلب سے مطبل ۔ کلمے میں دو یا زیادہ مصمتے اکٹھے آ جائیں تو مصمتی خوشے کہلاتے ہیں۔ قدیم زبانوں میں مصمتی خوشے استعمال ہوتے تھے، جو اب بھی کچھ زبانوں میں ملتے ہیں لیکن کچھ زبانیں مصمتی خوشوں کو گوارا نہیں کرتیں ، ان زبانوں کے بولنے والے اپنی صوتی عادت کے مطابق مصمتی خوشوں کے درمیان مصوتہ استعمال کر کے انہیں الگ الگ سلیبل میں توڑ لیتے ہیں ، اردو مصمتی خوشے گوارا نہیں کرتی ۔ اسی لئے اردو بولنے والے اگر کلمے کے آغاز میں مصمتی خوشہ ہو تو اس سے پہلے مصوتے کا اضافہ کر لیتے ہیں ، جیسے سکول سے اسکول ، سٹیشن سے اسٹیشن ۔ البتہ کلموں کے آخر میں مصمتی خوشہ اردو گوارا کر لیتی ہے۔ (268)

زبانوں میں صوتی تغیرات کے رونما ہونے کے کئی اسباب و عوامل ہوتے ہیں ، زبانیں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لیتی ہیں۔ نسلی اور لسانی اختلاط ہوتے ہیں ، اجنبی زبانوں کے اثرات ہوتے ہیں ، بولنے والوں کے لب و لہجے میں خفیف سا فرق ہوتا ہے اور بولنے والوں کا تسہیلی رجحان ایسے عوامل مل جل کر صوتی تغیرات کا سبب بن جاتے ہیں ، پروفیسر خلیل صدیقی نے ان کی توضیح کرتے ہوئے ان عوامل کی نشان دہی کی ہے، جو صوتی تغیرات کا سبب بنتے ہیں نطق ، سماعت اور لہجہ میں تبدیلی صوتی تغیرات کا باعث بنتے ہیں۔ جب ایک زبان بولنے والا اجنبی زبان سیکھ کر بولتا ہے تو اپنی مخصوص صوتی عادتوں کی وجہ سے اس زبان پر کچھ نہ کچھ صوتی تصرف ضرور کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف زبانوں کے اختلاط سے بھی ان کے صوتی نظام میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں ، لسانی اختلاط کی ایک صورت یہ بھی کہ جب ایک قوم اپنی زبان ترک کر کے دوسری زبان اختیار کر لیتی ہے تو اپنی مخصوص صوتی عادتوں کے باعث نئی زبان میں غیر شعوری طور پر صوتی انحرافات کرتی ہے۔ بولنے والوں کے لب و لہجے میں تبدیلی یا خفیف سا

فرق دور رس صوتی تغیرات پیدا کرتا ہے۔ (269)

ماہرین لسانیات نے زبانوں میں صوتی تغیرات کے اسباب کے حوالے سے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے ان آرا کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ صوتی تبدیلیوں کا ایک اہم سبب آب و ہوا اور جغرافیائی کوائف کو قرار دیا گیا ہے۔ مختلف علاقوں کے باشندوں میں مخصوص جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے باعث مخصوص صوتی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کا لب و لہجہ درشت یا نرم ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقوں کی زبانوں کے مصمتے کرخت ہوتے ہیں جب کہ ساحلی علاقوں کے لوگوں کے یہاں نرمی ہوتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں اسے کلیہ نہیں بنا لینا چاہیے کیوں کہ آب و ہوا اور جغرافیائی حالات صوتی عادتوں پر اثر انداز ہوتے تو ہیں لیکن ان کا اثر بہت خفیف سا ہوتا ہے کیوں کہ بعض اوقات ایک جیسی آب و ہوا کے علاقوں میں بھی آوازوں کی کرختگی یا نرمی کا رنگ مختلف ہو سکتا ہے۔ (270) ایک خیال یہ بھی ہے کہ اعضائے نطق میں غیر معمولی تبدیلی سے یا ان کی بناوٹ میں فرق سے صوتی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی کاملاً درست نہیں ہے بلکہ پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں اصل حقیقت یہ ہے کہ بولنے والے اپنی زبان کی آوازوں کے سننے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے جب وہ کسی نئی زبان کا ایسا کلمہ سنتے ہیں جس کی کوئی آواز ان کی مادری زبان میں نہیں ہوتی تو وہ غیر شعوری طور پر اجنبی آواز کی جگہ قریب المخرج آواز نکالتے ہیں اور اس طرح ان کے دوسرے ساتھی اس کی پیروی کرنے لگیں تو صوتی تصرف رونما ہوتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ظاہر کی گئی ہے کہ قومی نفسیات صوتی تبدیلیوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن قومی نفسیات بھی اس ذیل میں کوئی پیمانہ نہیں بن سکتی۔ (271)

صوتی تغیرات کی ذیل میں ایک اہم رجحان کلموں کو مختصر کرنے کا رجحان ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے اسے آفاقی رجحان قرار دیا ہے۔ اس کا سبب تسہیل و تقلیل محنت ہے۔ ان کے خیال میں زبان کی صوتی ہئیتیں پیچیدگی سے سادگی کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ " صوتی تسہیل اور ایجاز و اختصار کا رجحان لب و لہجہ میں دور رس تبدیلی پیدا کر

رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے آوازوں کے اجزا یا ادا کے طریقے میں معمولی سی تبدیلی ہو سکتی ہے یا مخارج، متصلہ مخارج سے بدل سکتے ہیں۔" (272) جیسے افراط و تفریط، ھٹ تالا، زیب ورنے ادراتفری، ھڑتال اور زیور کی صورت اختیار کر لی۔ صوتی تسہیل کے رحجان کے نتیجے میں آوازوں کا حذف و سقوط اور ادغام بھی ہو جاتا ہے۔ صوتی ایجاز و اختصار کا یہ عمل بتدریج سالہا سال تک جاری رہتا ہے مثلاً ٹکا شالا، موک ترا، چندری نکا، پانچا وشی، چٹ ککا، وشٹا، سرس ستھان جیسے کلموں نے برسوں میں صوتی اختصار کے کئی مدارج طے کئے اور ٹکسال، جوتا، چاندنی، پچیس، جڑیا، بیسا، سرھانا کی صورتیں اختیار کیں۔(273) پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں صوتی تسہیل اور ایجاز و اختصار کے رحجان سے زبانیں پیچیدہ صوتی نظام سے آسان اور سادہ صوتی نظام کی طرف آتی ہیں اور ترکیب و تالیف کی منزل سے تحصیل کی منزل پر پہنچ جاتی ہیں اور اس سے معنویاتی وسعت پیدا ہوتی ہے۔(274)

توارث کو صوتی تغیرات کے عوامل میں شمار کیا گیا ہے، عضویاتی ساخت اور نفسیاتی رحجانات، جو گویائی کی بنیاد ہیں، انسانوں کو ورثے میں ملتے ہیں۔ اس سے رونما ہونے والے اختلافات کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) خارجی یا مظاھراتی تغیر و تبدل (2) تبدیلی نوع، (3) پیوندی تبدیلیاں ۔ (275) نسلی اختلاط کے نتیجے میں بھی زبانوں میں صوتی تغیرات رونما ہوتے ہیں، اس کی تین نوعیتیں بیان کی گئی ہیں۔(1) فاتحین اقلیت میں ہوں اور مفتوحہ علاقے میں اپنی زبان رائج نہ کر سکیں تو انہیں مفتوحین کی زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ فاتحین کی زبان رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے آثار مقامی زبانوں میں صوتی تغیرات اور دخیل الفاظ کی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں۔ (2) حملہ آور بڑے بڑے کئی گروہوں کی صورت میں مفتوحہ علاقے میں پہنچ کر وہاں زندگی کے تمام شعبوں میں مسلط ہو جاتے ہیں اور مقامی باشندے مکمل طور پر مغلوب ہو جاتے ہیں اس طرح فاتحین کی زبان مقامی زبانوں کو ختم تو کر دیتی ہے لیکن اس کے اثرات قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ جو لسانی تغیرات کا باعث بنتے ہیں، یہ صورت اس وقت بھی رونما ہوتی ہے جب حملہ آور قوم انتہائی طاقت ور ہو

اور مفتوحہ علاقے پر مکمل تسلط حاصل کر لے تو مقامی لوگ ان سے مرعوب و مغلوب ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں ان کی تقالی کرتے ہیں اور ان کی زبان بھی اختیار کر لیتے ہیں، (3) ہجرت کرنے والی قومیں جب کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر وہاں آباد ہو جاتی ہیں تو سیاسی، سماجی اور معاشی ضرورتوں کے تحت وہاں کی زبان اختیار کر لیتی ہیں اور ان کی آئندہ نسلیں اپنی زبان ترک کر دیتی ہیں لیکن نئی زبان میں لسانی تغیرات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نسلی اختلاط کے نتیجے میں لسانی تغیرات کئی صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، برصغیر کی لسانی تاریخ میں لسانی تغیرات کی یہ صورتیں نظر آتی ہیں۔ (276)

زبانوں میں رونما ہونے والی صوتی تغیرات کے سلسلے میں دخیل کلمے بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ غیر قوموں سے سیاسی، سماجی اور معاشی روابط کے نتیجے میں یا مختلف لسانی گروہوں میں میل جول کے نتیجے میں زبانیں ایک دوسرے کے سرمایہ الفاظ سے استفادہ کرتی ہیں۔ لین لسانی لین دین کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، مذہبی، سیاسی، تہذیبی، صنعتی، تجارتی ثقافتی، تہذیبی اور علمی ضرورتوں کے تحت الفاظ مستعار لے لئے جاتے ہیں جو اپنی اصل صورت میں یا صوتی تبدیلیوں کے عمل سے گزر کر مستعمل ہو جاتے ہیں۔ دخیل کلمے اگر مستعار لینے والی زبان کے صوتی نظام سے مماثلت رکھتے ہیں۔ تو یہ جوں کے توں رائج ہو جاتے ہیں۔ بصورت دیگر انہیں صوتی عادتوں کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔ (277) صوتی تغیرات کی اساس قیاس تمثیلی پر بھی ہوتی ہے۔ قیاس تمثیلی سے زبان کے سرمایہ الفاظ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے قیاسی تشکیلوں کو فارمولے کی شکل بھی دی ہے لیکن پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں قیاس تمثیلی تو محض مشابہت کی ایسی حقیقت ہے جس کا بولنے والے ادراک کرتے ہیں۔ البتہ قیاس تمثیلی سے رونما ہونے والے تغیرات یکسانیت اور مشابہت کے رجحان کا مظہر ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں قیاس تمثیلی کی بنیاد صوتی مماثلت پر بھی ہو سکتی ہے اور معنوی مشابہت پر بھی۔ نحوی یکسانیت پر بھی ہو سکتی ہے اور صرفی مماثلت پر بھی۔ قیاس تمثیلی کی بدولت زبان کے سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ارتقائی سفر جاری رکھتی ہے۔

صوتی تغیرات کے ساتھ ساتھ زبانوں میں صرفی تغیرات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لسانی لین دین کے نتیجے میں عام طور پر اسمائے ماندہ ہی کو دخیل الفاظ کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ضمائر، اسمائے اشارہ، صلات، اعداد وغیرہ کو مستعار نہیں لیا جاتا۔ (278) ایسے دخیل الفاظ کی تصریف اپنی زبان کے قاعدوں کے رو سے ہوتی ہے ان کی اصل کے مطابق نہیں ہوتی۔ اردو میں بہت سے دخیل الفاظ اردو قواعد کے مطابق استعمال ہوتے ہیں لیکن اردو قواعد پر فارسی کا عمل دخل بھی ہے۔ (279) صرفی تغیرات کے اثرات نحو پر بھی ہوتے ہیں، پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ لسانی تغیر عموماً صوتی تبدیلی کی صورت میں رونما ہوتا ہے لیکن اس سے کلمے کی صرفی حیثیت بھی بدل سکتی ہے اس لئے یہ تغیر صرفی بھی ہوتا ہے۔ جس کے اثرات نحو پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ (280)

لسانی تغیرات میں صوتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ معنوی تبدیلیوں کی بھی بہت اہمیت ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں "کسی کلمے کی صوتی تاریخ اور اس کے معنوی ارتقاً میں کوئی منطقی مطابقت نہیں ہوتی۔ ایک کی رفتار تیز ہو سکتی ہے اور دوسرے کی سست۔ صوتی علامت میں اختصار کا رجحان ہو سکتا ہے تو مدلول میں توسیع کا یا اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ایک میں معتدبہ تبدیلی ہو اور دوسری میں بالکل نہ ہو۔ اگر دونوں میں تبدیلی ہو تو اس میں کسی قسم کا منطقی رشتہ نہیں ہوتا۔" (281) وقت کے ساتھ ساتھ بولنے والوں کی سیاسی و سماجی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کے زیر اثر جہاں زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے وہاں بعض کلمے متروک بھی ہو جاتے ہیں۔ دخیل کلموں کی صورت میں زبان کے سرمایہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے تو پہلے سے موجود کلموں سے ہم معنی کلمے بھی لے لئے جاتے ہیں۔ جن میں بتدریج لطیف سا معنوی اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ ان ہم معنی کلموں کو مترادفات کہتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں معنوی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو یہ مرادفات نہیں رہتے۔ دخیل کلموں کی معنوی حیثیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق "دخیل اور مستعار کلموں میں سے بہت سے معنوی تصرف کے بعد اپنائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی

تو مستعار لینے والی زبان ان کو بالکل نئے مفہوم دے دیتی ہے۔" (282) انہوں نے معنوی تصرف کی کئی صورتوں سے بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں سماجی، نفسیاتی تبدیلی کی وجہ سے کلمے کے معنی میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ثقافتی تبدیلیاں بھی کلموں کے معانی تبدیل کر دیتی ہیں، کلموں کو مجازی معنی میں استعمال کرنے سے بھی معنوی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ مادی کلچر کی تبدیلی سے کلموں میں معنوی توسیع پیدا ہو جاتی ہے۔ معنویاتی تخصیص سے معانی سمٹ جاتے ہیں اور بعض اوقات اسمائے خاص میں معنوی توسیع ہو جاتی ہے۔ قوموں کا مزاج بدلنے سے تہذیبی و ثقافتی سطح پر اخلاقی مدو جزر رونما ہوتا ہے، جس سے کلموں کی معنوی ترقی اور معنوی انحطاط ہوتا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق لسانی تغیرات کی ذیل میں ایسے متحد الصوت کلمے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے معنی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے اردو میں "پر" کے معنی اوپر، مگر اور اڑنے والا پر، کے ہیں۔(283) ایسے متحد الصوت لیکن معنوی اختلاف رکھنے والے کلموں کی مثالیں ہر زبان میں ملتی ہیں۔

زبان جب وسیع جغرافیائی علاقے میں پھیل جاتی ہے تو اس میں لسانی انحرافات رونما ہونے لگتے ہیں اور لسانی تغیرات کی رفتار ایک اعتبار سے نسبتاً تیز ہو جاتی ہے کیوں کہ زبان اپنے مرکز سے دور ہو کر مختلف طبقوں کے لوگوں میں بولی جاتی ہے تو ان کے مخصوص لب و لہجے اور صوتی عادتوں کی وجہ سے اس میں لسانی انحراف پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ زبان مختلف بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ زبانوں میں لسانی انحراف پیدا ہونے کی توضیح پروفیسر خلیل صدیقی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"کسی بھی زبان کے مسلمہ جغرافیائی حدود میں لسانی ہمواری اور یکسانیت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کیوں کہ زبان کا انحصار بولنے والوں کی صوتی عادتوں پر ہوتا ہے۔ کسی بھی لسانی گروہ کے افراد میں نہ تو افتاد طبع، مزاج، نفسی کیفیت، مناہج فکر وغیرہ کی

یکسانیت ہو سکتی ہے اور نہ صوتی عادتوں اور کیفیتوں کی۔" (284)

زبان، رابطے کی زبان (لنگو افرینکا) کی حیثیت سے کسی ایسے وسیع جغرافیائی علاقے میں بولی جانے لگے جہاں دیگر مقامی زبانیں بھی بولی جا رہی ہوں تو اس زبان میں لسانی تغیرات کی رفتار اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ اس زبان پر مقامی زبانوں کے اثرات بھی مرتب ہونے لگتے ہیں اور بولنے والوں کے لب و لہجے اور صوتی عادتوں کی وجہ سے صوتی تغیرات بھی رونما ہونے لگتے ہیں۔ لسانیات ان انحرافات کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔ کسی زبان کے علاقائی انحرافات یا بولیوں کا مطالعہ اور توضیح و تشریح لسانیات کی اصطلاح میں بولیوں کی سائنس یا Dilectology کہلاتی ہے۔ (285) کسی زبان کی بولیوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ فرق بڑھتا جائے اور کوئی بولی یا مختلف بولیاں اپنا مخصوص لسانی مزاج متعین کر لیں اور زبان کے درجے پر پہنچ جائیں ایسی صورت میں اس زبان جس سے یہ بولیاں شکلی تھیں اور ان بولیوں میں جواب زبان کے درجے پر پہنچ گئی ہیں، ماں بیٹی کا رشتہ ہو گا۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے لسانی انحرافات کی ذیل میں چند مزید صورتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ عورتوں اور مردوں کی زبانوں میں واضح فرق ہوتا ہے کیوں کہ برصغیر میں خاص طور پر اور مغرب میں عموماً عورتوں کا سماجی دائرہ مخصوص ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی زبان خارجی اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ اہل حرفہ اور پیشہ وروں کی بول چال میں ان کے پیشوں کی مخصوص اصطلاحیں ہی شامل نہیں ہو جاتیں بلکہ کلموں کے صوتی، صرفی اور معنوی تغیرات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔(286)

لسانی تغیرات، جو صوتی، صرفی، نحوی تغیرات سے عبارت ہیں، زبانیں میں معنوی وسعت کا باعث بھی بنتے ہیں اور ان کے سرمایہ الفاظ میں اضافے کا باعث بھی۔ لسانی تغیرات ہی سے زبان ارتقا کی طرف مائل رہتی ہے اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، معاشی اور علمی تقاضوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ لیکن ماہرین لسانیات نے لسانی تغیرات کو زبان کے انحطاط سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ مغربی ماہرین لسانیات

دے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ زبانیں انحطاط پذیر ہیں۔ لیکن یسپرسن کے خیال میں یہ نقطہ نظر ماضی پرستی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی یسپرسن کی اس رائے سے متفق ہیں ان کے خیال میں زبانوں کے ارتقاؐ کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی مجموعی ساخت اور امتیازی اور بنیادی خصوصیات کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد یہ امر نظر میں رہنا چاہیے کہ لسانی تغیرات کے نتیجے میں زبان بولنے والوں کو اظہار و ابلاغ کے حوالے سے، کیا نقصان اور فائدہ پہنچا ہے کیوں کہ زبان کا ایک قطعی مقصد خیالات اور احساسات کا ابلاغ ہوتا ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے " بلند ترین سطح پر اس زبان کو رکھا جا سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ معانی کو سادہ ترین ذرائع سے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔" (287) زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ زبانوں میں تلفظ کی تسہیل کا رجحان نمایاں ہے اور اسی کو زبان کا ارتقاؐ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ایجاز و اختصار کا رجحان زبان کی توانائی اور صلاحیتوں کو بہتر، زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ کارآمد بناتا ہے۔ شاید اسی لئے زبان بولنے والے پیچیدہ صوتی نظام کو غیر شعوری طور پر آسان بناتے رہے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ " زبان میں بڑھتی ہوئی تنظیم اور منطقی سادگی، بولنے یا سیکھنے والوں کے لئے مفید ہی ثابت ہوتی ہے۔" (288) پروفیسر خلیل صدیقی کے خیال میں تسہیلی رجحان کی وجہ سے زبانیں ترکیب و تالیف کی منزل سے تحلیل کی منزل پر پہنچ جاتی ہیں اور تحلیل زبان میں لچک پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے خیال میں " لسانی ترقی کے لئے زبان کی تجریدی صلاحیت اور تجریدی کلمیں کی ضرورت ہوتی ہے۔" (289) قدیم زبانوں کی لسانی خصوصیات کا جدید زبانوں سے تقابل کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ " قدیم زبانوں کے مقابلے پر جدید زبانوں میں کلمیں کی ترتیب میں زیادہ باقاعدگی اور تنظیم ملتی ہے اور ان کی گرامر زیادہ آسان اور نحو خاصی سہل ہو گئی ہے۔" (290) اس لئے پروفیسر خلیل صدیقی لسانی ارتقاؐ کو مفید اور کار آمد قرار دیتے ہیں۔ لسانی تغیرات کو لسانی انحطاط قرار دینے والے تقابلی لسانیات کے ماہرین نے قدیم زبانوں کے صرف صوتی اور صرفی شکوہ پر نظر رکھی اور زبان کی غرض و غایت کو نظر انداز کر دیا۔ جدید

زبانوں میں لسانی ارتقاء سے زیادہ باقاعدگی ، تنظیم اور آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں جس سے اظہار و ابلاغ کا حق بہتر طور پر ادا ہوتا ہے۔

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے " اردو زبان کا ارتقاء " میں اردو کے لسانی سرمائے کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے ضمنی طور پر کہیں کہیں اس موضوع پر بحث کی ہے لیکن زیادہ تر اردو زبان کے حوالے سے۔ البتہ ان مباحث سے تاریخی و تقابلی لسانیات کے مطالعے کے اصول و قواعد کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی " اردو کا روپ " میں ان مسائل کا ضمنی طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کا ایک مضمون " لسانیات " کے عنوان سے سیپ کے شمارہ نمبر 50 میں شائع ہوا ، جس میں عمومی لسانیات کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے تقابلی لسانیات کی مبادیات کے حوالے سے چند باتیں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین نے " لسانیات کے بنیادی اصول " (1985ء) میں عمومی لسانیات کے مباحث کی ذیل میں تقابلی لسانیات کی مبادیات پر مختصر سی بحث کی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے سنجیدگی سے اس موضوع پر توجہ دی اور " زبان کا ارتقاء " اور " زبان کیا ہے " میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مسائل پر تفصیلی مباحث پیش کئے۔ ان مسائل پر، اگر ابتدا ہی سے توجہ دی جاتی تو اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کا رخ یہ نہ ہوتا جو اب ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل میں جو خلط مبحث پیدا ہوا ، اس کا ایک سبب تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات سے عدم واقفیت بھی رہا ہے۔ اس پس منظر میں " زبان کا ارتقا " اور " زبان کیا ہے " کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ زبانوں کا تاریخی و تقابلی مطالعہ کرنے کے لئے اگر ان مباحث کو پیش نظر رکھا جائے تو لسانیاتی تحقیق کو صحیح رخ دیا جا سکتا ہے اور اردو دنیا میں لسانیات کے موضوع پر زیادہ وقیع اور معیاری کام کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بلا خوف تردید " زبان کا ارتقاء " اور " زبان کیا ہے " کے مذکورہ مباحث کو اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں قابل قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے مباحث ، اردو کے لسانی مطالعے، اردو کے

پنجابی، ھریانی، برج بھاشا، کھڑی بولی سے تقابلی جائزے، اردو کے دکنی روپ، دکنی اردو اور گجراتی اردو کے لسانی مطالعے اور اردو کے دیگر زبانوں سے لسانی روابط کے حوالے سے ملتانی، سندھی اور کشمیری سے تقابلی جائزے تک محدود رھے ھیں۔ اس سلسلے میں بھی، اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت اب تک کسی عظیم لسانیاتی کارنامے سے محروم ھے۔ ایسے عظیم لسانیاتی کارنامے جن کی مثال مستشرقین، مغربی ماھرین لسانیات اور ھندو ماھرین لسانیات کے یہاں ملتی ھے، جیسے

- A Comparative Grammar of Modern Aryan Languages (1872) by John Beams.
- Linguistic Survey of India (1903) by G.A.Grierson.
- An Outline of Indian Philology (1867) by John Beams.
- Comparative Grammer of the Prakrit Languages,(1965) by R.Pischel.
- A Comparative Grammer of Dravidian (1961) by R.Caldwell.
- On the Dravidian Element in Sanskrit Dictionaries (1872) by F.Kittel.
- Gaudian Grammer ( ). by A.F. Hornle
- A Grammar of Hindi Language (1965). by S.H.Kellog
- La Indo-Arian by J.Block.
- Lectures on the Science of Language (1862) by Max Muller.
- A Grammar of the Sindhi Language compared with the Sanskrit - Prakrit - and the Cognate Indian Vernacular (1872) by Dr.Earnest Trumpt.

- A Comparative Dictionary of the Indo-Aryan Languages (1966) by R.L.Turner.
- Collected works of R.G. Bhandarkar (1927).
- Indo-Aryan and Hindi (1942) by S.K.Chattergi.
- Origin and Development of the Bangali Language(1942) by S.K.Chattergi
- Evalution of Awadhi (1928) by B.R.Saksina
- A History of Urdu Literature (1932) by G.Balley.
- Language, its Nature, Development and Origin (1940). by Otto Jesperson.

یہ ایک مختصر سی فہرست ہے در حقیقت تاریخی و تقابلی لسانیات کی شان دار روایت ایسے عظیم لسانیاتی کارناموں سے معمور ہے۔ یہ لسانیاتی کارنامے زبانوں کے سرسری مطالعے یا ان کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے بارے میں قیاس آرائیوں پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ماہرین لسانیات نے بیشتر زبانیں سیکھیں اور ان پر عبور حاصل کرنے کے بعد نہ صرف ان زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ کیا بلکہ تاریخی و تقابلی لسانیات کے بنیادی مسائل پر سیر حاصل بحث کے بعد لسانیاتی مناہج کا استخراج کیا، لسانی تغیرات کے قوانین وضع کئے اور تاریخی و تقابلی مطالعے کے اصول و قواعد مرتب کئے۔ اس کے برعکس اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت قیاس آرائیوں اور مفروضوں پر محیط رہی ہے۔ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے مباحث کو اردو کے آغاز و ارتقاء اور مولد و منشاء کے مسائل تک محدود کر دیا گیا اور اس حوالے سے بھی زبانوں کا براہ راست مطالعہ

نہیں کیا گیا ۔ حتیٰ کہ خاصے عرصے تک اردو کا لسانی مطالعہ بھی نہیں کیا گیا ۔ تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات جیسے مبادی مسائل پر توجہ ھی نہیں دی گئی ۔ بلکہ اکثر لسانی محقق تو تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات اور دائرہ کار تک سے واقف نہ تھے ۔ اردو میں جن محققین نے کسی قدر لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا یا لسانیاتی نقطہ نظر سے اردو کا لسانی مطالعہ کیا ، انہوں نے لسانیاتی شعور رکھتے ہوئے بھی تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مسائل کو نہ تو موضوع بحث بنایا اور نہ ھی لسانیاتی مناھج کا استخراج کیا ۔

اردو کے لسانی مطالعے کے سلسلے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں ڈاکٹر شوکت سبزواری ، ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فریدکوٹی نے ان ھی مستشرقین ، مغربی ماھرین لسانیات اور ھندو ماھرین لسانیات ھی سے ، جن کی تفصیل گزشتہ صفحات میں دی گئی ھے ۔ استفادہ کیا ھے ۔ جس کے مظاھر ان کے تحقیقی کارناموں میں نظر آتے ھیں ۔ ڈاکٹر زور یورپ میں مغربی ماھرین لسانیات کی نگرانی میں لسانیاتی تحقیق کرتے رھے ھیں ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مغربی ماھرین لسانیات جیولز بلاک اور گریرسن کے نظریات پر ھی اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تحقیقات کی بنیاد بھی مغربی ماھرین لسانیات ، جیولس بلاک ، گریرسن اور چٹر جی کے نظریات پر ھے ۔ اس کا اعتراف انہوں نے " داستان زبان اردو " کے دیباچے میں کیا بھی ھے ۔ ان کے یہاں ، اردو کے لسانی سرمایے کے تقابلی مطالعے کے لئے مواد کا ماخذ بھی ھندو اور مغربی ماھرین لسانیات ، چٹر جی ، بھنڈارکر ، بابورام سکسینہ ، شیام سندر داس ، دھیرندر ورما ، جان بیمز ، ھیورنلے ، کیلاگ ، وھٹنی کے لسانیاتی کارنامے ھیں جن کے حوالے " اردو زبان کا ارتقا " میں موجود ھیں ۔ ڈاکٹر سہیل بخاری تمام ماھرین لسانیات سے اختلاف کرتے ھیں اور ان کے نظریات کو رد کرتے ھیں ، لیکن ان کی کتابوں " اردو کا روپ " اور " اردو کی کہانی " میں ھند آریائی زبانوں میں دراوڑی عناصر کی نشان دھی کی گئی ہے جو یقیناً ھندو اور مغربی ماھرین لسانیات ، چٹر جی ، بھنڈارکر ، کاڈویل ، کٹل وغیرہ سے استفادے کا ھی نتیجہ ھے کیوں کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے دراوڑی اور ھند

آریائی زبانوں کا براہ راست مطالعہ تو نہیں کیا ہے نہ ہی وہ ان زبانوں کو سمجھتے ہیں کیوں کہ انہوں نے برصغیر کی تمام زبانوں کو نہیں سیکھا ہے۔ البتہ ان کے یہاں ہندو یا مغربی ماہرین لسانیات کے حوالے نہیں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری سے ملتے جلتے رویے عین الحق فریدکوٹی کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

اردو کے دیگر زبانوں سے لسانی روابط کے مباحث کے سلسلے میں ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور ڈاکٹر یوسف بخاری نے ہندو اور مغربی ماہرین لسانیات سے بھرپور استفادہ کیا ہے، جس کی مثالیں ان کے تحقیقی مقالوں میں ملتی ہیں ان حضرات نے مذکورہ ماہرین لسانیات کے باقاعدہ حوالے بھی دئیے ہیں۔ تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث کی ذیل میں پروفیسر خلیل صدیقی نے مستشرقین، ہندو اور مغربی ماہرین لسانیات کے لسانیاتی کارناموں سے استفادہ کیا ہے، جس کا اظہار انہوں نے اپنی ہر کتاب کے دیباچے میں کیا ہے وہ اپنی تحقیق کو تالیف قرار دیتے ہوئے اس کی غرض و غایت لسانیاتی نقطہ نظر کو فروغ دینا قرار دیتے ہیں۔ اردو میں لسانی مطالعے کی ذیل میں مذکورہ ماہرین لسانیات سے استفادہ ضرور کیا گیا ہے لیکن اسے محض خوشہ چینی قرار نہیں دیا جا سکتا یہ سچ ہے کہ لسانی مطالعے کے لئے زبانوں کا براہ راست مطالعہ ضروری ہے لیکن تحقیق کے عمل میں دیگر محققین سے استفادہ بھی ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر خلیل صدیقی نے ہندو اور مغربی ماہرین لسانیات کے لسانیاتی کارناموں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن گونا گوں لسانیاتی مسائل پر غور و فکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے لسانی مواد کی تلاش کے لئے تحقیق و جستجو بھی کی ہے اور زبانوں کے لسانی مزاج کو سمجھ کر ان کی لسانی خصوصیات کا تعین بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر خلیل صدیقی نے تاریخی و تقابلی لسانیات کے مسائل پر غوروفکر کر کے مغربی ماہرین لسانیات سے اختلاف بھی کیا ہے اور حقائق و شواہد کی روشنی میں، لسانیاتی طرز استدلال اختیار کر کے نتائج کا استنباط بھی کیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے

کہ اردو میں ماہرین لسانیات نے مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات اور مغربی ماہرین لسانیات کے لسانیاتی کارناموں سے استفادے کے ساتھ لسانیاتی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے لسانیاتی مسائل پر غور و فکر بھی کیا ہے اس لئے ان کے لسانیاتی کارنامے استفادے اور تحقیق کا عمدہ امتزاج ہیں۔

اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں محمد حسین آزاد کے یہاں زبانوں کے تقابل کے اوّلین نقوش نظر آتے ہیں، انہوں نے پہلی بار مخلوط زبان کے تصور سے ہٹ کر اردو اور برج کا تقابل کیا اگرچہ انہوں نے دونوں زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ نہیں کیا تاہم اردو زبان کے حوالے سے ان کے تصورات سے ان کا لسانی شعور جھلکتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو اور پنجابی کا تقابلی مطالعہ علمی و فکری سرگرمی کی حیثیت سے کیا۔ انہوں نے دونوں زبانوں کی مشترک لسانی خصوصیات کا جائزہ لے کر لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا۔ اگرچہ انہوں نے لسانیاتی مناہج اختیار نہیں کئے تاہم ان کا نقطۂ نظر ایک اعتبار سے لسانیاتی ضرور ہے۔ "پنجاب میں اردو" میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے نقوش باقاعدہ اور منظم صورت میں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نہ صرف لسانیاتی نقطۂ نظر رکھتے تھے بلکہ انہوں نے یورپ میں مغربی ماہرین لسانیات کی نگرانی میں لسانیاتی تحقیق بھی کی تھی۔ انہوں نے لسانی مباحث میں پہلی بار لسانیاتی مناہج اختیار کئے، اردو میں جس کی مثال " ہندوستانی لسانیات" ہے لیکن انہوں نے لسانیاتی مسائل میں پوری طرح دلچسپی نہیں اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے " ہندوستانی لسانیات" اگرچہ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات میں خاصی اہمیت کی حامل ہے تاہم ڈاکٹر زور اس سے زیادہ قابل قدر لسانیاتی تحقیق کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو اور اس کی ہمسایہ زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ ان کا طرز استدلال لسانیاتی ضرور ہے لیکن انہوں نے لسانیاتی مناہج اختیار نہیں کئے۔ اس لئے ان کے تحقیقی مقالے " مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں لسانی مواد کے تجزیاتی اور تقابلی مطالعے میں سقم رہ گئے اور وہ دلائل کا مربوط نظام قائم نہ کر سکے اور ان کے تحقیقی مواد میں اس انتشار

کے سبب نتائج کا استنباط نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان کا یہ نقطہ نظر خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے مطالعے کے لئے دہلی اور نواح دہلی کی زبانوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔
ڈاکٹر شوکت سبزواری نے " زبان کا ارتقاء " میں اردو زبان کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ کرتے ہوئے جدید لسانیاتی مناہج اختیار کئے ہیں۔ انہوں نے اردو کی لسانی خصوصیات کا تعین کر کے، سرمایہ زبان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اردو کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا لسانیاتی کارنامہ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں ایک منفرد حیثیت کا حامل اور روشن مثال ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے تاریخی و تقابلی لسانیات کے مسلمہ نظریات کو رد کر کے اردو کے آغاز و ارتقاء کا مطالعہ اپنے نقطہ نظر سے کیا ہے، ان کا یہ نقطہ نظر لسانیاتی ہرگز نہیں ہے ان کے دلائل کمزور ہیں اور ان کا لسانیاتی شعور کمزور تر ہے۔ عین الحق فریدکوٹی کے تصورات اور نقطہ نظر ڈاکٹر سہیل بخاری سے ہم آہنگ ہیں۔ لسانیات میں محض انوکھے مفروضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نہال چند لسانیاتی شعور رکھتے ہیں وہ جدید لسانیاتی مناہج سے واقف بھی ہیں لیکن انہوں نے ایک مضمون میں اردو کے آغاز و ارتقاء کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اس کے علاوہ تقابلی لسانیات کے حوالے سے ان کا کوئی تحقیقی کام ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ جدید لسانیاتی مناہج کا علم رکھتے ہیں، لیکن تقابلی لسانیات کے حوالے سے ان کے چند مضامین ہی ہماری نظر سے گزرے ہیں، اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت ان کی لسانیاتی تحقیق کی منتظر ہے۔

اردو کی دیگر زبانوں سے لسانی روابط کے حوالے سے جن محققین نے کام کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کے یہاں تحقیق کی لگن نظر آتی ہے لیکن لسانیاتی موضوع پر کام کرتے ہوئے انہوں نے لسانیاتی نقطہ نظر اختیار نہیں کیا، وہ تاریخی و تقابلی لسانیات کے مناہج سے ناواقف ہیں ۔ اردو اور ملتانی کے لسانی روابط کے حوالے سے ان کے تصورات مفروضے ہیں۔ جن کی تاریخی و تقابلی لسانیات کی روایت میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے لسانیاتی مناہج اختیار کئے ہیں لیکن اردو اور سندھی کے لسانی روابط کے حوالے سے ان کے رویے

غیر لسانیاتی ہیں۔ البتہ انہوں نے اردو اور سندھی کے مشترک لسانی سرمایے کا تقابلی جائزہ لیا ہے جو کسی قدر اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر کے۔ ایس ۔ بیدی اور ڈاکٹر یوسف بخاری کے تصورات کی حیثیت مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔

اردو میں ، تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے حوالے سے زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے البتہ اس موضوع پر سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ اس حوالے " زبان کا ارتقا" اور " زبان کیا ہے" کے متعلقہ مباحث بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔ اردو دنیا میں ماہرین لسانیات کی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور اردو شعر و ادب اور تحقیق و تنقید بھی رہا ہے۔ اس طرح ان کی توجہ لسانیات کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے دوسرے شعبوں پر بھی رہی ہے۔ لسانیات سے محدود دلچسپی کے نتیجے میں اس موضوع پر ان علما کے مطالعے کا دائرہ بھی محدود ہی رہا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور لسانیات ہی ہے۔ وہ لسانیات کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ انہیں جدید لسانیاتی مناہج سے بھی کامل آگاہی حاصل ہے۔ ان کا نقطہ نظر لسانیاتی ہے۔ اردو میں تاریخی و تقابلی لسانیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اس لئے وہ ان مسائل سے آگاہ ہیں جو لسانیاتی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس لئے انہوں نے اردو دنیا کو تاریخی و تقابلی لسانیات کی مبادیات کے مباحث سے روشناس کرایا ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اردو دنیا میں لسانیاتی نقطہ نظر فروغ پا سکے۔ اس اعتبار سے " زبان کا ارتقا " اور " زبان کیا ہے" کے مباحث تاریخی و تقابلی لسانیات کے موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

حواشی / حوالہ جات

چوتھا باب : تاریخی اور تقابلی لسانیات ـــ تاریخ و تنقید

1- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، لسانیات کے بنیادی اصول (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1985ء) صفحہ 118

2- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (دہلی ، ترقی اردو بیورو، 1994ء) ص 25

3- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (مستونگ، قلات پبلشرز، 1964ء) ص 166

4- ایضاً ، ص 166

5- ایضاً، ص 167

6- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز، 1991ء) ص 67

7- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 15

8- ایضاً ، ص 15

9- ایضاً ، ص 167

10- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 71

11- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، (ایضاً) ص 126

12- پروفیسر خلیل صدیقی ، (ایضاً) ص 71

13- ایضاً ، ص 75

14- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 171

15- ایضاً

16- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 96

17- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، (ایضاً) ص 119

18- عین الحق فریدکوٹی ، اردو زبان کی قدیم تاریخ (لاہور، اورینٹ ریسرچ سنٹر، 1979ء) ص 191

19- ایضاً ، ص 188

20- میر امن دھلوی ، باغ و بہار (لاھور، نیا ادارہ) ص 21

21- سید احمد خاں ، آثارالصنادید (1854ء) بہ حوالہ سید شمس اللّٰہ قادری ، اردوئے قدیم (لکھنو، مطبع تیج کمار، وارث مطبع منشی نولکشور، 1967ء) ص 17

22- عبدالغفور نساخ ، زبان ریختہ (1275ھ) بحوالہ نگار (کراچی ، جنوری 1988ء) ص 36، 37

23- امام بخش صہبائی ، رسالہ قواعد اردو (ص – ن –) بحوالہ حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو (لاھور، کتاب نما، 1963ء) ص 58

24- سید احمد دھلوی ، مقدمہ فرھنگ آصفیہ (لاھور، مکتبہ سہیل ، س – ن) ص 9

25- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 71، 72، 73

26- حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو (ایضاً) ص 59

27- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، داستان زبان اردو (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، 1987ء) ص 37

28- پروفیسر خلیل صدیقی ، لسانی مباحث (ایضاً) ص 92

29- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ، اردو کی لسانی تشکیل (علی گڑھ ، فیصل والا ، سرسید نگر ، 1985ء) ص 35

30- ایضاً ، ص 36

31- محمد حسین آزاد ، سخندان فارس (لاھور، مکتبہ ادب اردو، س،ن) ص 12

32- محمد حسین آزاد ، آب حیات (لاھور، شیخ مبارک علی تاجر کتب، س،ن) ص 6

33- ایضاً ، ص 34

34- حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو (ایضاً) ص 61

35- ڈاکٹر مسعود حسین خاں ، مقدمہ تاریخ زبان اردو (علی گڑھ ، سرسید بک ڈپو، 1958ء) ص 193

36- ایضاً ، ص 203

37- ڈاکٹر سہیل بخاری ، اردو کا روپ (لاھور، آزاد بک ڈپو، 1971ء) ص 65

38- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 54

39- ایضاً ، ص 63، 64

40- ایضاً ، ص 53

41- حکیم شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم (ایضاً) ص 6، 7

42- ایضاً ، ص 16

43- حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو (ایضاً ، ص 15

44- ایضاً ، ص 16

45- ایضاً ، ص 21-

46- ایضاً ، ص 79

47- ایضاً ، ص 87، 88

48- ایضاً ، ص 114

49- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کا روپ، (ایضاً) ص 65، 66

50- ایضاً ، ص 75، 76

51- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 74

52- ڈاکٹر گیان چند، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 73 تا 75

53- حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو (ایضاً) ص 9

54- ڈاکٹر مسعود حسین خان، مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایضاً) ص 10

55- ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (لاہور، مکتبہ معین الادب، 1950ء) ص 89، 90 اور 14

56- ٹی ۔ گراہم بیلی ۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی 1930ء ، ص 391، بحوالہ ڈاکٹرشوکت سبزواری، داستان زبان اردو، (ایضاً) ص 49

57- ڈاکٹر گیان چند، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 72، 73

59- ڈاکٹر زور کی " ہندوستانی لسانیات " کے حصہ اوّل میں ہند آریائی زبانوں کا ارتقائی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس کا تعلق لسانیات عامہ سے ہے، اس حصے کا تنقیدی و تاریخی جائزہ ہمارے مقالے کے تیسرے باب " اردو میں لسانیات عامہ ۔ تاریخ وتنقید " میں پیش کیا گیا ہے۔

60- ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (ایضاً) ص 91

61- ایضاً ، ص 93

62- ایضاً ، ص 99

63- ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اردو کی ابتداً مشمولہ " اردوئے معلی " لسانیات نمبر، جلدسوم، شمارہ 4-5، بابت 1962ء ، ص 59

64- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 208

65- ایضاً ، ص 211

66- ایضاً ، ص 208

67- ایضاً ، ص 211

68- سیّدسلیمان ندوی ، ہندوستان میں ہندوستانی (1933ء) مشمولہ نقوش سلیمانی از سیدسلیمان‌ندوی (کراچی ، الشرق) 1951ء)

69- سیدسلیمان‌ندوی ، نقوش سلیمانی ، (کراچی ، مکتبہ الشرق ،1951ء) ص 31

70- ایضاً ، ص 33 ، 34

71- ایضاً ، ص 34

72- سیدسلیمان‌ندوی ، اردو کیوں کر پیدا ہوئی ، (1933ء) مشمولہ نقوش سلیمانی (ایضاً)

73- ایضاً ، ص 258

74- ایضاً ، ص 261

75- اختر اورینوی، بولیوں کا سنگم (1943ء) مشمولہ تحقیق و تنقید از اختر اورینوی (پٹنہ، شادبک‌ڈپو، س،ن) ص 20

76- ایضاً ، ص 40

77- سیّدحسام الدین راشدی ، اردو زبان کا اصلی مولد سندھ ، شمولہ رسالہ اردو ، جلد 30 نمبر 2 ، بابت اپریل 1951ء ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ، بحوالہ ڈاکٹر مہر عبدالحق ، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق (بہاولپور ، اردو اکادمی ، 1967ء) ص 681

78- نصیرالدین ھاشمی ، دکن میں اردو ، (لاھور ، اردو مرکز ، 1960ء) ص 11 ، 14

79- ایضاً ، ص 11

80- ایضاً ، ص 14 ، 15 ، 16

81- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس ذیل میں ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی ، تین ھندوستانی زبانیں (دھلی ، انجمن ترقی اردو ، 1966ء) ص 179 (طبع اوّل 1961ء) کے حوالے سے نصیرالدین ھاشمی کا ایک اقتباس " اردو کی لسانی تشکیل " صفحہ نمبر 23 پر نقل کیا ھے۔ اتفاق سے " تین ھندوستانی زبانیں " کا یہی ایڈیشن میرے پاس ھے ، اس کے صفحہ 179 پر نصیرالدین ھاشمی کی کتاب " دکن میں اردو " کے حوالے سے ایک اقتباس نقل کیا گیا ھے لیکن کتاب کے صفحہ نمبر کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ میرے پاس نصیرالدین ھاشمی کی کتاب " دکن میں اردو " (1960ء) ھے لیکن مجھے ان کا یہ بیان اس کتاب میں کہیں نہیں ملا اور ڈاکٹر گیان چند نے بھی " اردو کا نام اور آغاز کے نظریے " مشمولہ " لسانی مطالعے " (1991ء) میں نصیرالدین ھاشمی کے نظریے کا تنقیدی جائزہ لیتے ھوئے اس اقتباس کا ذکر نہیں کیا بلکہ دکن میں اردو کی پیدائش کے حوالے سے نصیرالدین ھاشمی کے بیانات میں اسی تضاد کی طرف اشارہ کیا ھے جس کا ذکر میں نے اپنے مقالے میں کیا ھے۔

82- نصیرالدین ھاشمی ، دکن میں اردو (ایضاً) ص 20

83- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 79

84- عبدالصمد صارم الازھری ، اردو کس طرح اور کن لوگوں میں پیدا ھوئی ، مشمولہ ادبِ دنیا ، دور ششم ، شمارہ نمبر 21 ، بابت ماہ ستمبر و اکتوبر 1966ء) ص 19

85- ایضاً ، ص 35

86- ایضاً ، ص 20 اور 27

87- ایضاً ، ص 34

88- عبدالصمدصارم الازھری ، اردو زبان کی تاریخ ، مشمولہ ادبی دنیا ، دور ششم ، شمارہ نمبر 17 بابت ماہ نومبر 1965ء ، ص 20

89- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ، اردو کی لسانی تشکیل ، (ایضاً) ص 23 ، 24

90- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 94

91- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ، اردو کی لسانی تشکیل (ایضاً) ص 24

92- پنڈت دتاتریہ کیفی ، کیفیہ (لاہور ، مکتبہ معین الادب ، 1950ء بار دوم) ص 18

93- ایضاً ، ص 22

94- ایضاً ، ص 59

95- ایضاً ، ص 28

96- پنڈت دتاتریہ کیفی ، " اردو لسانیات " مشمولہ منشورات (لاہور ، مکتبہ معین الادب ، 1950ء) ص 14

97- پنڈت دتاتریہ کیفی ، " پنجاب اور اردو " مشمولہ منشورات (ایضاً) ص 302

98- پنڈت دتاتریہ کیفی ، کیفیہ ، (ایضاً) ص 29

99- ایضاً ص 35 ، 36

100- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ، (دہلی ، ساہتیہ اکادمی 1989ء) ص 75

101- سید احتشام حسین ، مقدمہ مشمولہ ہندوستانی لسانیات (لکھنو ، ادبی دانش محل ، 1948) ص 45

102- ایضاً ، ص 52

103- ایضاً ، ص 53

104- ڈاکٹر مسعود حسین خاں ، مقدمہ تاریخ زبان اردو (علی گڑھ ، سرسید بک ڈپو ، 1958ء) ص 13

105- ایضاً ، ص 13

106- ایضاً ، ص 239

107- ایضاً ، ص 206

108- ایضاً ، ص 127

109- ایضاً ، ص 46، 49، 53

110- ایضاً ، ص 264

111- ایضاً ، ص 49، 53، 81، 83، 130، 140، 141، 208

112- ایضاً ، ص 241

113- ڈاکٹر گیان چند ، اردو کا نام اور آغاز کے نظریے، مشمولہ لسانی مطالعے، ص 82 (ایضاً)

114- ڈاکٹر مسعود حسین خاں ، مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایضاً) ص 49، 50

115- ایضاً ، ص 83

116- ایضاً ، ص 264

117- ڈاکٹر گیان چند (ایضاً) ص 83

118- ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اردو کی ابتداء، مشمولہ اردوئے معلی لسانیات نمبر (ایضاً) ص 68

119- ڈاکٹر مسعود حسین خاں (ایضاً) ص 11

120- ڈاکٹر زور، اردو کی ابتداء، ایضاً ، ص 69

121- ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایضاً) ص 264

122- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، اردو کی لسانی تشکیل (ایضاً) ص 10

123- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، اردو زبان کا ارتقاء (ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، 1956ء) ص 50

124- ایضاً ، ص 55

125- ایضاً ، ص 84

126- ایضاً ، ص 83

127- ایضاً ، ص 74

128- ایضاً ، ص 85

129- ایضاً ، ص 87

130- ایضاً ، ص 146

131- ایضاً ، ص 147

132- ایضاً ، ص 271

133- ایضاً ، ص 87

134- ایضاً ، ص 285

135- ڈاکٹر سہیل بخاری ، اردو کا روپ (ایضاً) ص 56، 59

136- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، اردو زبان کا ارتقا (ایضاً) ص 89

137- ڈاکٹر گیان چند ، اردو کا نام اور آغاز کے نظریے (ایضاً) ص 88، 89

138- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، اردو زبان کا ارتقا (ایضاً) ص 270

139- عین الحق فریدکوٹی ، اردو زبان کی قدیم تاریخ (ایضاً) ص 92، 130

140- ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، اردو کی ابتدا (ایضاً) ص 71

141- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، داستان زبان اردو (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، 1987ء) ص 4

142- ایضاً ، ص 3، 4

143- ایضاً ، ص 19

144- ایضاً ، ص 27، 28، 29

145- ایضاً ، ص 63، 64

146- ایضاً ، ص 89

147- ایضاً ، ص 94

148- ایضاً ، ص 135

149- ایضاً ، ص 169

150- ایضاً ، ص 202

151- ایضاً ، ص 94 تا 97

152- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے (ایضاً) ص 30

153- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کا روپ (لاهور، آزاد بک ڈپو، 1971ء طبع اوّل) ص 50

154- ایضاً ، ص 49

155- ایضاً ، ص 50، 51، 52، 53

156- ایضاً ، ص 107

157- ایضاً ، ص 108

158- یہ تمام تاریخی و جغرافیائی حقائق ، جو تاریخ کا حصہ ہیں، مجھے پروفیسر خلیل صدیقی سے بحث مباحث کے دوران معلوم ہوئے۔ پروفیسر خلیل صدیقی میرے مقالے کے نگران ہیں اور کوئٹہ میں مقیم ہیں۔ وہ قیام پاکستان کے بعد بھارت سے پاکستان تشریف لائے۔ ان کا تعلق سی۔پی کے ایک شہر جبل پور سے تھا، جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے تک کے مدارج طے کئے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے جس علاقے کو اردو کا وطن قرار دیا ہے وہ جبل پور کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی اس علاقے کی تاریخی و جغرافیائی حیثیت اور وہاں کی زبانوں کے بارے میں کماحقہ علم رکھتے ہیں۔

159- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے، (ایضاً) ص 32

160- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کی کہانی (لاہور، مکتبہ عالیہ، 1975ء) ص 31، 32

161- ایضاً ، ص 156

162- یہ جغرافیائی معلومات بھی پروفیسر خلیل صدیقی سے بحث مباحثے کے دوران حاصل ہوئیں۔

163- ڈاکٹر گیان چند ، کھڑی بولی اور ہندوستانی ، مشمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 111

164- ڈاکٹر سہیل بخاری ، پہلی بات، مشمولہ اردو کی کہانی (ایضاً) ص ۸

165- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کی کہانی (ایضاً) ص 155، 156

166- ڈاکٹر گیان چند ، " اردو کا نام اور آغاز کے نظریے"، مشمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 92

167- ایضاً ، ص 91-92

169- ایضاً ، ص 41

170- ایضاً ، ص 42

171- ڈاکٹر گیان چند (ایضاً) ص 93

172- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے (ایضاً) ص 32

173- عین الحق فریدکوٹی ، اردو زبان کی قدیم تاریخ ، (لاہور ، اورینٹ ریسرچ سنٹر، 1979ء طبع دوم) // ص 63

174- ایضاً ، ص 70

175- ایضاً ، ص 275

176- ایضاً ، ص 71

177- ایضاً ، ص 78

178- ایضاً ، ص 93

179- ایضاً ، ص 94

180- ایضاً ، ص 174

181- ایضاً ، ص 234 ۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ سنسکرت ہند آریائی گروہ کی زبان ہے، سنسکرت اور فارسی ہند ایرانی گروہ کی زبانیں ہیں اور سنسکرت، فارسی ، یونانی اور لاطینی ، ہند یورپی گروہ کی زبانیں ہیں جب کہ عین الحق فریدکوٹی ان سب زبانوں کو ہند آریائی قرار دے رہے ہیں، جس سے ان کے لسانیات کے مطالعے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

182- ایضاً ، ص 210

183- ایضاً ، ص 14، 15

184- ایضاً ، ص 57

185- ڈاکٹر گیان چند " اردو کا نام اور آغاز و ارتقا کے نظریے " مشمولہ لسانی مطالعے(ایضاً)ص 95

186- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، " اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے "،مشمولہ اردو کی لسانی تشکیل (ایضاً) ص 35، 36

187- ایضاً ، ص 38، 39

188- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، اردو کا ادبی و لسانی ارتقاء، مشمولہ اردو کی لسانی تشکیل، (ایضاً) ص 47

189- ایضاً ، ص 51، 52

190- ایضاً ، ص 53، 54

191- ایضاً ، ص 54

192- ایضاً ، ص 55

193- ایضا ، ص 83

194- ایضاً ، ص 84

195- ایضاً ، ص 91

196- ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، " قدیم اردو اور ھریانی " مشمولہ اردو کی لسانی تشکیل(ایضاً)ص 141

197- ایضاً ، ص 148

198- ایضاً ، ص 149

199- ایضاً ، ص 141

200- حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو (ایضاً) ص 56

201- ڈاکٹر چٹرجی ، انڈو ایرین اینڈ ھندی، ص 151 ، بحوالہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 14

202- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 17

203- حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو (ایضاً) ص 53

204- ڈاکٹر گریرسن ، ھندوستان کا لسانیاتی جائزہ،جلد 9 حصہ اوّل، ص 3 بحوالہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 12

205- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 12

206- ایضاً ، ص 12

207- ایضاً ، ص 17، 18

208- ایضاً ، ص 5

209-

210- ایضاً ، ص 6

211- ڈاکٹر گیان چند ، اردو کا نام اور آغاز کے نظریے، شمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 62

212- میر امن، باغ و بہار، (ایضاً) ص 21

213- ڈاکٹر گیان چند ، اردو کا نام اور آغاز کے نظریے، شمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 62

214- ایضاً ، ص 63

215- اردو زبان کی ابتداء، کلیات تپش کا دیباچہ، مترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی ، رسالہ اردو اکتوبر 1949ء، بحوالہ ڈاکٹر گیان چند ، اردو کا نام اور آغاز کے نظریے، شمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 63

216- حافظ محمود شیرانی ، مقالات شیرانی ، مرتبہ مظہر محمود شیرانی ، (لاہور، مجلس ترقی ادب 1966ء) ص 42

217- انشا اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، مترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1988ء) ص 2

218- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (ایضاً) ص 16

219- ایضاً ، ص 13

220- ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کا روپ، (ایضاً) ص 100

221- ڈاکٹر گیان چند ، کھڑی بولی اور ہندوستانی ، شمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 111

222- ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان اردو (ایضاً) ص 7

223- کے۔ ایس ۔ بیدی، تین ہندوستانی زبانیں (دہلی ،کتب خانہ انجمن ترقی اردو، 1966ء، طبع دوم) ص 60

224- ایضاً ، ص 62، 63

225- ایضاً ، ص 72

226- ایضاً ، ص 72، 73، 74

227- ایضاً ، ص 185

228- ڈاکٹر گیان چند ، کھڑی بولی اور ہندوستانی ، مشمولہ لسانی مطالعے (ایضاً) ص 106

229- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، اردو زبان کا ارتقا ، (ایضاً) ص 44

230- ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی ، تین ہندوستانی زبانیں (ایضاً) ص 275

231- ایضاً ، ص 237

232- ڈاکٹر مہر عبدالحق ، ملتانی زبان اور اس کے اردو سے روابط ، (بہاولپور، اردو اکادمی ، 1967ء) ص 55

233- ایضاً ، ص 69

234- ایضاً ، ص 129

235- ایضاً ، ص 129

236- ایضاً ، ص 98، 102

237- ایضاً ، ص 273

238- ایضاً ، ص 685، 686

239- ایضاً ، ص 414، 415

240- ایضاً ، ص 496، 497

241- ایضاً ، ص 238

242- ایضاً ، ص 620

243- ایضاً ، ص 572

244- ایضاً ، ص 685، 686

245- شرف الدین اصلاحی ، اردو سندھی کے لسانی روابط (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ، 1970ء) ص 27، 28

247- ایضاً ، ص 64

248- ایضاً ، ص 72

249- ایضاً ، ص 71

250- ایضاً ، ص 86

251- ایضاً ، ص 142

252- ایضاً ، ص 245 تا 294

253- ایضاً ، ص 353

254- ایضاً ، ص 354 تا 407

255- ایضاً ، ص 430

256- ڈاکٹر یوسف بخاری ، کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، 1982ء) ص 27

257- ایضاً ، ص 62،63

258- ایضاً ، ص 52

259- ایضاً ، ص 69 تا 101

260- ایضاً ، ص 102

261- ایضاً ، ص 104

262- ایضاً ، ص 104

263- ایضاً ، ص 110

264- ایضاً ، ص 72

265- ایضاً ، ص 45

266- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کیا ہے، (ملتان بیکن بکس، 1989ء) ص 58

267- ایضاً ، ص 59

268- پروفیسر خلیل صدیقی، زبان کا ارتقاء (کوئٹہ، قلات پبلشرز، 1977ء) ص 182 تا 190

269- ایضاً ، ص 177 تا 180

270- ایضاً ، ص 201 تا 203

271- ایضاً ، ص 203 تا 205

272- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کیا ہے (ایضاً) ص 60

273- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا ارتقا (ایضاً) ص 244

274- ایضاً ، ص 249

275- ایضاً ، ص 209

276- ایضاً ، ص 212 تا 214

277- ایضاً ، ص 219 ، 221

278- ایضاً ، ص 221

279- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کیا ہے (ایضاً) ص 62

280- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا ارتقا (ایضاً) ص 223

281- ایضاً ، ص 225

282- ایضاً ، ص 228

283- ایضاً ، ص 232

284- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کیا ہے (ایضاً) ص 46

285- ایضاً ، ص 49

286- ایضاً ، ص 53، 54

287- پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا ارتقا، (ایضاً) ص 240

288- ایضاً ، ص 249

289- ایضاً ، ص 251

290- ایضاً ، ص 257

پانچواں باب

اشتقاقیات

=•=•=•=•=•=•=

ہر زبان کے الفاظ میں لسانی تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تغیرات صوتی ، صوری اور معنوی سطحوں پر رونما ہوتے ہیں۔ لفظ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ زمانے کی خراد پر ترشتے ترشاتے، ڈھلتے ڈھلاتے اپنی اصل سے مختلف صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لسانی تغیرات مختلف اسباب و عوامل کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں۔ جغرافیائی عوامل ، قوموں کے اختلاط، تہذیبوں کے میل جول، لسانی نقل مکانی ، زبانوں کا ملاپ اور بولنے والوں کے تسہیلی رجحانات، لسانی تغیرات کے اسباب و عوامل ہیں۔ لفظوں کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے، جو نہ صرف ان کے تدریجی ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے بلکہ ہر لفظ قوموں کے اختلاط، تہذیبوں کے میل جول ، بولنے والوں کے ذہنی رجحانات اور عصری میلانات کی کہانی بھی سناتا ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا خیال صحیح ہے کہ :

> " قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے واقعات کو کتنا ہی الٹ پلٹ ڈالیں ، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچّے امانت دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لئے تیار رکھتا ہے، جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں ، چناں چہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں ، تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لیے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا۔ " (1)

اس سلسلے میں پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ " اشتقاقیات کے آئینہ خانہ میں قوموں کے عروج و زوال، ذہنی اکتسابات، معاشری کروٹوں ، اخلاقی مدو جزر ، استعداد و لیاقت، جذبات و احساسات ہی کی تصویریں نظر نہیں آتیں بلکہ زبانوں کے ابتدائی مدارج ، ان کے مزاج ، ساخت، صرف و نحو وغیرہ کی جیتی جاگتی ، بولتی چالتی تصویریں بھی مل جاتی ہیں۔" (2)

مولوی احمد دین ، ڈاکٹر جانسن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

" یہ قوموں کا نسب نامہ، ہر ایک تحریر سے جو اس کو استعمال میں لاتی ہے۔ خود قدیم تر یادگار اور دستاویز ہے۔ تحریرات تو ممکن ہے کہ غفلت، غرور، فریب سینکڑوں اسباب کی بدولت صحت سے دور جا پڑی ہوں ، لیکن زبان کبھی جھوٹ نہیں بولے گی ۔ کبھی ہمیں دھوکا نہیں دے گی ۔ اگر ہمیں صرف اس سے ٹھیک دریافت کرنے کا ہنر حاصل ہو جائے ۔۔ " (3)

لفظوں کی تاریخ بولنے والوں کے لسانی رجحانات کی نشان دہی کرتی ہے اور قوموں کے تہذیب و تمدن کے اختلاط کے اثرات کو بے نقاب بھی کرتی ہے۔ لفظ کے ماخذ اور اس میں رونما ہونے والی صوتی ، صوری اور معنوی تبدیلیوں کی تاریخ کا کھوج لگانا اشتقاقیات کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ :

" ان قاعدوں کا علم جن کے تحت لفظوں میں تراش خراش ہوتی اور کٹ چھٹ کر وہ اپنی موجودہ شکل میں آتے ہیں، علم الاشتقاق یا اشتقاقیات ہے۔" (4)

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ :

" لسانیات کا جو شعبہ الفاظ کے ماخذ اور اشتقاق سے بحث کرتا ہے، " اشتقاقیات " کہلاتا ہے " (5)

ایل۔ گراف کے حوالے سے پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں کہ :

" ایل۔ گراف نے اسے لسانیات کی ایسی شاخ قرار دیا ہے جس میں کلموں کی ہیئتوں اور ان کے صوتی اور تشکیلیاتی رشتوں کا تجزیاتی مطالعہ اس فرض سے کیا جاتا ہے کہ ان کے ماخذ کی نشان دہی ہو سکے۔" (6)

انہوں نے وھٹنے کی اس رائے کا حوالہ بھی دیا ہے کہ :

" اشتقاقیات، انفرادی کلموں کے تاریخی مطالعے کا نام ہے۔ وہی زبان کی تمام تحقیقات کا بنیادی ڈھانچہ ہے۔ وہ عموی اصول، دور رس نقطہ ہائے نظر، عموی اور آفاقی اطلاق کی اور اہمیت رکھنے والی صداقتیں ، جن سے لسانیات کا بیرونی تانا بانا تیار ہوتا ہے ، " اشتقاقیات " پر ہی منحصر ہوتی ہیں۔ صرف کلمے ہی وہ شواہد ہیں، جن سے " اشتقاقیات " کلموں کی ہیئتوں، حیثیتوں، ان سے ترکیب پانے والی زبان بلکہ عام انسانی زبان کے لیے سند اخذ کرتی ہے۔" (7)

ماہرین لسانیات، اشتقاقیات کو تاریخی و تقابلی لسانیات کی اساس قرار دیتے ہیں۔ زبانوں کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کا مطالعہ تحقیقات لفظی یا تاریخی الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔ اس لئے اشتقاقیات کو لسانیاتی تحقیق کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہند یورپی خاندان کی زبانوں کے مطالعے کی بنیاد تحقیقات لفظی یا تاریخ الفاظ پر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اشتقاقیات، تقابلی لسانیات کے فروغ کا باعث بنی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے وھٹنے کی اس رائے کا حوالہ دیا ہے کہ اشتقاقیات لسانی تحقیق کے ڈھانچے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ (8)

اٹھارہویں صدی میں تحقیق الفاظ یا تاریخ الفاظ کی بنیاد قیاسات پر مبنی ہوتی تھی۔ الفاظ کی صوتی و معنوی مشابہت پر توجہ دی جاتی تھی۔ یورپ میں عبرانی زبان کو ام الالسنہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جو بھی لفظ عبرانی کے کسی لفظ سے کسی قسم کی مماثلت یا ظاہری

مشابہت رکھتا تھا اس کا رشتہ عبرانی سے جوڑ دیا جاتا تھا تاکہ عبرانی زبان کا تقدس قائم رہے اور وہ دیگر زبانوں سے برتر قرار دی جا سکے۔ قیاس آرائیوں اور سطحی مشابہت کی بنا پر الفاظ کو ہم اصل قرار دینے سے عجیب و غریب قسم کے نتائج سامنے آئے، جو لسانیاتی نقطۂ نظر سے ناقابل یقین تھے۔ اشتقاقیات کی بنیادیں ایک طویل عرصے تک قیاسات پر ہی استوار رہیں۔

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ اٹھارویں صدی میں اشتقاقیات کی حیثیت قیاسی اور سماعی زیادہ تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بھی اسے صحیح معنوں میں علمی درجہ حاصل نہ ہو سکا تھا۔ الفاظ کی ظاہری مشابہت پر بہت زور دیا جاتا تھا اور دور کی کوڑی لا کر تاویلات کی جاتی تھیں۔ بیسویں صدی میں ان تاویلات کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ ابتدائی اشتقاقیات کے مستخرج نتائج علمی حیثیت نہیں رکھتے۔ (9)

جدید اشتقاقیات سائنس کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ صوتیات کے وضع کردہ اصول و قواعد کی مدد سے بسیط آوازوں کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اشتقاقیات نے صوتیات سے خاصا استفادہ کیا ہے، جس کے نتیجے میں اشتقاقیات کلموں کے مصوتوں، مصمتوں اور کلموں کے معنوں کی توضیح کر سکتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے وھٹنے کے حوالے سے قدیم اور جدید اشتقاقیات میں فرق کی وضاحت کی ہے۔

"جدید اشتقاقیات، اور قدیم اشتقاقیات میں بڑا فرق ہے۔ دونوں اپنے اپنے اخذ کردہ نتائج کی خاصیتوں ہی میں نہیں بلکہ شواھد کی خصوصیات میں بھی ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ھیں۔ جدید اشتقاقیات ایسے دو الفاظ کا بھی مشترکہ ماخذ ڈھونڈ نکالتی ھے، جن کی کوئی دو آوازیں بھی مشابہ نہ ھوں ------ وہ یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کرتی کہ دو زبانوں کے ہم معنی الفاظ صوتی مغائرت کے باوجود ہم اصل اور متحد الماخذ ھیں۔ اس کا طریق مطالعہ تاریخی ھوتا ھے، جس میں تمام ممکنہ شواھد کو کام میں لانا، ان کے تمام مضمرات کی جانچ پڑتال کرنا اور نتائج اخذ کرنے میں پوری پوری احتیاط برتنا لازمی ھے۔" (10)

جدید اشتقاقیاتی نقطۂ نظر سے کلموں کے ارتقائی مدارج اور ان کے ماخذ کا سراغ لگانے کے لیے اصول و قواعد وضع کئے گئے اور مناہج مطالعۂ کی توضیح کی گئی۔ کلموں کے صوتی پہلو پر توجہ دی گئی اور صوتی تشابہ کے فارمولے اخذ کئے گئے۔ اس سلسلے میں " مادے" کا نظریہ بھی سامنے آیا، جس کے مطابق ہر زبان کا آغاز مادوں سے ہوا اور ابتداء میں ہر زبان یک رکنی تھی۔ پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ جدید اشتقاقیات کے حوالے سے جو نتائج اخذ کئے گئے اور جو دعوے کئے گئے ان میں غلو برتا گیا ہے اس لئے کہ مشابہت رکھنے والے کلموں کو ہم اصل یا متحد الماخذ ثابت کرنے کے لیے ٹکے بندھے اصولوں کا تعین دشوار ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلموں کے صوتی، تشکیلیاتی اور معنیاتی تغیرات کی مستند اور جامع تاریخ کی تدوین اور ماخذ کے یقینی اور حتمی تعین کا امکان برائے نام ہی ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض وقیع اور کار آمد نتائج منظر عام پر آ جاتے ہیں۔ جن سے تاریخی و تقابلی لسانیات کے مسائل کی توضیح ہو سکتی ہے اور علم ثقافت یا تہذیبیات کے لیے اچھا خاصا مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ (11)

ہند آریائی لسانیات کی ذیل میں بہت سی اشتقاقیاتی فرہنگیں مدوّن کی گئیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق یورپی زبانوں سے ہے۔ مستشرقین اور یورپی ماہرین لسانیات نے یہ اشتقاقیاتی فرہنگیں بڑی دقت سے نظر اور سالہا سال کی محنت کے بعد مدون کیں۔ انہوں نے زبانوں کا براہ راست مطالعہ کر کے یہ لسانیاتی کارنامے سر انجام دئیے جو تاریخی و تقابلی لسانیات کی اساس بن گئے۔ ان میں سے آر۔ ایل۔ ٹرنر کی " ہند آریائی زبانوں کی تقابلی لغت" (1966ء) اور " نیپالی زبان کی اشتقاقیاتی ڈکشنری " (1932ء) بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان لسانیاتی کارناموں کا حوالہ ہمارے مقالے کے پہلے باب میں دیا گیا ہے۔

اردو میں اشتقاقیات کے مباحث

اردو میں اشتقاقیات ، زیادہ تر، قیاسات اور مفروضات کے سہارے چلتی رہی ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل و مباحث میں بھی سائنسی اشتقاقیات سے مدد نہیں لی گئی جب کہ یہ مسئلہ اس امر کا متقاضی تھا کہ اشتقاقیاتی بنیادوں پر اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے البتہ اس سلسلے میں اشتقاقیات سے استفادہ کیا ہے۔ اردو میں اشتقاقیات کے موضوع پر زیادہ کام نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں مولوی احمد دین کی کتاب " سرگزشت الفاظ " کے علاوہ چند جستہ جستہ مضامین ہی ملتے ہیں۔

مولوی احمد دین ، بی۔ اے، کی کتاب " سرگزشت الفاظ " (س۔ ن) میں اردو اشتقاقیات کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف میں پادری ٹرینچ کی " مطالعہ الفاظ " سے استفادہ کیا ہے، جس کا حوالہ انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں دیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں تحقیق الفاظ کے اصول و قواعد وضع تو نہیں کئے البتہ کتاب کے مباحث میں ان کی طرف اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زبان ایک قوم بلکہ بسا اوقات کئی قوموں کے جذبات، خیالات اور تجربات کی مجسمہ ہے۔ اس میں قوموں کے کارناموں کی تاریخ ، اخلاق کے نمونے اور مذہبی عقائد کی روایتیں پوشیدہ ہیں۔ کسی زبان کے الفاظ ہی میں اس کے بولنے والوں کے نازک خیالات اور دل فریب صوتیں، سلف کے جذبات و تصورات، گذشتگان کی امیدیں اور حسرتیں، زندہ اور قائم ہیں، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان" اخلاق متحجر" یا " تاریخ متحجر" ہے۔ کسی لفظ میں عالم ذہنی اور عالم اجسام کی کسی بڑی مشابہت اور مناسبت باہمی کا نقشہ کھچا ہوا ہے۔ عالم اجسام کی رنگ آمیزی کی مدد سے عالم ذہن کی تصویریں صاف اور روشن اور قیام و دوام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ مولوی احمد دین نے ان مباحث میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ لفظ اپنے معنوں اور اس کیفیت یا چیز، جس کے لیے وہ لفظ ایجاد ہوا، سے مناسبت رکھتا ہے، یعنی کسی لفظ کے پس منظر میں جو تصور یا خیال

انہوں نے
ہے۔ وہ اس لفظ کی صورت میں مجسم ہو گیا ہے۔ اسی کو/ " متحجر" ہونا کہا ہے۔ اسی کی وضاحت
کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ الفاظ جو ہم استعمال کرتے ہیں کچھ تو ضرور ہی اپنی موضوعی چیزوں
سے کم و بیش حقیقی مناسبت رکھتے ہیں اور اشیاء اور اشخاص کی صفات نام کی خصوصیتوں سے
ملتی جلتی ہیں یا ملنی جلنی چاہئیں۔ انہوں نے " متحجر الفاظ" کو تین اقسام 1۔ متحجر نازک خیالی
2۔ متحجر اخلاق اور 3۔ متحجر تاریخ میں تقسیم کر کے مثالوں سے اپنے نقطہ نظر کی توضیح کی
ہے۔ متحجر نازک خیالی ذیل میں انہوں نے شاعری کی لفظیات، تشبیہات و استعارات اور تراکیب و
اصطلاحات، اور زندگی سے متعلق دیگر اشیاء جیسے مقامات کے نام، پھولوں اور بوٹیوں کے نام،
پرند و چرند کے نام قانونی اصطلاحیں، فن تعمیر کی اصطلاحیں، شامل کی ہیں۔ متحجر اخلاق
کی ذیل میں وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ الفاظ قوموں کی اخلاقی بلندی اور اخلاقی انحطاط
کا آئینہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے الفاظ جن کے معنی عزت اور خوبی کا پہلو لئے ہوئے تھے
لیکن جوں جوں ان کے استعمال کرنے والے یا جن کی نسبت یہ استعمال کئے جاتے تھے، قعر مذلت
میں گرتے گئے۔ یہ الفاظ بھی ان کے ساتھ ساتھ ذلت اور خواری کے نمائندے بن گئے۔ معنوی ارتقاء
اور تنقید کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ اس طرح جو الفاظ کبھی ایک ادنیٰ خاصیت پر دلالت
کرتے تھے اب ایک اعلیٰ صفت کے کفیل ہیں۔ اس لئے مولوی احمد دین نے زبان کو قوم کا مقیاس
الاخلاق یا اخلاقی مقیاس الحرارت قرار دیا ہے۔ متحجر تاریخ کی بحث میں وہ اس خیال کا اظہار
کرتے ہیں کہ الفاظ قوموں کی تاریخ، ان کے عروج و زوال، ان کی فتوحات اور قوموں کے باہمی
تعلق کی داستان سناتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں ایسے الفاظ کی نشان دہی کی ہے، جو مختلف
قوموں کے اثرات کے نتیجے میں اردو میں داخل ہوئے یا ایسے الفاظ جو تاریخی واقعات کی کہانی
سناتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سماجی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں، جن کے زیر اثر نئے نئے الفاظ
ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ مولوی احمد دین کا خیال ہے کہ معاشرے کے ممتاز افراد، شاعر، اور علماء
سماجی اور علمی ضرورتوں کے مطابق نئے الفاظ ایجاد کرتے ہیں۔ انہوں نے ایسے الفاظ کی مثالیں
دی ہیں جو مختلف سماجی اور علمی ضرورتوں کے مطابق مختلف اوقات میں وضع کئے جاتے رہے ہیں۔

مولوی احمد دین کا خیال ہے کہ الفاظ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے جستجو، شوق اور لگن کی ضرورت ہے اور تحقیق الفاظ میں وسعت مطالعہ اور علمی بصیرت بہت ضروری ہے۔ الفاظ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے جلدبازی کے بجائے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ انہوں نے تحقیق الفاظ کے چند اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ الفاظ میں ظاہری مشابہت یا سطحی مشابہت اکثر دھوکا دیتی ہے، جس کا نتیجہ بے تکی تحقیقات لفظی کی صورت میں نکلتا ہے اور ایک زبان کا لفظ دوسری زبان کے لفظ سے مشتق سمجھ لیا جاتا ہے، جب کہ دونوں زبانوں میں کبھی کوئی تاریخی تعلق یا باہمی میل جول نہیں ہوا تھا۔ ظاہری مشابہت مختلف زبانوں میں مشابہت الفاظ، اتحاد و اصلیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح الفاظ میں آواز یا موجودہ صورت میں ظاہری فرق ان کے اتحاد و اصلیت کا منافی نہیں ہو گا۔ تحقیقات الفاظ میں صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے، ظاہری مشابہت یا ظاہری اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر الفاظ کی اصل تک پہنچنے کی کوشش کرنا ضروری ہے، الفاظ کا بہروپ رنگ کا ہے۔ الفاظ کے باہمی رشتے میں پردہ ہوتا ہے جو ان کی اصلیت اور گھرائی کو چھپا رہا ہوتا ہے۔ الفاظ کے باہمی تعلق کی ماہیت کو معلوم کرنے کے لیے مستحکم ارادے اور استقلال طبیعت کی ضرورت ہے۔ مولوی احمددین کا خیال ہے کہ ایک لفظ جو مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہو، اس کے مختلف معنوں میں باہمی رشتہ تلاش کر کے لفظ کے مادے تک پہنچنا چاہیے، کیوں کہ ایک لفظ کے معنی ابتدا میں ایک ہی ہوتے ہیں، اس لئے اس سلسلے کی ابتدائی کڑی کا سراغ لگانا چاہیے۔ بعض اوقات دو یا دو سے زیادہ الفاظ ہجا اور تلفظ میں یکساں ہوتے ہیں لیکن مادہ اور ابتدائی معنوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ ہم اصل یا متحدالماخذ نہیں ہو سکتے ہیں۔ ان مباحث میں مولوی احمد دین نے تحقیق الفاظ کے سلسلے میں ظاہری مشابہت پر توجہ نہ دینے کی تاکید کی ہے۔ اور الفاظ کے معنی میں مشابہت اور مماثلت کی بنیاد پر ان کے مادے یا ابتدائی کڑی کا سراغ لگانے کی ہدایت کی ہے۔ انہوں نے الفاظ کی صوتی اور صوری حیثیتوں کی وضاحت نہیں کی ہے۔

مولوی احمد دین نے تحقیق الفاظ کے سلسلے میں لفظ کی معنیاتی حیثیت پر توجہ

دی ھے۔ انھوں نے " سرگذشت الفاظ " میں جن الفاظ کی تاریخ سے بحث کی ھے، ان کی معنیاتی سطحوں کو پیش نظر رکھا ھے اور معنیاتی ارتقاء کی مختلف کڑیوں کی طرف اشارہ کیا ھے۔ انھوں نے الفاظ میں صوتی تغیرات اور صوری حیثیتوں پر بالکل توجہ نہیں دی ھے۔ " اشتقاقیات میں لفظ کی تینوں سطحوں، صوتی، صوری اور معنیاتی پر توجہ دینا ضروری ھے۔ محض معنیاتی حیثیت کی توضیح کر کے لفظ کے ماخذ کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا اور اس کی ارتقائی کڑیوں کی نشان دھی نہیں کی جا سکتی۔ مولوی احمد دین نے " سرگذشت الفاظ " میں الفاظ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ھوئے، محض قیاسات سے کام نہیں لیا، اس لئے ان کے اخذ کردہ نتائج کو قیاسی نہیں کہا جا سکتا، لیکن انھوں نے لفظ کی مختلف سطحوں کا جائزہ نہیں لیا۔ اس لئے انھوں نے الفاظ کے تاریخی ارتقاء سے بحث کرتے ھوئے جو نتائج اخذ کئے ھیں، انھیں حتمی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ " سرگذشت الفاظ " کے مباحث کو جدید اشتقاقیات کے سائنسی اصولوں کے مطابق نہیں پرکھنا چاھیے۔ اردو میں اشتقاقیات کے ابتدائی نقوش " سرگذشت الفاظ " میں نظر آتے ھیں اور مولوی احمد دین نے تحقیق الفاظ میں قیاسات کا سہارا لینے کے بجائے علمی انداز اختیار کیا ھے۔ اس اعتبار سے ان کی کتاب " سرگذشت الفاظ " اردو میں اشتقاقیات کی روایت میں اہم حیثیت کی حامل ھے۔

سیّد سلیمان ندوی کی کتاب " نقوش سلیمانی " (1939ء) میں شامل تین مضامین میں اردو کے چند الفاظ کی ماھیت اور ماخذ سے بحث کی گئی ھے۔ " بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق " کے عنوان سے دو مضامین کتاب میں شامل ھیں۔ پہلا مضمون 1938ء میں ھندوستانی اکیڈمی کی ادبی کانفرنس الہ آباد میں پڑھا گیا۔ (12) اور جولائی 1938ء میں " ھندوستانی " میں شائع ھوا۔ (13) اسی عنوان سے دوسرا مضمون " معارف " میں مئی 1939ء میں شائع ھوا۔ (14) تیسرا مضمون " تمہید " کے عنوان سے ھے، جو " معارف " میں جون 1939ء میں شائع ھوا۔ (15) سیّد سلیمان ندوی نے پہلے دو مضامین میں اردو کے ایسے الفاظ کی تحقیق کی ھے جو اب اردو

میں شامل ھیں لیکن ان کا ماخذ کوئی دوسری زبان ھے۔ یہ الفاظ صوری اور معنیاتی تبدیلیوں کے بعد اردو میں رائج ھیں۔ سید سلیمان ندوی نے تحقیق الفاظ کے سلسلے میں علمی انداز اختیار کیا ھے۔ اکثر انھوں نے معنیاتی اور صوری تبدیلیوں کی تحقیق کی ھے، البتہ کہیں کہیں صوتی تبدیلیوں پر بھی توجہ دی ھے، جیسے لفظ دام کے تاریخی ارتقاء سے بحث کرتے ھوئے وہ اس خیال کا اظہار کرتے ھیں یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکّے کا نام درخم تھا اس نے عربی میں درھم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ھندوستان میں ایک حرف اور گر کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر دام ھو گیا۔ سید سلیمان ندوی یہاں ایک حد تک اشتقاقیات کے اصولی تقاضوں کو نبھاتے ھوئے لفظوں کے ارتقائی مدارج کا کھوج لگا رھے ھیں لیکن کہیں کہیں وہ قیاس سے بھی کام لیتے ھیں جب وہ کہتے ھے " خیال ھوتا ھے" یا " میرا خیال ھے" یا غالباً یا " خیال جاتا ھے۔"

" تہذیب " میں سید سلیمان ندوی نے اردو کے ایسے الفاظ کی تحقیق کی ھے جو عربی فارسی سے اردو میں داخل ھوئے لیکن اردو نے انھیں من و عن قبول کرنے کے بجائے اپنے لسانی مزاج کے مطابق صوری، صوتی تبدیلی کے بعد اپنا لیا اور وقت کے ساتھ ان میں معنیاتی تبدیلیاں بھی رونما ھوئیں۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ھے کہ اھل اردو نے عربی، فارسی کے الفاظ میں ان حروف (آوازوں) کی جگہ وہ حروف استعمال کیے جن کو بولنے پر وہ قادر تھے۔ لیکن لفظی شکل و صورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات ھوئے ھیں۔ ھزاروں عربی اور فارسی کے ایسے لفظ ھیں جن کے معنی خالص ھندوستانی ھیں، جن کو عربی اور فارسی والے جانتے بھی نہیں، وہ اردو کے مزاج کے مطابق ڈھل گئے ھیں۔ جیسے عربی کا لفظ " خیر" صورت، شکل اور معنی بدل کر "خیریت" اور " خیرات" کی شکل میں اردو کا ھو گیا ھے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی نے اردو کے بہت سے الفاظ کی تحقیق کی ھے لیکن ان کی توجہ زیادہ تر معنیاتی تبدیلی پر مرکوز رھی ھے۔ وہ ماھر لسانیات نہ تھے اس لئے ان سے جدید اشتقاقیاتی اصول و قواعد کی پابندی کی توقع نہیں

کی جا سکتی۔ اس کے باوجود انہوں نے تحقیق الفاظ میں قیاسات کا سہارا لینے کے بجائے علمی انداز اختیار کیا ہے، جو لائق تحسین ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے نامور ماہر لسانیات ہیں۔ انہوں نے اشتقاقیات کی ذیل میں قابل قدر کام کیا ہے۔ " اردو زبان کا ارتقاء" (1956ء) میں انہوں نے اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کا جائزہ لیا ہے اور اردو کے ماخذ کا کھوج لگانے کے لئے اردو کے صرفی نحوی سرمائے کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ مباحث تاریخی و تقابلی لسانیات کی ذیل میں آتے ہیں اور لسانیات کے اس شعبے کی اساس اشتقاقیات ہے۔ اس حوالے سے " اردو زبان کا ارتقاء" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے لسانی سرمائے کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا ہے اور جدید اشتقاقیات کے اصول و قواعد کو ملحوظ رکھا ہے۔

" لسانی مسائل " (1962ء) ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں تحقیق الفاظ کے سلسلے کے مضامین بھی شامل ہیں۔ چند مضامین ایسے ہیں، جن کا موضوع اردو قواعد کے مسائل ہیں لیکن ان میں تحقیق الفاظ کے مباحث بھی شامل ہیں۔ " اردو الفاظ عامہ کی آپ بیتی " میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو الفاظ مطلقہ یا الفاظ عامہ کی ذیل میں حروف ضمائر اشارہ، ظروف، موصول، اور استفہام کے ارتقائی مدارج کی تحقیق کی ہے۔ " نے" کی سرگذشت اور " جیسا " کی سرگذشت" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان الفاظ کے ارتقائی مدارج کی تحقیق کرتے ہوئے ان کے ماخذ کا کھوج لگایا ہے۔

اشتقاقیات کے حوالے سے " لسانی مسائل " میں شامل مضمون " باورچی " یعنی چہ؟" میں لفظ " باورچی " کی تحقیق کی ہے اور اس کے ارتقائی مدارج کا سراغ لگایا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ فارسی سے اردو میں داخل ہوا ہے۔ لیکن اس کی اصل فارسی زبان نہیں ہے بلکہ یہ روسی سے ترکی کے ذریعے ایران کے راستے فارسی کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ " خودی میں

خدائی " میں ڈاکٹر سبزواری نے " خودی " اور " خدائی " کی تحقیق کی ہے اور ان دونوں لفظوں کو متحدالماخذ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان دونوں لفظوں کی اصل " خو" ہے جس کی نشان دہی "ہند ایرانی " عہد میں کی جا سکتی ہے۔ " روداد میز و میزبانی " میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لفظ " میز " اور " میزبان "کی تحقیق کی ہے اور " میزبان " کو فارسی الاصل قرار دیتے ہوئے اس کے ڈانڈے اوستائی سے ملائے ہیں۔

" اردو نامہ " کراچی ، کے مختلف شماروں میں اشتقاقیات کے موضوع پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضامین کا ایک سلسلہ " اشتقاقیات " کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان مضامین میں انہوں نے اشتقاقیات کے مسائل پر بحث کی ہے اور اردو کے چند الفاظ کا اشتقاقیاتی جائزہ لیا ہے۔

" اردو نامہ " کے شماروں کے حوالے سے ان مباحث کی فہرست درج ذیل ہے۔

الفاظ جن کا اشتقاقیاتی جائزہ لیا گیا ہے	شمارہ نمبر	سن اشاعت
1- ادھر، آپ	11	جنوری تا مارچ 1963ء
2- اب، اپا ہا، اپج، اتو، ارا بیگنی، آتون	12	اپریل تا جون 1963ء
3- اپرنا، اپارنا، انبا، اپٹ، اپٹنا،	13	جولائی تا ستمبر 1963ء
4- اتوار، اجایت، اچانک، اچھ	14	اکتوبر تا دسمبر 1963ء
5- اسارا، استی	15	جنوری تا مارچ 1964ء
6- اسماء عامہ	16	اپریل تا جون 1964ء
7- بھسکنا، بھس، بھساکو، بھساک	17	جولائی تا ستمبر 1964ء
8- بھنڈا پیرا، بھوتڈا،	18	اکتوبر تا دسمبر 1964ء
9- بست، بساط،	21	جولائی تا ستمبر 1965ء
10- پاتھنا یا تھاپنا،	22	دسمبر 1965ء
11- ڈکا	26	دسمبر 1966ء

-12	واو عطف	30	جنوری 1968ء
-13	شے	32	جولائی تا ستمبر 1968ء
-14	جمدھر، شبدبیز، ڈھنڈھ (ڈنڈ، ڈھنڈ، ڈنڈ)	33، 34	جون 1969ء
-15	آرام	43	جولائی 1972ء

-16 شمارہ نمبر 25 ، ستمبر 1966ء میں اشتقاقیات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

یہ اردو کے چند الفاظ ہی ہیں، جن کا ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اشتقاقیاتی جائزہ لیا ہے، لیکن انہوں نے جدید اشتقاقیات کے اصول و قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان الفاظ کے ماخذ کی تحقیق کی ہے اور ان کے ارتقائی مدارج کی سراغ رسی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لفظ کی صوتی ، صوری اور معنیاتی سطحوں کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے مضامین اشتقاقیاتی مطالعے کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مولوی احمد دین (سرگذشت الفاظ) اور سیّد سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی) کے بعد تحقیق الفاظ کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا انداز مطالعہ در حقیقت اردو اشتقاقیات کی روایت میں ایک اہم پیش رفت ہے اور اردو میں اشتقاقیاتی مطالعے کے سلسلے میں لسانیاتی نقطہ نظر کے حامل رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کے مضامین کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور انہوں نے اس سلسلے میں کوئی مستقل کتاب بھی نہیں لکھی لیکن ان کے یہ مضامین اشتقاقیات کے سلسلے میں ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے تحقیق الفاظ کی ذیل میں راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان مباحث میں اردو الفاظ کے ماخذ اور ارتقائی مدارج کی تحقیق کے اصول و قواعد کا ضمنی طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے زبان کے عہد بہ عہد ارتقائی ادوار پر نظر رکھنا اور صوتی تغیرات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ لسانی تغیرات کو نظر انداز کر کے کسی لفظ کا اشتقاقیاتی مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

لفظوں میں ظاہری مشابہت اور مماثلت ان کے مشترک الماخذ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی اس لئے اس سلسلے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اردو میں کچھ الفاظ مرکب ہیں لیکن مفرد استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ مرکبات کے باب میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اصلاً مرکب ہیں یا انہیں ترکیب دے کر مرکب کیا گیا ہے۔ اردو میں صوتی تقلیب کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس ذیل میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ قلب اردو کا عام رجحان نہیں ہے بول چال میں اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں، اس لئے اردو الفاظ کی اصل کا کھوج لگانے کے لیے تقلیب اصوات کے حوالے سے بھی جائزہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ اردو نے اپنے ارتقائی ادوار میں غیر آریائی زبانوں سے بھی استفادہ کیا ہے اگر ایک لفظ مثلاً اپ بھرنش، پراکرت یا قدیم ہند آریائی زبان میں بھی تھا اور کسی غیر آریائی زبان میں بھی، لیکن اردو نے وہ لفظ غیر آریائی زبان سے نہیں لیا تو اس کی اصلیت کا کھوج لگانے کے لیے اسے غیر آریائی زبان سے ماخوذ ٹھہرانے کے بجائے آریائی زبانوں میں اس کے ارتقاء کا سراغ لگانا چاہیے، کیوں کہ اردو میں ایسے الفاظ ہیں جو سنسکرت اور پراکرت کے واسطے سے اردو میں آئے اور رچ بس گئے۔ اشتقاقیات، الفاظ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لسانیات کے دیگر شعبوں سے مدد لیتی ہے۔ اس ذیل میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ لسانیات کی دوسری شاخوں کو نظر انداز کرنے کے بعد کسی لفظ کی اصل یا اس کا ماخذ دریافت نہیں ہو سکتا۔ الفاظ کی اصلیت کا سراغ لگاتے وقت قدم قدم پر زبان کے قواعد، اس کے مزاج کے مطابق صوتی تبدیلیوں اور ملتی جلتی زبانوں سے مدد لینا پڑتی ہے۔ اس لئے صوتیات، صرفیات اور تقابلی گرامر سے مدد لینا ضروری ہے۔

پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی کتاب " زبان و ادب " (1983ء) ان کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں شامل دو مضامین " لفظ اب کی تحقیق " اور " اب کی سرگذشت " میں لفظ " اب " کے ماخذ کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی تحقیق کا

انداز علمی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد ایک قیاس پر رکھی ہے اور یہ قیاس لسانیاتی نہیں ہے ۔ انہوں نے اس قیاس کو علمی انداز میں درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اشتقاقیات کے اصول و قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اس لئے انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے محل نظر ہیں۔

سیّد قدرت نقوی کا مضمون " لفظ صوفی کی تحقیق " اردو نامہ ، کراچی کے شمارہ 16 ، اپریل تا جون 1964ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے لفظ " صوفی " کے ماخذ کی تحقیق کرتے ہوئے، یہ ثابت کیا ہے کہ لفظ " صوفی " کا ماخذ یونانی زبان نہیں ہے بلکہ یہ لفظ عربی الاصل ہے اور اس کا ماخذ " صوف " ہے۔ انہوں نے اس لفظ کی تحقیق علمی انداز میں کی ہے اور تاریخی استدلال سے کام لیا ہے۔ انہوں نے لفظ " صوفی " کا ماخذ کی سراغ رسی کی ہے اس کے ارتقائی ادوار کی نشان دھی نہیں کی ہے۔ کسی لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے، ان کے خیال کے مطابق ، صوتی مشابہت اور معنوی مطابقت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ صوتی مشابہت اور معنوی مطابقت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کا تجزیہ کرنا چاہیے اور تاریخ پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

" متحد الاصل لسانی سرمایہ " سیّد قدرت نقوی کا مضمون ہے جو اردو نامہ، کراچی کے شمارہ 22، دسمبر 1965ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے ھند یورپی خاندان السنہ کے چند متحد الاصل الفاظ کی تحقیق کی ہے اور ان کے ماخذ اور ارتقائی مدارج کی نشان دھی کی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے اشتقاقیات کے اصول و قواعد کو ملحوظ رکھا ہے اور لفظ کی صوتی ، صوری اور معنیاتی سطحوں کا مطالعہ کر کے ان کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔

سیّد قدرت نقوی کا مضمون " تحقیق الفاظ " اردو نامہ، کراچی کے شمارہ 26 ،دسمبر 1966ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے ڈاکٹر سہیل بخاری کے مضمون "الفاظ کا مطالعہ" (مطبوعہ اوراق ، شمارہ ـ 1) کے تسامحات کا جائزہ لیا ہے اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے اس

نقطۂ نظر سے کہ شمالی ہند کی زبانیں دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے مضمون میں اردو کے جن الفاظ کو دراوڑی الاصل قرار دیا ہے، سیّد قدرت نقوی نے اشتقاقیاتی نقطۂ نظر سے ان کے ماخذ اور ارتقائی مدارج کی تحقیق کر کے انہیں ہند آریائی زبانوں کے الفاظ قرار دیا ہے۔ سیّد قدرت نقوی نے دقت نظر سے کام لیا ہے اور لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اشتقاقیات کے مسلمہ اصول و قواعد کے مطابق الفاظ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے قیاسی تصورات کو رد کیا ہے۔

عین الحق فریدکوٹی کا مضمون " اردو الفاظ کی اصل " اردو نامہ، کراچی کے شمارہ 25، ستمبر 1966ء ، میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو کو دراوڑی خاندان کی زبان قرار دے کر اردو الفاظ کی اصل کے ڈانڈے دراوڑی زبانوں سے ملائے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے چند الفاظ کی ظاہری مشابہت اور سطحی مماثلت سے دھوکا کھایا ہے اور مسلمہ نظریات کو جھٹلانے کے جوش میں غیر لسانیاتی طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے اس مضمون کے حاشیے میں عین الحق فریدکوٹی کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی ہے اور انہوں نے اردو کے جن الفاظ کو دراوڑی الاصل قرار دیا ہے، ان الفاظ کو اشتقاقیات کے مسلمہ اصول و قواعد کے مطابق ہند آریائی زبانوں کے الفاظ ثابت کیا ہے۔ عین الحق فریدکوٹی کا یہ مضمون قیاسی اشتقاقیات کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اردو اشتقاقیات کے مباحث کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اردو دان طبقے نے لسانیات کے اس اہم شعبے " اشتقاقیات " پر توجہ نہیں دی ہے حالاں کہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل پر طویل عرصے تک تحقیق کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس سے متعلق اشتقاقیات کے اہم شعبے کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور اب بھی اشتقاقیات کی ذیل میں اردو میں کوئی ایک بھی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ اردو اشتقاقیات کی روایت میں مولوی احمد دین

اور سیّد سلیمان ندوی کی تحقیقات علمی تو ہیں لفظ کی تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تحقیقات مضامین کی صورت میں ہیں اور بلاشبہ اردو اشتقاقیات کی روایت کا اہم سرمایہ ہیں لیکن اردو داں طبقے نے ان سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اس روایت میں سیّد قدرت نقوی کے اشتقاقیاتی کام اہم ہے لیکن انہوں نے بھی اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اشتقاقیات کی ذیل میں اردو کے ماہرین لسانیات کی تحقیقات پر مستشرقین اور ہندو ماہرین لسانیات کی تحقیقات کے اثرات نمایاں ہیں۔ مولوی احمد دین بی۔ اے نے پادری ٹرینچ سے استفادے کا اعتراف اپنی کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے جان بیمز، ٹرنر، چٹرجی، بھنڈاکر، بابو رام سکسینہ، اور شیام سندر داس سے استفادہ کیا ہے، جن کے حوالے انہوں نے " اردو زبان کا ارتقاء" میں اکثر مقامات پر دئیے ہیں۔

پانچواں : اشتقاقیات : حواشی / حوالہ جات

-1 مولانا سید سلیمان ندوی ، " بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق " مشمولہ نقوش سلیمانی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، 1939ء) ص 289

-2 پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ، (مستونگ، قلات پبلشرز، 1964ء) ص 13

-3 مولوی احمددین ، سرگذشت الفاظ، (لاہور، کتاب منزل، س ـ ن) ص 111

-4 ڈاکٹر شوکت سبزواری ، "اشتقاقیات" مشمولہ اردو نامہ، شمارہ ـ 14 ، اکتوبر تا دسمبر 1963ء، ص 76

-5 پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 204

-6 ایل ـ گراف، زبان اور زبانیں (1850ء) بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی ، " تاریخی لسانیات " مشمولہ : لسانی مباحث (کوئٹہ، قلات پبلشرز، 1991ء) ص 97

-7 وھٹنی، لسان، مطالعہ لسان، ص 55، بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی (ایضاً) ص 97

-8 پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ، (ایضاً) ص 208

-9 ایضاً ، ص 17

-10 وھٹنی ، لسان، مطالعہ لسان، ص 245، بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی ، زبان کا مطالعہ (ایضاً) ص 209

-11 پروفیسر خلیل صدیقی ، " تاریخی لسانیات" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 105، 106

-12 مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی (ایضاً) ص 289

-13 ایضاً ، ص 312

-14 ایضاً ، ص 328

-15 ایضاً ، ص 349

چھٹا باب

توضیحی لسانیات

=.=.=.=.=.=.=.=.=.=.=

لسانیات کا ایک اہم شعبہ " توضیحی لسانیات " (Descriptive Linguistics) ہے، جس میں ایک مخصوص عہد میں یا/ایک مخصوص منزل میں زبان کی ساخت، اس کے اجزائے ترکیبی اور ان کے باہمی تعلقات کا تجزیاتی اور توضیحی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ زبان کا نظام، صوتی، صرفی و نحوی اور معنیاتی نظاموں سے تشکیل پاتا ہے۔ توضیحی لسانیات زبان کے اجزائے ترکیبی میں صوتی عنصر کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور زبان کے صوتی نظام کا تجزیہ و توضیح کرتی ہے۔

اردو میں توضیحی لسانیات کے لیے کئی اصطلاحات مروج رہی ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے ابتداء میں اس کے لیے " بیانیہ یا تشریحی لسانیات " کی اصطلاح استعمال کی لیکن اب وہ "توضیحی لسانیات " کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ عتیق صدیقی اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں "توضیحی لسانیات " کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جب کہ ڈاکٹر گیان چند توضیحی لسانیات کے ساتھ " تجزیاتی لسانیات " کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں اور ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے " یک زمانی لسانیات " کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند توضیحی لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

> " زبان کا مطالعہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے (1) زمانے کے ایک مخصوص نقطے میں اور یہ نقطہ زمانہ حال ہی کا ہوتا ہے۔ (2) تاریخ کی رو میں عہد بہ عہد ارتقاء کو پیش نظر رکھ کر۔ ایک زبان کا ایک مخصوص منزل میں مطالعہ تجزیاتی لسانیات کہلاتا ہے۔ اسے توضیحی لسانیات بھی کہا جاتا ہے۔ زبان کا ایک

ڈھانچہ ہوتا ہے۔ یہ ڈھانچہ کیا ہے، زبان کے مختلف اجزائے ترکیبی اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ ۔ زبان کا ایک وقت میں مطالعہ کیا جائے تو اس کی ساخت اور ڈھانچے ہی کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور یہی بنیادی چیز ہے۔ " (1)

ڈاکٹر اقتدار حسین خاں توضیحی لسانیات کے بارے میں " یک زمانی لسانیات " کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" جب ہم زبان کا مطالعہ خالص لسانیاتی نقطہ نظر سے کرتے ہیں تو ہم اسے خالص لسانیات یا یک زمانی لسانیات کہتے ہیں۔ یک زمانی لسانیات میں ہم کسی ایک خاص زمانے کی زبان کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ " (2)

ڈاکٹر اقتدار حسین خاں توضیحی لسانیات کے متعلق لکھتے ہیں،

" توضیحی لسانیات میں زبان کی ساخت سے بحث ہوتی ہے جس کی نوعیت خالص توضیحی اور تجزیاتی ہوتی ہے۔ اس طرح ہم زبان کی ساخت کے تمام پیچ و خم کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ " (3)

ایچ ۔ اے۔ گلیسن (جونئیر) توضیحی لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے،

" توضیحی لسانیات ـــ یعنی وہ علم جس میں زبانوں کی اندرونی ساخت کے اعتبار سے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے طریقہ ہائے کار سے یہ ان معنی میں مختلف ہے کہ یہ انسانی تکلم کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ " (4)

" توضیحی لسانیات " کی تعریفوں (Definitions) اور اس کی وسعت و حدود کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا درست ہو گا کہ تکلّم کے عمل اور نتیجے کے اجزائے ترکیبی

کا تجزیاتی مطالعہ، توضیحی لسانیات کی جولاں گاہ ہے۔ اس ذیل میں اصوات کے اجزاء، خصائص و کیفیات ، تالیف و ترکیب کی صورتوں، ہئیتوں، وقوعی منصب، باہمی رشتوں اور وجہ انتخاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ گویا توضیحی لسانیات آوازوں، کلموں، جملوں اور کسی حد تک معنیات کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زبان کی صوتیاتی ، فونیمیاتی ، صرفی یا تشکیلی (Morphological) نحوی اور معنیاتی سطحوں پر مطالعہ کرتی ہے۔ صوتیات، فونیمیات، ساختیات، تشکیلیات (Morphology) ، نحو (Syntax) اور معنیات اس کے مختلف شعبے ہیں۔ پہلے دو زیادہ اہم ہیں۔ ہم یہاں انہی پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ بقیہ شعبوں کا جائزہ علاحدہ ابواب میں پیش کر دیا جائے گا۔

صوتیات (Phonetics) تکلمی آوازوں یا اصوات (Articulated Sounds or Phonos) کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔(5) ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق صوتیات میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاخ کسی ایک زبان تک محدود نہیں، اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے اور کسی ایک زبان یا بولی کی صوتیات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔(6) ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے صوتیات کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے۔ " اس میں ہم کسی زبان کی کل صوتوں کا مطالعہ کرتے ہیں نیز یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آوازیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور ان آوازوں ، مطالعے اور تقابلی جائزے کے لیے کس طرح درجہ بندی کر سکتے ہیں۔ " (7) وہ اس کے متعلق مزید لکھتے ہیں " صوتیات لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں ہم کسی زبان کی آوازوں کے مخارج کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں ہم منہ کے ان حصوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن سے ہم بولنے میں مدد لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ " (8)

پروفیسر خلیل صدیقی نے " صوتیات" کے مسائل و مباحث کی عمدہ توضیح کی ہے ۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اصوات کے سائنسی مطالعے کو " صوتیات" کہا جاتا ہے۔ صوتیات اصوات

کی ماہیت، نوعیت، صفات اور کیفیات سے بحث کرتی ہے اور وضع اصوات کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔
اس ذیل میں وہ لکھتے ہیں کہ

" صوتیات "، تکلمی آوازوں یا اصوات (Articulated Sounds or Phones)
کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ اس کے مستنبط اور منضبط اصولوں کا اطلاق تمام زبانوں پر کیا جا
سکتا ہے۔ اس میں اجزائے آواز یا وضع اصوات سے بھی بحث کی جاتی ہے اور آوازوں یا اصوات کی
ماہیت، نوعیت، صفات اور کیفیات سے بھی ۔ وضع اصوات کے ذیل میں ان کے مخارج یا " جوف دہن
یا منہ کے اندر کے خلاء کے وہ مقامات بھی آ جاتے ہیں، جہاں سے انہیں ادا کیا جاتا ہے۔ اس
سلسلے میں وہ اعضاء زیر بحث آتے ہیں، اجزائے آواز میں جن کا حصہ ہوتا ہے۔ ان میں وہ اعضاء
بھی ہوتے ہیں جو بدیہی طور پر آواز کے اجزاء کی بنیاد بنتے ہیں، اور وہ بھی جو بالواسطہ کوئی
نہ کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں " عضویات " کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ صوتیات
کے مطالعے کا رویہ توضیحی و تشریحی بھی ہوتا ہے اور تقسیمی اور درجہ بندی کا بھی ۔ درجہ
بندی مخارج کے لحاظ سے بھی کی جاتی ہے طرز ادا، نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے بھی ۔
آوازوں کی کیفیاتی، کمیاتی، امتدادی، طول و قصر، زیر و بم وغیرہ کی خصوصیات کا بھی جائزہ
لیا جاتا ہے۔ اصوات کی ترسیل اور موصولی بھی زیر بحث آتی ہیں، اس لئے طبیعات کی شاخ کا سہارا
بھی لیا جاتا ہے، جو " آواز " سے مختص ہے، جسے آواز کی طبیعات (Sound Physics) کہا
جاتا ہے۔ (9)

گفتگو یا بول چال کے عمل میں کئی قسم کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ بولنے سے پہلے
انسانی ذہن میں تصورات و خیالات کے پیدا ہونے سے لے کر انہیں اظہار کا جامہ پہنانے کے لیے
اصوات کے اجراء تک اور سامع کے کان تک اصوات کے پہنچنے اور اس کے ذہن کے پردے پر ان تصورات
و خیالات کے ابھرنے تک ان گنت عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ چناں چہ " صوتیات " میں اصوات کا مطالعہ
تین صورتوں میں ہوتا ہے کیوں کہ بول چال، عضویاتی، طبیعاتی اور نفسیاتی عوامل کی مرہون منت
ہوتی ہے ۔ ادائے صوت کی میکانیت، صوتی لہروں کی طبیعات اور سماعت کی میکانیت اور نفسیات

سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے اس حوالے سے اصوات کے مطالعے کی تین صورتوں کا تعین کیا ہے۔

1- اجزائے صوت کے میکانکی عمل، اعضائے صوت، مخارج ادا اور طریق کار

2- بات چیت سے پیدا ہونے والی صوتی لہروں، ان کی ترسیل، صوتی عناصر کی ماہیت، خصوصیات، نوعیت اور کیفیت کا مطالعہ

3- اعضائے سماعت، صوتی لہروں کی موصولی، کشف علامات (DECODE OF SYMBOLS) اور نفسیات ادراک کا مطالعہ ۔

اصوات کے مطالعے کی ان تین صورتوں کو ، 1- توضیحی یا تشریحی یا نطقی (ARTICULATOR) صوتیات ، 2- طبیعاتی یا کیفیاتی (ACCOUSTICS) صوتیات ، 3- سمعی (AUDITORY) صوتیات کہا جاتا ہے۔

صوتیات زبانوں کی اصوات کا مطالعہ کرتی ہے اور بہت سی زبانوں کی اصوات پر نظر رکھتی ہے۔ اس طرح اصوات کے اجرا اور مخارج کا تجزیہ کر کے تعمیم کرتی ہے اور ایسے اصول و قواعد وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام زبانوں پر کیا جا سکے۔ صوتیات کسی خاص زبان کے لسانی سانچوں اور نظام کی وضاحت نہیں کرتی ۔ پروفیسر خلیل صدیقی صوتیات کے مسائل اور دائرہ بحث کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں،

" صوتیات عام نطق انسانی کی وضع کردہ اصوات کے ادا، ترسیل اور موصولی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ اس کے پیش نظر کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی ۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ایک یا زیادہ زبانوں کو بنیاد بنا کر دوسری زبانوں میں متوازی مثالیں دیکھتی ہے۔ معلومہ زبانوں میں واقعی ادا ہونے والی اصوات پر نظر رکھتی ہے۔ ان کے طریق ادا اور مخارج کا تجزیہ کر کے تعمیم کرتی ہے۔ اسی

لئے اس کا اطلاق کم و بیش تمام زبانوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے کسی بھی زبان کی اصوات کے طریق ادا، مخارج اور ان کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ صوتیات، تکلمی عناصر یا صوتی اکائیوں کے طریق ادا اور مخارج وغیرہ کی بنیاد پر ان کی درجہ بندی اور شناخت، ان کے عام تکلمی اور نطقی سر چشموں کے حوالے سے تشریح و توضیح تو کرتی ہے لیکن وہ خاص زبان کے مستعمل لسانی سانچوں یا پیٹرن (PATTERN) ان کے امکانات اور نظام کی وضاحت نہیں کرتی۔ " (10)

توضیحی لسانیات کے جدید رجحانات کے زیر اثر لسانیات کے دو نئے شعبے فونیمیات (فونو لوجی یا فونیمکس۔ Phonemics) اور ساختیات (Structuralism) وجود میں آئے۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر توضیحی لسانیات سے ہے۔ فونیمیات میں فونیم کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کے مطابق ایک زبان میں اہم آوازیں یا تفاعلی اکائیاں محدود تعداد میں ہوتی ہیں۔ ان تفاعلی اکائیوں کو فونیم کہتے ہیں۔ انہوں نے فونیمیات کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ فونیمیات میں کسی زبان کی اہم تفاعلی آوازوں کو معلوم کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کرتے ہیں، انہوں نے فونیم کی تعریف یہ کی ہے کہ فونیم کسی زبان کی اہم آواز ہے۔ اہم کے معنی ہیں کہ اس فونیم کے ہونے یا نہ ہونے سے معنی میں فرق پڑ جائے۔(11)

ڈاکٹر گیان چند نے فونیمیات کے لیے " تجصوتیات " کی اصطلاح استعمال کی ہے جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اسے " تجز صوتیات " کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند فونیمیات کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں،

" تجصوتیات Phonemics : اس میں کسی ایک زبان کے صوتیں

Phonemics کا تعین کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی زیادہ سے زیادہ نزاکتیں دریافت کی جاتی ہیں لیکن تجصوتیات میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظر انداز کر کے صرف انہیں اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اصوات کی متعدد ذیلیات کی گروہ بندی کر کے انہیں کم از کم صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو Phonology بھی کہتے ہیں۔" (12)

ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے فونیمیات کی یہ تعریف کی ہے کہ

" اس علم کے تحت آوازوں کے عوامل کا تجزیہ کر کے ان کی بنیادی اور ذیلی شکلوں کا پتہ لگایا جاتا ہے۔۔۔۔ یہ زبان کی ان گنت آوازوں کو ان کے بنیادی کرداروں کے مطابق سمیٹ دیتی ہے۔" (13)

مغرب کے ماہرین فونیمیات نے فونیم کی توضیح کی ہے۔ نکولائی۔ ایس۔ ٹروبزکی نے " فونیم" کو صوتی تمثال قرار دیا ہے۔ لیو نارڈ بلوم فیلڈ صوتیہ (فونیم) کو متخالف و متمائز صوتی خصوصیت کی ایسی چھوٹی سی چھوٹی اکائی قرار دیتا ہے، جس سے کلموں کے ایک ہی صوتی سیاق و سباق میں معنی کا فرق و امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ روبنس فونیم کو مشابہ آوازوں کا ایسا زمرہ قرار دیتا ہے جو زبان کے دوسرے صوتی زمروں سے مختلف اور متمائز ہے۔ گلیسن جونیئر فونیم کو صوتیاتی اعتبار سے آوازوں کا ایسا گروہ قرار دیتا ہے جو کسی بولی یا زبان میں تقسیم کے بعض مخصوص انداز ظاہر کرتی ہوں۔

کسی زبان کے فونیمی تجزیے کے لیے ایسے الفاظ کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے جن میں آپس میں صرف ایک آواز کا فرق ہو۔ یہ الفاظ اقل ترین جوڑے (MINIMAL PAIRS) کہلاتے ہیں۔ دو یا زیادہ الفاظ میں جس ایک آواز سے معنی کا فرق رونما ہوتا ہے اس آواز کو اس زبان کی بنیادی آواز یا صوتیہ یا فونیم (PHONEMES) کہتے ہیں۔ اسی طرح اس زبان کے صوتی

نظام کا تجزیہ کرنے سے جو فونیم سامنے آتے ہیں، مخارج اور طریق ادا کے اعتبار سے ان کی ترتیب کو اس زبان کا فونیمیاتی نظام کہتے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی فونیمی تجزیے کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں،

" کسی زبان کے فونیمی تجزیے کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی آوازوں کو محدود، معین اور قطعی زمروں میں شناخت کیا جائے اور صوتیوں کو کسی نہ کسی صوتی ماحول میں متخالف و متمائز بتایا جائے۔ ایک کلمے کی کسی آواز کی بجائے دوسری آواز کے استعمال سے کلمے کا مفہوم بدل جائے تو دونوں آوازیں ایک دوسرے کی متخالف و متمائز کہلائیں گی اور صوتیہ متصور ہوں گی۔" (14)

کسی زبان کے صوتیوں (فونیم) کا تعین کرنے کے بعد ان کی امتیازی صوتی خصوصیات اور صوتی ہیئت کی توضیح و تشریح کرنے کے بعد اس زبان کے فونیمی نظام میں ان کے تفاعل اور منصب سے بحث کی جاتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی فونیمی تجزیے کے اس مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" فونیمیات میں فونیمی عناصر کی ہئیت اور ان کی عام صوتی ہئیت اور "ساخت" اور " نظام" میں ان کے منصب اور تفاعل سے بحث کی جاتی ہے۔" (15)

فونیمیات اور صوتیات کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا گیا ہے۔ فونیمیات، صوتیات سے اتنی مدد لیتی ہے کہ اسے صوتیات کا ایک حصہ بھی کہا گیا ہے اور فونیمیات کو اطلاقی صوتیات بھی کہا گیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے صوتیات اور فونیمیات کو زبان کے صوتی مواد کے مطالعے کے دو رویّے قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق صوتیات کا دائرہ بحث عام انسانی زبانوں پر محیط ہو جاتا ہے جب کہ فونیمیات کسی ایک زبان کے صوتی

مواد کو موضوع بناتی ہے۔ اگرچہ فونیمیات میں بحث کی شقیں صوتیات سے کچھ مختلف ہو جاتی ہیں لیکن صوتیوں کی توضیح و تشریح میں ان کی صوتی ماہیت اور خصوصیت کی وضاحت صوتیات کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی ۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ " فونیمیات " ایک طرح کی اطلاقی صوتیات ہے۔ " (16)

" ساختیات " ، لسانی ساخت کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے۔ " ساختیات " جدید توضیحی لسانیات کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مرکز بنی اور جدید لسانیات میں ساختیاتی نقطۂ نظر سے زبان کے مطالعے کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ " ساختیات " کو لسانیات کے ایک علیحدہ شعبے کی حیثیت حاصل ہو گئی ۔ اردو دنیا میں " ساختیات " پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے " ساختیات " کی مبادیات اور ساختیاتی نظریات کی توضیح و تشریح کی ہے، اس موضوع پر ان کا مقالہ " ساختیات " لسانی مباحث " (1991ء) میں شامل ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ساختیاتی تنقید کے حوالے سے " ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات " (1994ء) میں اظہار خیال کیا ہے۔ " ساختیات " اب چوں کہ لسانیات کے ایک علیحدہ شعبے کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے ساختیات کے حوالے سے اردو میں جتنا بھی کام ہوا ہے اس کا جائزہ ہمارے مقالے کے تیسرے باب میں لیا گیا ہے۔

<u>اردو میں توضیحی لسانیات (صوتیات، فونیمیات) کے مباحث :</u>

اردو دنیا میں توضیحی لسانیات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے اور اس سلسلے میں کچھ زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ اردو میں صوتیات کے مسائل و مباحث پر تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ البتہ اردو فونیمیات کی ذیل میں کچھ کام ہوا ہے۔ حال ہی میں صوتیات اور فونیمیات کی مبادیات پر، پروفیسر خلیل صدیقی کی ایک کتاب " آواز شناسی "(1993ء) شائع ہوئی ہے۔ عتیق صدیقی نے، ایچ ۔ اے۔ گلیسن (جونئیر) میں صوتیات اور فونیمیات کے

مسائل پر بحث کی گئی ہے اور انگریزی زبان کا فونیمی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب " اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ" (1991ء) میں اردو زبان کے صوتی نظام کا فونیمی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اردو میں توضیحی لسانیات کے سلسلے میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ۔ البتہ صوتیات اور فونیمیات کے سلسلے میں جستہ جستہ مضامین و مقالات ضرور لکھے گئے ہیں جو اردو زبان کے صوتی نظام کے فونیمی تجزیے کے مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی کتاب " آواز شناسی" (1993ء) میں صوتیات اور فونیمیات کی مبادیات کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر خلیل صدیقی نے زبانوں کے صوتیاتی مطالعے کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق زبان ، ماہیت، تالیف و ترکیب، صفات و کیفیات، وظائف و مناصب کے ناقابل تقسیم " کل " کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان کے متعدد پہلوؤں پر بھرپور گرفت اور مکمل تفہیم کے لیے اس کی ماہیت اور اندرونی عمل کو سمجھنے کے لیے زبان کے تجزیے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زبان کے اجزائے ترکیبی میں صوتی عنصر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس کی بدولت وہ اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لئے زبان کے تجزیاتی مطالعے میں اس کی صوتی سطح کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ زبان کی صوتی سطح کا تجزیہ صوریاتی یا قواعدی اور معنوی سطحوں پر مقدم ہے۔ در حقیقت زبان کا صوتی عنصر ہی زبان کا وسیلہ یا " میڈیم" ہے اور اظہار و ابلاغ کے لیے زبان " میڈیم" کی محتاج ہے۔ زبان کے " سمعی میڈیم" کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر خلیل صدیقی نے تکلمی آوازوں کے وسیلے کو زبان کا " سمعی میڈیم" قرار دیا ہے۔ تکلمی آوازوں کی ترکیبیں اور ڈھانچے، معنویت پا کر مجموعی طور پر زبان کہلاتے ہیں۔ گویا زبان تکلمی آوازوں کی ان مخصوص ترکیبوں ، اس کے سانچوں اور ڈھانچوں میں مضمر ہوتی ہے جنہیں تکلمی آوازیں تشکیل دیتی ہیں لہذا زبان کو " میڈیم" سے متمیز کیا جانا چاہیے۔ در حقیقت میڈیم یا تکلمی

آوازیں ھی وہ مواد ہے جس سے زبان کی ھیت تشکیل پاتی ہے۔ میڈیم کی اپنی ایک خود مختار حیثیت بھی ہے۔ اس لئے زبان کے " میڈیم" یا تکلمی آوازوں کی ماھیت اور خصوصیات کا تجزیاتی مطالعہ ایک علم یا سائنس کی حیثیت رکھتا ہے جو " صوتیات" کہلاتا ہے۔ " صوتیات" تکلمی آوازوں یا اصوات کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے نقطہ نظر کے مطابق زبان کی صوتی بنیادوں، ان کی ماھیت اور خصوصیات کو سمجھے بغیر زبان شناسی یا لسانیات کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ وضع اصوات یا تکلمی آوازوں کا اجرا، انسان کے اس لسانی بیوھار(Behaviour کی اساس ہے جو اس کے سماجی اور تہذیبی کردار میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ وضع اصوات میکانکی عمل ہے۔ اس کی میکانیت کے جائزے کے بغیر " صوتیات" نامکمل رہے گی۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے اصوات کے مطالعے کی تین صورتوں کا تعین کیا ہے، ان کے خیال کے مطابق زبان، مربوط و مسلسل تکلمی آوازوں یا اصوات کا مجموعہ ھی نہیں بلکہ اعصابی، عضلاتی اعمال و کیفیات کا ایک پیچیدہ لیکن مربوط اور مسلسل " بناؤ" بھی ہے۔ بول چال، عضویاتی، طبیعاتی اور نفسیاتی عوامل کی مرھون منت ھوتی ہے۔ ادائے صوت کی میکانیت، صوتی لہروں کی طبیعات اور سماعت کی میکانیت اور نفسیات سے اس کا تعلق ھوتا ہے جناں چہ اصوات کے مطالعے کی تین صورتیں ھو سکتی ھیں۔

1- اجرائے صوت کے میکانکی عمل، اعضائے صوت، مخارج اور طریق کار کا مطالعہ جسے توضیحی یا تشریحی یا نطقی (ARTICULATORY) یا وضعی یا ادائی صوتیات کہتے ھیں۔

2- بات چیت سے پیدا ھونے والی صوتی لہروں، ان کی ترسیل، صوتی عناصر کی ماھیت، خصوصیات، نوعیت اور کیفیت کا مطالعہ جسے طبیعاتی (ACCOUSTICS) صوتیات کہتے ھیں۔

3- اعضائے سماعت، صوتی لہروں کی موصولی، کشف علامات (DECODING

اور نفسیات ادراک کا مطالعہ جسے سمعی (AUDITORY) (OF SYMBOLS
صوتیات کہتے ہیں۔(17)

پروفیسر خلیل صدیقی نے اصوات کے مطالعے کی ان تین صورتوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے مناہج مطالعہ اور مسائل و مباحث کی توضیح کی ہے۔ ان کے خیال میں طبیعاتی اور سمعی صوتیات کی اہمیت کے باوجود زبان کے مطالعے کی ذیل میں ادائی یا توضیحی صوتیات کو ترجیح ملنی چاہیے اس لئے انہوں نے توضیحی صوتیات کے مسائل و مباحث کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے اعضائے صوت کی نشان دہی کر کے ان کے منصب اور وضع صوت میں ان کے کردار کی وضاحت کی ہے اور اصوات کے مخارج کی نشان دہی کر کے اصوات کے طریقۂ ادا کی توضیح بھی کی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی اصوات کی درجہ بندی اور شناخت کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصوات کی درجہ بندی مخارج ، مناہج ادا ، سانس کے بیرونی مخرج اور حجم کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور اصوات کی شناخت گمکوں (TONES) اور نواؤں (NOISE) کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے مصوتی اور مصمتی آوازوں کی شناخت ، تقسیم اور درجہ بندی کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ ان کے خیال میں مصوتوں کی تقسیم اور درجہ بندی اور شناخت کے سلسلے میں زبان کی حالت وقوع یا مفروضہ افقی اور عمودی محوروں کی سمتوں اور ہونٹوں کی حالت کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ تقسیم اور درجہ بندی کی یہ تین سمتیں مصوتی آوازوں کی شناخت کے لیے " سہ اصطلاحی " لیبل کا نظام مہیا کر دیتی ہیں۔

1- بند (CLOSE) / کھلے (OPEN) یا ترفیعی (HIGH) ، تنزیلی (LOW)
2- پچھلے یا پس (BACK) ، اگلے یا پیش (FRONT) اور 3- غیر مدّور (UN - ROUNDED) مدّور (ROUNDED) - (18) پروفیسر خلیل صدیقی نے مصمتی آوازوں کی تقسیم اور درجہ بندی اور شناخت کے طریقے کی وضاحت کی ہے۔ ان کے مطابق مصمتی آوازوں کی تقسیم کی ایک بنیاد صدا (VOICE) بنتی ہے۔ دوسری طریق ادا (MANNER OF

ARTICULATION) اور تیسری مخارج ۔ عموماً انھی کی اصطلاحوں سے انھیں شناخت اور ایک دوسرے سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ (19) پروفیسر خلیل صدیقی نے ان طریقوں کے مطابق مصوتی اور مصمتی اصوات کی تقسیم اور درجہ بندی کی ہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے طبیعاتی اور سمعی صوتیات کے مسائل و مباحث کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں طبیعاتی صوتیات اور سمعی صوتیات کے مباحث تقریباً مشترک ہیں۔ اس لئے انھیں ایک ہی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ طبیعاتی صوتیات میں اصوات کا مطالعہ ان کی صوتی خصوصیات کی بنا پر کیا جاتا ہے اور ان خصوصیات کی نشان دہی اور وضاحت کی جاتی ہے خواہ اصوات کسی طرح بھی پیدا ہوتی ہوں۔

" فونیمیات " کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر خلیل صدیقی نے " فونیم " کے مختلف نظریات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں اصوات کے مطالعے کا ایک رویّہ فونیمی ہے۔ فونیمیات میں فونیم (صوتیے) کے تصور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ صوتیے کے نظریوں میں دو نظریے اہم ہیں ایک کے مطابق صوتیہ تصور یا خیال ہے۔ یہ صوتیے کا ذہنیاتی یا نفسیاتی نظریہ ہے۔ دوسرا طبیعاتی نظریہ ہے جس کے مطابق کسی زبان کی تشکیلی آوازوں کے تقطیعی عناصر کا ایک زمرہ " فونیم " کہلاتا ہے۔(20) ڈینل جونز کا نظریہ فونیم خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے مطابق زبان کے جن عناصر کو آوازوں سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ در اصل مماثل و مشابہ آوازوں کے چھوٹے چھوٹے گھرانے ہیں۔ یہ آوازیں مخصوص محل وقوع اور صوتی سیاق و سباق میں صوتی بل یا ضرہ (STRESS) صوتی امتداد (LENGTH) اور لب و لہجہ سے مشروط ہوتی ہیں اور ایک ہی اہم آواز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ اہم آواز اپنے گھرانے کی آوازوں میں نمایاں اور ممتاز ہوتی ہے اور تمام آوازوں کا عاد اعظم کہلا سکتی ہے یا گھرانے کی دو انتہائی آوازوں کے درمیانی یا اوسط سمجھی جا سکتی ہے۔ اسی کو صوتیے کا معیار کہا جاتا ہے۔
" صوتیے گھرانے " کے عام ارکان کے لیے فرعی یا ذیلی آواز (ایلو فون) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

فونیمیات میں کسی زبان میں اقل ترین فرق کی بنیاد پر اقلی جوڑوں کی مدد سے اس زبان کے بنیادی صوتی عناصر یا صوتیے (فونیم) کی شناخت کر کے ان کی درجہ بندی کی جاتا ہے۔ کسی زبان کے فونیمی تجزیے میں زبان کے مابہ الامتیاز لسانی سانچوں کا تجزیہ اور ان کی وضاحت " ساخت " اور" نظام " کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ ساخت کے تجزیے میں " سلیبل " کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فونیمیات میں زبانوں کے مصوتی اور مصمتی نظام کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے اور ان تمام صوتیوں کے محل استعمال سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے فونیمیات کے ان تمام مسائل و مباحث سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے اردو کے مصمتی نظام کا خاکہ بھی دیا ہے۔ (21)

" آواز شناسی " کے تیسرے اور چوتھے باب میں قدیم ہند میں صوتیات کی روایت اور عربی صوتیات کی روایت کا اجمالی جائزہ لے کر مغرب میں صوتیات کی روایت پر ان کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے تجزیے کے مطابق مغربی لسانیات نے قدیم ہند میں صوتیات کی روایت سے استفادہ کیا ہے لیکن عربی صوتیات سے اغماض برتا ہے۔ آواز شناسی کے آخری باب میں اردو میں لسانیاتی اصطلاحات کی عدم یکسانیت کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے تمام مروّجہ لسانیاتی اصطلاحات کا تنقیدی جائزہ لے کر ان میں یکسانیت اور ہمواری پیدا کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

" آواز شناسی " میں توضیحی لسانیات کے دو اہم شعبوں " صوتیات " اور " فونیمیات " کے بنیادی مسائل و مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی مبادیات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے زبانوں کے صوتیاتی اور فونیمیاتی مطالعے کے مناہج کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ ان مباحث میں پروفیسر خلیل صدیقی نے اردو زبان سے مثالیں دی ہیں، جس سے صوتیات اور فونیمیات کے مسائل و مباحث اور مناہج مطالعہ کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اردو میں اس اہم موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے

اس کتاب کی قدر و قیمت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

عتیق صدیقی نے ایچ ۔ اے ۔ گلیسن (جونیر) کی کتاب NTRODUCTION TO DESCRIPTIVE LINGUISTICS (1955) کا ترجمہ " توضیحی لسانیات ۔ ایک ت
کے عنوان سے کیا ہےجو 1979ء میں کتابی صورت میں ترقی اردو بورڈ ، نئی دھلی نے شائ
اس کتاب میں گلیسن (جونیر) نے توضیحی لسانیات اور اس کے شعبوں ، صوتیات، فونیمیات اور
مارفیمیات کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیا ہے اور انگریزی فونیمیات اور انگریزی مارفیمیات ک
اچھی توضیح و تشریح کی ہے۔

ایچ ۔ اے۔ گلیسن (جونیر) نے صوتیات کے مباحث میں تلفظی صوتیات (CULATORY PHONETICS) کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے، زبان کے صوتیاتی مطالعے کے مناہج کی توض
ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے تلفظی صوتیات کے لیے، نطقی یا وضعی یا ادائی صوتیات کی اص
استعمال کی تھی ۔ انہوں نے تکلمی آوازوں کی تقسیم کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے تقسیم ک
تین بنیادوں کی نشان دھی کی تھی (آواز شناسی ۔ 1993ء) گلیسن جونیر نے بھی ان تی
بنیادوں کے حوالے سے تکلمی آوازوں کی تقسیم کی وضاحت کی ہے۔ اس کے مطابق تکلمی آواز
کی صوتی تقسیم، 1۔ حنجرہ کا عمل، 2۔ مخرج، 3۔ مخرج کی نوعیت یا طریق ادا کی بنی
پر کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے خیال میں یہ تنہا لسانیاتی کاموں کے لیے آوازوں کو صحت و
قطعیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتیں، اس لئے مخرج کی کسی ثانوی خصوصیت کو بیان کرنا ھ
ہے جو ان تین صوتی حدود میں پیدا شدہ آواز میں قدرے ترمیم کر دیتی ہیں۔(22) گلیسن
(جونیر) نے ان ثانوی خصوصیات اور کیفیات کی وضاحت کرتے ہوئے مصمتی آوازوں کی تقسیم اور
درجہ بندی کی ہے۔ اس نے مصوتوں کی تقسیم اور درجہ بندی کی وضاحت بھی کی ہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے اصوات کے مطالعے کی تین صورتوں کی وضاحت کی تھی ۔ جس ک
مطابق پہلی صورت کو ادائی صوتیات، دوسری کو طبیعاتی صوتیات اور تیسری کو سمعی صوتیات

کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ پہلی اور دوسری صورت کو ایک دوسرے کا تتمہ سمجھتے ہوئے طبیعاتی یا کیفیاتی صوتیات کہا جاتا ہے۔ گلیسن (جونیر) نے اسے سمعی صوتیات قرار دیا ہے اور اس کے مباحث میں اصوات کے مطالعے کی دونوں صورتوں کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔

گلیسن (جونیر) نے فونیمیات کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیتے ہوئے، فونیم اور فونیمی نظام کی وضاحت کی ہے اور فونیمی تجزیے کے مناہج مطالعۃ کی توضیح کی ہے۔ ان مباحث میں اس نے انگریزی فونیمیات کی تشریح بھی کی ہے۔ فونیم اور ذیلی فونیم کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ فونیم ایسی آوازوں کا گروہ ہے جو صوتیاتی اعتبار سے مشابہ ہوں اور زیر غور بولی یا زبان میں تقسیم کے بعض مخصوص انداز ظاہر کرتی ہوں۔ (23) کوئی آواز یا آوازوں کا ذیلی گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ تکملی تقسیم میں ہو اور دونوں مل کر ایک فونیم بناتے ہوں، ذیلی فونیم (allophone) کہلاتا ہے۔(24)

توضیحی لسانیات کی ایک شعبے کی حیثیت میں " مارفیمیات " کو اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں مارفیمیات کے لیے " تشکیلات " کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے اور اسے " صرف " کے ذیل میں زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اردو میں مارفیمیات کے سلسلے میں جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے کام نہیں ہوا ہے۔ گلیسن (جونیر) نے مارفیمیات کے مباحث میں مارفیم اور ذیلی مارفیم کی وضاحت کی ہے۔ اس نے مارفیم اور ذیلی مارفیم کی شناخت اور ذیلی مارفیموں کی درجہ بندی کے مسائل اور مطالعے کے مناہج کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ان مباحث میں اس نے انگریزی مارفیمیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس نے مارفیم کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مارفیم، فونیموں کے مختصر زنجیرے ہوتے ہیں۔ یہ زنجیرے بہ تکرار استعمال ہوتے ہیں لیکن بہ تکرار استعمال ہونے والے تمام زنجیرے مارفیم نہیں ہوتے۔ مارفیم بیانیہ نظام کی وہ سب سے چھوٹی اکائی ہے جسے معنوی نظام کے کسی بھی حصے کے ساتھ بلاواسطہ مربوط کیا جا سکے۔(25)

گلیسن (جونیر) نے کلام میں صوتی تغیرات کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوتی تبدیلیاں باقاعدہ ہوتی ہیں اور صوتی تبدیلی ذیلی فونیم کو مجموعی طور پر مسلسل متاثر کرتی رہتی ہیں۔ فونیمی تبدیلی عام طور پر مسلسل صوتی تبدیلی کا مجموعی نتیجہ ہوتی ہے۔ صوتی تبدیلی ایک سماجی عمل ہے جو مخصوص اسباب و عوامل کے زیر اثر رونما ہوتی ہے۔ ان مباحث میں گلیسن (جونیر) نے زبان اور بولی کے رشتے اور جغرافیائی بولیوں کی حیثیت کی بھی وضاحت کی ہے۔

گلیسن (جونیر) نے کلام اور تحریر یا رسم الخط کے تعلق پر بھی بحث کی ہے۔ اس نے تکلم اور تحریر کے گہرے اور قریبی رشتے کی نشان دہی کرتے ہوئے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تحریر زبان کی ساخت کی ایک سطح رسم الخط ہے۔ ہر رسم الخط کی ایک ساخت ہوتی ہے، جس کی اپنی منسوب ساختوں (بالعموم اصوات سے تعلق) کے ساتھ تعلق کی بھی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ رسم الخط میں ترسیموں(graphemes) کا مجموعہ اور ان کے استعمال کے خصائص شامل ہوتے ہیں۔ ہر ترسیمہ میں ایک یا زیادہ ذیلی ترسیمے (allographs) ہو سکتے ہیں۔ ترسیموں اور ذیلی ترسیموں کا تحریری نظام میں وہی مقام ہوتا ہے، جو علم اصوات میں فونیموں اور ذیلی فونیموں کا ہوتا ہے۔ نیز ترسیموں اور ذیلی ترسیموں میں وہی تعلق ہوتا ہے جو فونیموں اور ذیلی فونیموں میں ہے۔(26) گلیسن(جونیر) کے خیال میں ایسا کوئی بھی ابجدی رسم الخط دریافت نہیں ہوا جو اپنے سے متعلق بول چال کی زبان کے تمام صوتی ذیلی نظاموں کو ظاہر کرتا ہو۔

ایچ - اے- گلیسن (جونیر) کی کتاب " توضیحی لسانیات" ایسے تمام مسائل و مباحث کو سمیٹے ہوئے ہے، جن کا تعلق صوتیات ، فونیمیات اور مارفیمیات سے ہے۔ اس میں انگریزی فونیمیا اور مارفیمیات کی اچھی تشریح کی گئی ہے جو اردو میں ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مثال یا ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے راهنمائی حاصل کر کے اردو اور دیگر

علاقائی زبانوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں توضیحی لسانیات کے مختلف شعبوں کی مبادیات اور مناہج مطالعہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ گلیسن (جونیر) کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے اور گلیسن (جونیر) کے مطابق نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ تاہم اردو میں اس کی قدر و قیمت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں توضیحی لسانیات کے مختلف موضوعات کی اچھی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

"اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ" (1991ء) میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کے صوتی نظام کا، اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی روشنی میں، جائزہ لیا ہے اور اس کا تقابل ویدک، سنسکرت، فارسی اور انگریزی کے صوتی نظاموں سے کیا ہے۔ انہوں نے فارسی اور ویدک سنسکرت اور پراکرت کے صوتی نظاموں کا تقابل بھی کیا ہے۔ زبانوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں لاکھوں سال پہلے وضع کی گئیں اور زبانیں وضع کرنے والے سیانوں نے ان کے اصول و قواعد بھی وضع کر دئیے۔ لاکھوں سال سے زبانیں اپنی اصل حالت میں اور ان کے اصول و قواعد بھی اپنی اصل صورت میں چلے آ رہے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے، لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زبان بازار ہاٹ میں چھلتی چھٹتی، بنتی سنورتی قدیم سے اب تک آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ وہ زبان کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اپنے ان قیاسات اور مفروضات کا اظہار، بہ تکرار، اپنی تمام کتابوں میں کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کا خیال ہے کہ اردو کی آوازیں ذاتی ہیں، الفاظ نجی ہیں، معنی اپنے ہیں اور نظامیات (گرامر) کے اصول فطری اور داخلی ہیں اور اردو کے سرمایے میں سے کچھ بھی مانگے تانگے کا نہیں ہے۔ انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے، اردو کی بنیادی آوازوں کو سر (مصوتے) اور اسر (مصمتے) میں تقسیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کے کل مصوتے (سر) چوبیس ہیں۔ بارہ طویل مصوتے اور بارہ مختصر مصوتے۔ ان میں انہوں نے انفی مصوتوں کو بھی شامل کیا ہے۔ انہوں نے اردو میں آوازوں کے استعمال کے انیس قاعدوں

کی فہرست دی ہے، جو ان کے خیال میں ابتداء سے مقرر کئے گئے ہیں اور اب تک چل رہے ہیں۔
ان کا خیال ہے کہ صوتی تغیرات کے جو اسباب یوروپی ماہرین لسانیات بتاتے ہیں وہ بالکل غلط ہیں اور محض مفروضوں کے سوا کچھ نہیں اور حقیقت میں تکثیر معنی، لہجہ اور نظامیات یعنی گرامر صوتی تغیرات کے اصل اسباب ہیں۔ تکثیر معنی سے مراد معنی کی وسعت و کثرت ہے۔ واضعین زبان نے اردو کی بنیادی آوازوں کے لئے جو اصول و قواعد وضع کئے ان کی رو سے زندگی کے کثیر تعداد مطالب ادا کرنے کے لیے زبان میں صوتی تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان قاعدوں میں صوتی تبادل، اندراج و سقوط، تقلید اور توازن خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ صوتی تغیرات کا دوسرا سبب "لہجہ" ہے، جس کی مختلف صورتیں، زور، ادغام، دہراٹ، تسہیل اور تخفیف ہیں۔ صوتی تغیرات کا تیسرا سبب "نظامیات یا گرامر" ہے، اس کی تین صورتیں، امالہ، فعل میانہ اور فعلی واسطہ ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کے صوتی نظام کا ویدک، سنسکرت فارسی اور انگریزی کے صوتی نظاموں سے تقابل کیا ہے اور فارسی، ویدک اور سنسکرت اور پراکرت کے صوتی نظاموں کا تقابل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے پہلے اور دوسرے باب میں انھوں نے تقابلی لسانیات کے مروّجہ نظریات اور مناہج مطالعہ کو اپنے مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر غلط قرار دیا ہے۔ انھوں نے اردو کا دیگر زبانوں کے صوتی نظاموں سے تقابل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو آریائی نہیں دراوڑی زبان ہے اور اردو کا صوتی نظام دراوڑی زبانوں کے صوتی نظام سے مماثل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پراکرتیں ہندوستان کی دیسی زبانیں ہیں جو اس وقت بولی جا رہی تھیں جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے خیال میں صوتی تبادل لفظ سازی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ کسی خارجی عامل یا حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود زبان کے مزاج اور سرشت میں شامل ہے اور زبان کے فروغ اور ارتقاء کا ضامن ہے۔ مغربی ماہرین لسانیات نے ٹھوکر کھائی

اور صوتی تبادل کو تاریخ زبان کا ایک حادثہ ، زبان کے سفر کا ایک موڑ اور خارجی اثر کا نتیجہ سمجھ بیٹھے اور اس کی وجہ ان کا غیر لسانی انداز فکر ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کتاب میں اردو کے صوتی نظام کا اپنے مخصوص نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کر کے اردو صوتیوں کی شناخت، تقسیم اور درجہ بندی کر کے اردو کے صوتی نظام کی توضیح نہیں کی ہے جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے اشتباہ ہوتا ہے، انہوں نے اپنے مفروضات اور قیاسات سے اس کتاب کے مباحث کو اس طرح الجھا دیا ہے کہ اکثر خلط مبحث اور تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے جن کلموں کی مثالیں دی ہیں ان میں سے اکثر کلمے اردو میں مروّج ہی نہیں ہیں۔ اس سے ان کا استدلال کمزور پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری مغربی ماہرین لسانیات کو غلط قرار دیتے ہیں اور مسلمہ لسانیاتی نظریات کو رد کرتے ہیں لیکن اس کے لئے ان کے پاس کافی دلائل نہیں ہیں۔ وہ دوسرے ماہرین لسانیات کے انداز فکر کو غیر لسانی کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا/اپنا انداز فکر غیر لسانی ہے اور انکے تصورات کی حیثیت " ایجاد بندہ " سے زیادہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے توضیحی لسانیات کے ذیل میں اردو زبان سے متعلق صوتیاتی اور فونیمیاتی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی البتہ مضامین و مقالات کی صورت میں ان مسائل سے بحث کی ہے۔ ان کا ایک مضمون " اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب " ان کے مضامین کے مجموعے " اردو زبان و ادب " (1954ء) میں شامل ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو کے حروف تہجی کو صوتیاتی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اردو حروف تہجی کی موجودہ انداز پر ترتیب صوتیاتی نقطۂ نظر سے ناقابل معافی ہے۔ اس لئے انہوں نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اردو کے مصمتوں اور مصوتوں کو نئے انداز میں ترتیب دیا ہے۔ اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ اردو حروف کی صوتیاتی ترتیب دیوناگری رسم الخط کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، جو ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم الخط ہے۔

اردو حروف یا آوازوں کی یہ ترتیب مخرج کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ اس میں عربی کی دخیل آوازوں کو شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے خیال میں خالص صوتیاتی نقطہ نظر سے یہ آوازیں اردو والوں کے لیے بے معنی ہیں۔ فونیمیاتی نقطہ نظر سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اقل ترین معنوی فرق کی بنیاد پر یہ عربی آوازیں اردو کے فونیمیاتی نظام کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے حروف علت کے عنوان سے اردو کے مصوتوں کو، جو تعداد میں دس ہیں، ہندی رسم الخط کے انداز پر ترتیب دیا ہے۔ اردو حروف تہجی کی ترتیب کا یہ انداز قبول عام حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے کہ ہر رسم الخط کی ایک مخصوص ساخت ہوتی ہے، جس میں حروف تہجی اور اصوات میں ایک تعلق ~~ہوتا ہے،~~ گیا ہے۔ جس کی بنیاد روایات ہوتی ہیں۔ اردو کے لیے جو رسم الخط اختیار کیا / وہ عربی اور فارسی رسم الخط کی توسیع شدہ صورت ہے۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب بھی اسی صورت میں اختیار کر لی گئی۔ زبان اور رسم الخط کے روایتی تعلق کی بنیادوں پر یہی صورت قبول عام کا درجہ حاصل کر گئی۔ انگریزی زبان اور اس کے رسم الخط کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ انگریزی حروف تہجی کی ترتیب صوتیاتی نقطہ نظر سے غلط سہی، قبول عام کا درجہ حاصل کر کے زبان اور رسم الخط کے تعلق کی روایات کا حصہ بن چکی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نقطہ نظر صوتیاتی اعتبار سے درست سہی، لیکن اسے قبول عام اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ اردو زبان اور رسم الخط کے تعلق کی روایات کا حصہ نہ بن جائے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون " اردو صوتیات کا خاکہ" اردوئے معلیٰ، لسانیات نمبر شمارہ 4-5 جلد سوم، میں شائع ہوا۔ یہی مضمون ان کے مضامین کے مجموعے " مقدمات شعر و زبان " (1966ء) میں شامل ہے۔ اور " مقالات مسعود " (1989ء) میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔ تینوں جگہ اس مضمون کا متن ایک جیسا ہے اور اس میں ترمیم و اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو کے صوتی نظام کا جائزہ لیا ہے لیکن ان مباحث میں اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ انہوں نے اردو کے دس بنیادی مصوتوں

کی نشان دہی کی ہے، ان کے خیال میں تمام مصوتے ہند آریائی ہیں اور تعداد و نوعیت کے اعتبار سے فارسی اور عربی کے مصوتوں سے کافی مختلف ہیں۔ انہوں نے اردو کے سینتیس مصمتوں کی نشان دہی کی ہے ان کے خیال میں اردو کے مصمتوں میں ہندی، فارسی اور عربی آوازوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اردو کے مصمتوں میں سے ذ، ض، ط، ظ، ث، ص اور ح کو خارج کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ حروف عربی سے لئے گئے ہیں اور ہمارے حروف تہجی کے نظام کے لیے پیر تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت مردہ لاشوں کی سی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے اس نقطۂ نظر سے ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر خلیل صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اختلاف کیا ہے اور اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کر کے ان کے دلائل کو رد کیا ہے۔ ہمارے خیال میں فونیمیاتی نقطۂ نظر سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس مضمون میں اردو کی انفی آوازوں، اردو کی کوز آوازوں یا معکوسی آوازوں، اور اردو کے نفسی مصمتوں یا ہائیہ آوازوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی خصوصیات اور اردو حروف تہجی میں ان کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ اردو کا صوتی مزاج مصمتی خوشوں کے خلاف ہے اردو الفاظ کے شروع میں آنے والے مصمتی خوشوں کو اپنے مزاج کے مطابق توڑ لیتی ہے البتہ الفاظ کے آخر میں آنے والے مصمتی خوشوں کو قبول کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مقالہ " اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ" انگریزی زبان میں ان کے تحقیقی مقالے " A Phonetic and Phonological Study of the word in Urdu " کا اردو ترجمہ ہے، جس کے مترجم ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ہیں۔ یہ مقالہ انگریزی میں 51-1950ء میں تحریر کیا گیا اور اس کا اردو میں ترجمہ 1986ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کتاب " مقالات مسعود "

(1989ء) میں بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اصل مقالے سے پہلے مقدمے میں عروضی تجز صوتیات کی توضیح کی ہے جو مقالے کے مباحث کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس مقالے میں لفظ کی تعریف اور حدبندی کرتے ہوئے یہ وضاحت کی ہے کہ لفظ کی اکائیوں کے تعین کے لیے دو اصول، 1۔ تجز صوتیاتی اور، 2۔ نحوی، بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو لفظ کی صوتیاتی اور تجز صوتیاتی ساخت کے مطالعے کے لیے جملے کو صوت ارکان سے مطابقت رکھنے والے اجزاء میں تقسیم کرنا ہو گا۔ اس ذیل میں انہوں نے لفظ اور صوت رکن کی صوتیاتی اور تجز صوتیاتی ساخت کی وضاحت کی ہے۔ اردو لفظ کی تجز صوتیاتی ساخت کے مباحث میں انہوں نے اردو لفظوں میں انفیت، معکوسیت کے مسائل کی توضیح کی ہے۔ انہوں نے کمیت کی عروضیات یعنی مصوتوں اور مصمتوں کی طوالت اور اختصار پر بھی بحث کی ہے۔ صوتی امتیاز کے سلسلے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اردو کے منفرد الفاظ میں صوتی امتیاز کوئی بہت زیادہ نمایاں خصوصیت نہیں ہے، کیوں کہ یہ بامعنی نہیں ہے، لیکن ایسے الفاظ میں جو ایک سے زیادہ صوت ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں کوئی ایک صوت رکن ایسا ضرور ہوتا ہے جو دوسرے تمام صوت ارکان سے ممیز ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے مباحث میں انہوں نے اردو لفظ کے صوتی امتیاز کو تین زمروں میں ، 1۔ دو صوت رکنی الفاظ، 2۔ تین صوت رکنی الفاظ ،3۔ تین سے زیادہ صوت رکنی الفاظ، تقسیم کر کے صوتی امتیاز کے اصول وضع کئے ہیں۔ مربوطیے کی عروضیات کے مباحث میں انہوں نے اردو الفاظ کی اہم خصوصیات مصوتی تسلسل، وسط مصوتی تداخل، تشدید ، ہائیت اور مسموعیت اور غیر مسموعیت، کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تشدید یا مصمتوں کا دھرا پن اردو زبان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ہائیت بھی ہندوستان کی دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح اردو کی اہم خصوصیت ہے۔ اسی طرح انہوں نے مسموعیت اور غیر مسموعیت کو اردو کی اہم خصوصیت قرار دیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو لفظ کا صوتیاتی اور عروضی تجز صوتیاتی تجزیہ علمی اور سائنسی انداز میں کیا

ہے اور اردو کے لسانی مزاج اور صوتی خصوصیات کی اچھی توضیح کی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے تاریخی و تقابلی لسانیات کے مسائل و مباحث پر خصوصی توجہ دی اور اردو کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کو اپنی لسانیاتی تحقیق کا مرکز شقل بنایا۔ اسی حوالے سے انہوں نے صوتیاتی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان کا ایک مضمون "اردو زبان کا ایک صوتی رجحان" (1962ء) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو کے ایک اہم صوتی رجحان کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے ارتقائی سلسلے کی کڑیوں کا سراغ لگایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پراکرت مشدد کلمات کے مقابل اردو میں دو طرح کے کلمے ہیں۔ کچھ مخفف ہیں اور کچھ مسہل۔ اس سے اردو کے ایک صوتی رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ پراکرت میں جو حروف مشدد تھے اردو میں وہ مخفف ہیں۔ یہ اردو کا تسہیلی رجحان ہے جس کی تین سطحیں ہیں، 1۔ پراکرت مشدد حروف کی تسہیل، 2۔ تخفیف اور 3۔ تشدید۔ ان کے خیال میں اردو میں یہ تسہیلی رجحان بڑی باقاعدگی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

"اردو لسانیات" (1966ء) ڈاکٹر شوکت سبزواری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے لسانیات کے مختلف موضوعات پر لکھے۔ ان میں سے پانچ مضامین میں صوتیات اور فونیمیات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ "اردو کی ساخت اور سرشت" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کے صوتی خصوصیات کی وضاحت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کی مصمت آوازیں واضح، نمایاں اور جلی ہیں۔ ہائیہ کا وجود اردو کی صوتی خصوصیت ہے۔ اردو نے "ر" اور "ل" میں امتیاز باقی رکھا ہے البتہ اردو میں قدیم "و" قریب قریب ہر جگہ "ب" سے بدل گیا ہے۔ اردو کے صوتی نظام میں خالص عربی اور فارسی آوازیں بھی شامل ہو گئی ہیں، جن کا فرق و امتیاز باقی رکھا گیا ہے۔ اردو کے مصوتے جو تعداد میں دس ہیں، سہل بھی ہیں اور سادہ بھی۔ اردو کا صوتی نظام پیچیدہ نہیں بلکہ سادہ ہے۔ یہ اردو کے صوتی نظام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

"نظام اصوات و علامات" (27) میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے فونیمیاتی نقطہ نظر سے

اردو کے صوتی نظام کی وضاحت کی ھے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اردو حروف تہجی کا
صوتیات سے پوری طرح ہم آہنگ ھے اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ھے۔ انہوں نے اردو کی
آوازوں کے لیے مروّجہ حروف کو ان کی فطرت کے عین مطابق قرار دیا ھے۔ انہوں نے اس اعترا
بھی رد کیا ھے کہ اردو میں دخیل خالص عربی اور فارسی آوازیں اردو رسم الخط کے خارج
جائیں۔ ان کا یہ خیال درست ھے کہ یہ آوازیں فونیمیاتی نقطۂ نظر سے اردو کے صوتی نظا
جزو ھیں اور انہیں فونیم کی حیثیت حاصل ھے۔ انہوں نے اردو کے مصمتوں اور مصوتوں
دھی کر کے ان کی خصوصیات کا جائزہ لیا ھے۔ " اردو صوتیے" میں ڈاکٹر شوکت سبزواری ن
(فونیم) کی شناخت کے مناھج کی توضیح کرتے ہوئے اردو کے صوتیوں کے مسائل کا جائزہ
اردو کے ان صوتیوں پر، جو عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ اردو میں شامل ہوئے ھیں، ی
کیا جاتا ھے کہ یہ اردو میں ہم صوت آوازیں ھیں، لہٰذا انہیں اردو حروف تہجی کے نظام
خارج کر دینا چاھیے ۔ اس مضمون میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان آوازوں کا فونیمیاتی تجز
کے مذکورہ نقطہ نظر کو غلط قرار دیا ھے اور یہ ثابت کیا ھے کہ یہ آوازیں اردو کے صوتیے
یہ مضمون اردو نامہ کے شمارہ نمبر 15 ، جون تا مارچ 1964ء میں شامل ھے۔ یہ مضمون ڈ
گوپی چند نارنگ کے مضمون " اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں " کے جواب میں لکھا گیا ھ
اردو نامہ کے شمارہ نمبر 14 ، اکتوبر تا دسمبر 1963ء میں شائع ہوا تھا۔

ھائیہ آوازوں سے متعلق مسائل پر، ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے دو مضامین " نظا
اصوات و علامات" اور " اردو صوتیے" میں اجمالی بحث کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے
" ھائیہ آوازیں " میں تفصیل سے بحث کی ھے اور اردو میں سترہ ھائیہ آوازوں اور علامتوں
نشان دھی کر کے ان کی خصوصیات کی وضاحت کی ھے۔ ان کا خیال ھے کہ ھائیہ آوازوں کا
تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاھر ہوتا ھے کہ ھائیہ آوازیں مفرد یا بسیط نہیں ھیں بلکہ یہ مخل
آوازیں ھیں یا زیادہ سے زیادہ ان آوازوں کو مخلوط بمنزلہ مفرد قرار دیا جا سکتا ھے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ایک مضمون " اردو مصوتے اور ان کی صفات" اردو نامہ کے شمارہ 27، مارچ 1967ء میں شائع ہوا۔ ان کا یہ مضمون ان کے کسی بھی مجموعہ مضامین میں شامل نہیں ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو کے مصوتوں کی تعداد چودہ بتائی ہے جب کہ اپنے ایک مضمون " اردو کی ساخت اور سرشت" میں انہوں نے اردو مصوتوں کی تعداد دس بتائی تھی۔ در حقیقت اس مضمون میں انہوں نے اردو مصوتوں کے حوالے سے سرسری بحث کی تھی جب کہ " اردو مصوتے اور ان کی صفات" میں انہوں نے اردو کے مصوتی نظام کا فونیمیاتی نقطۂ نظر سے تفصیل سے جائزہ لے کر اردو مصوتوں کی شناخت، تقسیم اور درجہ بندی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کے صوتی نظام کا گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اردو مصوتے چودہ ہیں۔ دس بنیادی ہیں، جو اردو کے صوتی نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور چار ذیلی یا تحتی ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو مصوتوں کی خصوصیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے توضیحی لسانیات کے سلسلے میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے اور اس ذیل میں جستہ جستہ مضامین کی صورت میں اظہار خیال کیا ہے، لیکن ان مباحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس سلسلے میں مستقل کتاب لکھتے تو یقیناً اردو میں توضیحی لسانیات کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہوتا ۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توضیحی لسانیات کی ذیل میں صوتیات اور فونیمیات کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی مستقل کتاب تو تصنیف نہیں کی البتہ ان کے مجموعہ مضامین " ادب و لسانیات" (1972ء) میں شامل دو مضامین میں صوتیات اور اردو فونیمیات کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔

" صوتی تغیرات" کے مباحث میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے زبانوں اور بولیوں کے لسانی رشتوں اور زبانوں کے آغاز و ارتقاء کے مسائل کو سمجھنے کے لیے صوتی تغیرات و تصرفات کے

مطالعے کی اہمیت کی نشان دھی کرتے ہوئے صوتی تغیرات کے مسائل کا جائزہ لے کر ان اسباب و عوامل کی وضاحت کی ہے جو صوتی تغیرات کا سبب بنتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صوتی تغیرات کی ذیل میں جغرافیائی ماحول، علاقائی خصوصیات، انسانی آلات صوت میں فرق، بولنے والوں کی سہل پسندی، یا تقلیل محنت کے رجحان، نقل لسانی، بولیوں یا زبانوں کا طاپ، ناقص سماعت اور جغرافیائی بعد، وہ اہم ترین اسباب و عوامل ہیں، جن کے اثرات سے زبانوں میں صوتی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ مضمون سہ ماہی " فنون " لاہور میں 1966ء میں بھی شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا معرکتہ الآرا مضمون " اردو کا صوتی نظام" ہے۔ یہ " توسیعی خطبہ" ہے جو پنجاب یونیورسٹی میں 1966ء میں دیا گیا اور مقالے کی صورت میں " ادب و لسانیات" (1970ء) میں شامل ہوا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اردو کے صوتی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کی بنیادی آوازوں (صوتیوں یا فونیم) کا تجزیہ کر کے ان کی شناخت، تقسیم اور درجہ بندی کی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے صدائی صوتیات یا طبیعاتی صوتیات (ACCOUSTIC PHONETICS) کے مسائل کا بھی اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے فونیمیات کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے فونیمی تجزیے کے مناہج مطالعہ کی توضیح کی ہے اور اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی زبان میں کسی صوتیہ کے تعین کے لیے اہم ترین بنیاد تضاد یا تقابل ہے اسی بنیاد پر انہوں نے اردو صوتیوں کی شناخت کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اردو بولنے والا اپنے آلات صوت کی مدد سے آوازوں کی ایک غیر محدود تعداد سے چند صوتیوں کو استعمال کرتا ہے اور یہی صوتیے گویا اردو کے صوتی عناصر (PHONETIC ELEMENTS) ہیں۔ ان صوتی عناصر کا تجزیہ کرکے انہوں نے اردو کے بیالیس مصمتے (حروف صحیحہ) دس مصوتے اور دس انفیائی مصوتے شناخت کئے ہیں۔ ان میں انہوں نے ایک شدت اور ایک فراقی یا اتصالی صوتیے کا اضافہ کر کے اردو کے کل چونسٹھ صوتیوں کا تعین

کیا ہے۔ اردو کے صوتیوں کی شناخت کرنے کے بعد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ان کی تقسیم اور درجہ بندی بھی کی ہے۔ اس مقالے کے آخر میں انہوں نے اردو کی رکنی ساخت کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ ان مباحث کے حوالے سے ان کا مقالہ اردو فونیمیات کے مباحث میں ایک معتبر اور وقیع حیثیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے توضیحی لسانیات کی ذیل میں اردو فونیمیات کے مختلف مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی کتاب " اردو لسانیات" (1990ء) میں شامل پانچ مضامین اردو فونیمیات کے مختلف مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ " اردو فونیمیات" میں انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کرتے ہوئے، اردو میں فونیموں کی کل تعداد اٹھاون قرار دی ہے، جن میں سے اڑتالیس قطعہ دار (SEGMENTAL) اور دس غیر قطعہ دار (SUPRA SEGMENTAL) ہیں۔ قطعہ دار فونیموں میں سینتیس مصمتے اور دس مصوتے اور ایک نیم مصوتہ ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو فونیموں کی شناخت نہیں کی ہے بلکہ ایک اعتبار سے فونیموں کی شناخت کے عمل سے آگے تقسیم اور درجہ بندی سے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ انہوں نے اردو فونیموں کی تقسیم اور درجہ بندی کرتے ہوئے ان کی ذیلی شکلوں اور صوتی خصوصیات کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ان مباحث کے حوالے سے ان کا یہ مضمون لسانیاتی تحقیق کا حق ادا کرتا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا نہایت جامع انداز میں فونیمیاتی تجزیہ کیا ہے۔

" اردو فونیم تقسیمیات" میں ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو میں فونیموں کی الفاظ میں ترتیب، رکنوں کی ساخت، مصمتی خوشوں کی قسموں اور فونیموں کی تقسیم کے مسائل سے بحث کی ہے۔ " فونیم تقسیمیات" ، فونیمیات ہی کی ذیلی شاخ ہے، جس میں کسی زبان کے فونیموں کی الفاظ میں ترتیب اور رکنوں کی ساخت کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو فونیمیات میں رکنوں کی ساخت کا جائزہ لیتے ہوئے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو فونیمیات میں رکن ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک رکن صرف ایک مصوتے پر مشتمل ہوتا ہے

جس کے شروع یا آخر میں ایک یا ایک سے زائد مصمتے آ سکتے ھیں۔ اردو میں رکن اپنے شروع میں دو یا زیادہ مصمتوں کے خوشوں کی اجازت نہیں دیتا۔ شروع کے خوشے عام طور پر مصمتے اور نیم مصوتے پر مشتمل ھوتے ھیں۔ دو مصمتوں کے خوشے ایک رکن میں لفظ کے درمیان یا آخر میں آتے ھیں۔ انھوں نے رکنوں کی ساخت کی مختلف قسموں، یک رکنی ساخت، دو رکنی ساخت، سہ رکنی ساخت، چہار رکنی ساخت اور پانچ رکنی ساخت کی وضاحت مثالوں کے ساتھ کی ھے۔ انھوں نے فونیموں کی تقسیم کا جائزہ لیتے ھوئے، یہ خیال ظاھر کیا ھے کہ اردو میں بعض فونیم ایسے ھیں جو لفظ کی مخصوص پوزیشنوں میں آتے ھیں جب کہ دوسرے فونیم ھر جگہ آ سکتے ھیں۔ انھوں نے مصمتی خوشوں کی تعریف ان الفاظ میں کی ھے کہ مختلف مصمتوں کا کوئی ایسا سلسلہ جو بنا کسی صوتی رکاوٹ کے ایک ھی رکن کے ساتھ ادا ھوں، مصمتوں کا خوشہ کہلاتا ھے، انھوں نے اردو کے مصمتی خوشوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ھے۔

" اردو میں مرکب الفاظ کی ساخت " میں ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے مارفیمات کے حوالے سے اردو کے مرکب الفاظ کی ساخت کا تجزیہ کیا ھے۔ ان کا خیال ھے کہ تشکیلیات کی اصطلاح میں زبان کی چھوٹی بامعنی آزاد اکائی کو لفظ کہتے ھیں۔ ساخت کے اعتبار سے اردو میں ایسی اکائیوں کی تین قسمیں ھیں ۔ یعنی سادہ، پیچیدہ اور مرکب، سادہ لفظ آزاد تشکیلیہ یا ایک آزاد مارفیم ھوتا ھے۔ پیچیدہ اکائیوں کی ساخت آزاد مارفیم اور ایک یا زیادہ پابند مارفیم یعنی سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے تشکیل پاتی ھے۔ مرکب الفاظ دو یا تین آزاد مارفیموں یا ان مارفیموں کے ساتھ ایک یا زیادہ پابند مارفیموں کے مجموعے سے تشکیل پاتی ھے۔ انھوں نے مرکب الفاظ کو غیر تصریفی اور تصریفی مرکب میں تقسیم کر کے ان کی ساخت کے اعتبار سے درجہ بندی کی ھے اور مرکب اسماء، مرکب صفات، مرکب ظروف اور امدادی افعال کا تفصیل سے جائزہ لیا ھے۔

" کرخنداری اردو کی صوتی ساخت " میں ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو کی " کرخنداری بولی " کا جو دھلی میں بولی جاتی ھے، صوتیاتی جائزہ لیا ھے۔ انھوں نے اردو

کے مقابلے میں کرخنداری کے صوتی نظام کی مختلف سطحوں میں فرق اور صرفی یا مارفیمیاتی سطح پر متعدد تبدیلیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے، ان کا جائزہ لیا ہے اور فونیم تقسیمات کے اعتبار سے کرخنداری کی اہم خصوصیات، رکنوں کی ساخت، رکنوں میں بل کا عمل، کرخنداری فونیموں کی تقسیم اور فونیموں کے خوشوں کی ساخت کا مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے " شہر پونا کی اردو کی صوتی ساخت" میں اردو کی ایک بولی کا، جو پونا شہر میں بولی جاتی ہے اور " دکنی اردو" کہلاتی ہے، صوتیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں انہوں نے پونا شہر کی " دکنی اردو" کی صوتی خصوصیات کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور معیاری اردو اور پونا شہر میں بولی جانے والی اردو کے صوتی عناصر کا تقابلی جائزہ لے کر دونوں کے صوتی نظام کی مختلف سطحوں پر فرق اور مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں کے ان مضامین میں اردو فونیمیات کے مختلف مسائل کا دقت نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ انہوں نے اردو اور اس کی مختلف بولیوں کے صوتی نظام کا گہرا مطالعہ کر کے اور ان کے صوتی عناصر کا تجزیہ کر کے، اخذ کردہ نتائج کی لسانیاتی توضیح کی ہے۔ اردو اور اس کی مختلف بولیوں کا مطالعہ اس انداز میں، اس سے پہلے نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کرخنداری بولی کا صوتیاتی مطالعہ کیا ہے لیکن ان کا مقالہ انگریزی میں ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں کے یہ مضامین اس اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ اردو زبان اور اس کی مختلف بولیوں کے صوتیاتی مطالعے کا ایک ایسا ماڈل یا نمونہ ہیں، جن سے راہنمائی حاصل کر کے اردو اور دیگر علاقائی زبانوں اور ان کی مختلف بولیوں کا صوتیاتی اور فونیمیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی کتاب " اردو کی لسانی تشکیل " (1985ء) میں شامل دو مضامین میں اردو کی صوتیاتی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ " اردو کی معکوس آوازیں اور ان کا ارتقا "

اور جدید ہند آریائی دور میں ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اختتام تک اردو کی موجودہ تمام آوازوں کا ارتقاء عمل میں آ چکا تھا۔ اس دوران اردو کی دو اپنی آوازوں / ڑ/ اور / ڑھ / کا ارتقاء بھی عمل میں آیا۔ یہ آوازیں سنسکرت اور پراکرتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اردو کی معکوسی یا کوز آوازوں، اور ہکار آوازوں کا ارتقاء خالص ہند آریائی سے ہوا ہے۔ معکوسی آوازوں کا سلسلہ دیسی زبانوں (دراوڑی) سے جا ملتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو کی معکوسی آوازوں / ٹ، ڈ، ڑ/ اور / ٹھ، ڈھ، ڑھ / کی اقلی جوڑوں کی مدد سے شناخت کرنے کے بعد سنسکرت، پراکرت اور اردو سے مثالیں دے کر، ان کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لیا ہے۔

" سترھویں صدی کی اردو ۔ چند صوتیاتی خصوصیات " ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے شمالی ہند میں سترھویں صدی کی شعری تخلیقات، بکٹ کہانی (محمد افضل) ، عاشور نامہ (روشن علی) ، وفات نامہ بی‌بی فاطمہ (اسمٰعیل امروہی) اور خالق باری (ضیاء الدین خسرو) کے حوالے سے سترھویں صدی کی اردو کی صوتیاتی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سترھویں صدی کے دوران ہکار اور غیر ہکار مصمتوں کا ارتقاء پوری طرح عمل میں آ چکا تھا لیکن ان کے لکھنے میں بے اعتدالی کی روش عام پائی جاتی تھی ۔ اس دور میں ہکاریت بعض الفاظ میں تقلیب صوت کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ سترھویں صدی کی اردو میں مصوتوں کی انفیت کا رجحان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس دور میں بعض ایسے مصمتے جو مشدّد نہیں ہیں، مشدّد کر لئے جاتے ہیں۔ سترھویں صدی کی اردو کا ایک صوتی رجحان اضافۂ صوت اور تخفیف صوت ہے۔ اس میں مصمتی خوشوں کو توڑ کر دونوں مصمتوں کے درمیان ایک مصوتے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے برعکس تخفیف صوت یا متحرک کو ساکن میں تبدیل کر دینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ سترھویں صدی کی اردو میں طویل مصوتوں کو مختصر مصوتوں میں تبدیل کر دینے کا رجحان بھی ملتا ہے اور اس کے برخلاف مختصر مصوتوں کی طویل مصوتوں میں تبدیلی کا رجحان بہت کم

ہے۔ اس دور کی اردو کی ایک اہم صوتی خصوصیت مصمتی تبادل ہے، جس میں ایک مصمتے کو دوسرے مصمتے سے بدل دیا جاتا ہے، یہ عمل بعض عربی فارسی الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کا خیال ہے کہ سترھویں صدی کی اردو کی بیشتر صوتیاتی خصوصیات کا رشتہ پراکرت اور اپ بھرنش، بالخصوص شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ اردو کی قدیم لسانی خصوصیات معدوم ہوتی گئیں اور جدید اردو کا نکھرا ہوا روپ سامنے آ گیا۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے " اردو سندھی کے لسانی روابط " (1987ء) کے ایک باب " صوتیات کا اشتراک " میں اردو اور سندھی کے صوتیاتی نظاموں کا جائزہ لیتے ہوئے اقل ترین جوڑوں کے سیٹوں کی مدد سے اردو اور سندھی کی بنیادی آوازوں یا صوتیوں کی شناخت کی ہے اور ان کی صوتی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی تقسیم اور درجہ بندی کی ہے۔ انہوں نے سندھی کے چھ مخصوص مصمتوں کی نشان دھی بھی کی ہے۔ ان مباحث میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی توجہ اردو اور سندھی کے صوتی نظاموں کے فونیمیاتی تجزیے کے بجائے دونوں زبانوں کے صوتی نظاموں کے مشترک اور مماثل پہلوؤں پر رہی ہے۔

توضیحی لسانیات کے مسائل و مباحث کے حوالے سے اردو کے مختلف ماہرین لسانیات نے جستہ جستہ مضامین کی صورت میں اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو فونیمیات کے مسائل سے " اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں " (مشمولہ : اردو نامہ، شمارہ نمبر 14، اکتوبر تا دسمبر 1963ء) میں بحث کی ہے۔ انہوں نے اقل ترین جوڑوں کی مدد سے اردو کے اکتالیس فونیموں کی شناخت کی ہے۔ انہوں نے عربی کی دخیل آوازوں کو اردو کی ہم صوت آوازیں قرار دے کر انہیں اردو فونیموں سے خارج کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے مضمون " اردو کے صوتیے " (مشمولہ : اردو نامہ ، شمارہ : 15، جنوری یا مارچ 1964ء) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، ان کا یہ مضمون " اردو لسانیات " میں شامل ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون میں اردو کی ھائیہ آوازوں یا ھکار آوازوں کو اردو فونیم تو قرار دیا ھے لیکن اس خیال سے کہ اردو فونیموں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی ، ھائیہ آوازوں کو اردو فونیموں میں شامل نہیں کیا ھے۔

ڈاکٹر گیان چند نے " اردو کی آوازیں " (مشمولہ : اردو نامہ : شمارہ 16 ، اپریل تا جون 1964ء) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نقطۂ نظر سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ھے۔ ان کا ایک مضمون " اردو کی آوازیں " رسالہ " اردو ادب "، علی گڑھ، شمارہ ۔4۔ بابت 1961ء میں شائع ھوا، جس میں ڈاکٹر گیان چند نے اردو کی بنیادی آوازوں کا تجزیہ کیا تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون " اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں " میں ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔ ڈاکٹر گیان چند کا مضمون " اردو کی آوازیں " (مشمولہ اردونامہ) اس مضمون کا جواب ھے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر گیان چند کے اعتراضات کا جواب " اردو کی آوازیں " (مشمولہ : اردو نامہ، شمارہ : 25، ستمبر 1965ء) میں دیا ھے۔ ان مباحث کا مرکز و محور اردو کی ھم صوت دخیل آوازوں اور ھائیہ آوازوں کے مسائل ھیں۔ تینوں حضرات نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ھے۔ جہاں تک ھائیہ آوازوں کا تعلق ھے، اردو کے تمام ماھرین لسانیات انھیں اردو کی بنیادی آوازوں کی حیثیت سے فونیم کا درجہ دیتے ھیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نقطہ نظر صحیح نہیں ھے۔ اردو کی ھم صوت آوازوں کا معاملہ ذرا مختلف ھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ڈاکٹر اقتدار حسین خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ انھیں اردو فونیم کا درجہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، پروفیسر خلیل صدیقی اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی انھیں اردو فونیم کا درجہ دیتے ھیں۔ اوّل الذکر ماھرین لسانیات کا تعلق بھارت سے ھے، موخر الذکر پاکستان سے تعلق رکھتے ھیں۔ اس لئے ھمارے خیال میں اس بحث میں نقطہ نظر کا نہیں رویوں کا اختلاف ھے۔ بھارت کے اردو دانش ور اردو کو عربی فارسی کے اثر سے آزاد کرنا چاھتے

ہیں۔ پاکستان کے دانشور اردو کا تعلق عربی فارسی سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم صوت آوازوں کا مسئلہ صرف اردو کا مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کی ہر وہ زبان جس نے دوسری زبانوں سے لسانی استفادہ کیا ہے یا اثرات قبول کئے ہیں اور دخیل الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اس قسم کے مسائل سے دوچار رہی ہے۔ انگریزی کی مثال سامنے ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر خلیل صدیقی (لسانی مباحث ـ 1991ء) نے تفصیل سے وضاحت کی ہے، جس کی روشنی میں بھارت کے اردو ماہرین لسانیات کا یہ موقف زیادہ وزن نہیں رکھتا ہے کہ اردو کی ہم صوت آوازیں اردو فونیم کا درجہ نہیں رکھتیں ہیں۔

شاہدہ تسنیم صدیقی نے " اردو کی آوازیں " (مشمولہ : اردو نامہ : شمارہ : 26، دسمبر 1966ء) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مذکورہ مضمون کا جواب دیا ہے، انہوں نے ایسے اقلی جوڑوں کی فہرست دی ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کی ہم صوت آوازیں اردو فونیم کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے " اردو آوازیں " (مشمولہ : اردو نامہ ، شمارہ :30 جنوری 1968ء) میں شاہدہ تسنیم صدیقی کے موقف کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا خیال ہے شاہدہ تسنیم صدیقی نے اقلی جوڑوں کی جو مثالیں دی ہیں ان میں حروف کا فرق ہے اصوات کا فرق نہیں ہے لہذا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نقطۂ نظر درست تسلیم کر لینا چاہیے۔

سید اے۔ ایس۔ خیال بخاری کے مضمون " پشتو کی بنیادی آوازیں ـ صوتیے" (مشمولہ : اردو نامہ، شمارہ21، جولائی تا ستمبر 1965ء) میں پشتو کی بنیادی آوازوں کی شناخت اقل ترین جوڑوں کی مدد سے کرنے کے بجائے پشتو کے چند صوتیوں کی محض نشان دہی کر دی گئی ہے۔ سید خیال بخاری نے اصل مسئلے کا جائزہ لینے کے بجائے اپنی بحث کا مرکز و محور اس مسئلے کو بنایا ہے کہ عربی کی دخیل آوازوں کو، جو اردو کی ہم صوت آوازیں بھی کہلاتی ہیں، اردو اور پشتو کی بنیادی آوازیں قرار دینا چاہیے یا نہیں اور پھر کسی نتیجے تک پہنچے بغیر فیصلہ اردو کے ماہرین لسانیات پر چھوڑ دیا ہے۔

اردو میں توضیحی لسانیات کے مباحث کے جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کے ماہرین لسانیات نے توضیحی لسانیات کے مسائل پر کسی قدر توجہ دی ہے اور اس ذیل میں صوتیات کے حوالے سے کم اور اردو فونیمیات کے حوالے زیادہ کام ہوا ہے، جب کہ توضیحی لسانیات کے دیگر شعبوں ساختیات، مارفیمیات معنیات اور نحو پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ فونیمیات کے سلسلے میں بھی صرف اردو فونیمیات کے حوالے سے ہی کچھ کام ہوا ہے، اور دیگر علاقائی زبانوں اور بولیوں کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دنیا میں توضیحی لسانیات کے مختلف شعبوں کے مسائل و مباحث پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے اور زبانوں کا مطالعہ صوتیاتی، فونیمیاتی، ساختیاتی، مارفیمیاتی، نحویاتی اور معنیاتی حوالوں سے ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو داں طبقہ اور خصوصاً اردو کے ماہرین لسانیات علاقائی زبانوں اور بولیوں کا مطالعہ توضیحی لسانیات کے حوالے سے کریں۔

اردو میں توضیحی لسانیات کے سلسلے میں بنیادی مسائل و مباحث کے حوالے سے توضیحی لسانیات کی مبادیات پر، پروفیسر خلیل صدیقی کی کتاب " آواز شناسی " خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں اور ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے بھی توضیحی لسانیات کے بنیادی مسائل پر مضامین کی صورت میں اجمالی بحث کی ہے۔ لیکن مستقل کتاب کی حیثیت میں " آواز شناسی " ہی کو اہم مقام حاصل ہے۔ گلیسن (جونیئر) کی کتاب کا ترجمہ "توضیحی لسانیات" (مترجم عتیق صدیقی) بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں توضیحی لسانیات کے مسائل و مباحث کی اچھی توضیح کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب میں " اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ" ان کے مخصوص نقطۂ نظر کی تشریح کی گئی ہے۔ اسے اردو میں توضیحی لسانیات کی روایت میں اضافہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توضیحی لسانیات کے مسائل پر جستہ جستہ مضامین کی صورت اظہار خیال کیا ہے ان کا علمی مرتبہ اور لسانیاتی شعور کسی مستقل تصنیف کا متقاضی تھا۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں

نے اردو فونیمیات کے سلسلے میں چند مضامین لکھے اور ان میں اردو فونیمیات کے مسائل و مباحث کی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔ اردو میں توضیحی لسانیات کے سلسلے میں جتنا کام ہوا ہے، وہ مقدار کے اعتبار سے بہت کم ہے البتہ معیار کے حوالے سے بہت اچھا ہے، اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو کے ماہرین لسانیات اس روایت میں اضافہ کریں گے۔

اردو دنیا میں جتنے بھی ماہرین لسانیات نے توضیحی لسانیات کے مختلف موضوعات پر بشمول صوتیات اور فونیمیات کے، کام کیا ہے، انہوں نے مغربی ماہرین لسانیات سے استفادہ کیا ہے۔ بنیادی مسائل، مناہج مطالعہ اور اصول و قواعد کے سلسلے میں بھی اور اردو فونیمیات کے مباحث میں اردو کا فونیمیاتی تجزیہ کرتے ہوئے بھی، مغربی ماہرین لسانیات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کر کے، اردو کے فونیم کی شناخت، ان کی درجہ بندی اور ان کی صوتی خصوصیات کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں مغربی ماہرین لسانیات کی مثالوں اور نمونوں (ماڈل) کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اردو کے ماہرین لسانیات نے مغربی ماہرین لسانیات سے بھرپور استفادہ کیا ہے لیکن سنسکرت اور عربی میں صوتیات کی روایت سے جزوی استفادہ کیا ہے۔ اردو لسانیات میں سنسکرت سے بہت کم اور عربی سے زیادہ تر اصطلاحات مستعار لی گئی ہیں لیکن سنسکرت اور عربی میں صوتیات کی روایت پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔

چھٹا باب : توضیحی لسانیات : حواشی / حوالہ جات

1- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (نئی دہلی ، ترقی اردو بیورو، 1991ء) ص 25

2- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، لسانیات کے بنیادی اصول(علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1985ء) ص 16

3- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات (نئی دہلی ، اردو محل پبلی کیشنز، 1990ء) ص 34

4- ایچ ۔ اے۔ گلیسن(جونیر) ، دیباچہ مشمولہ توضیحی لسانیات، مترجم عتیق صدیقی ، (نئی دہلی ، ترقی اردو بورڈ ، 1979ء) ، ص

5- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی ، (ملتان ، بیکن بکس، 1993ء) ص 17

6- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 27

7- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، لسانیات کے بنیادی اصول (ایضاً) ص 16

8- ایضاً ، ص 21

9- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی (ایضاً) ص 17، 18

10- ایضاً ، ص 97، 98

11- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، لسانیات کے بنیادی اصول (ایضاً) ص 42

12- ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے (ایضاً) ص 27

13- ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو لسانیات (ایضاً) ص 46

14- پروفیسر خلیل صدیقی ، " صوتیہ (فونیم) اور فونیمیات " مشمولہ لسانی مباحث (کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز، 1991ء) ص 185

15- ایضاً ، ص 187

16- ایضاً ، ص 197، 198

17- پروفیسر خلیل صدیقی ، آواز شناسی (ایضاً) ص 23،22

18- ایضاً ، ص 56

19- ایضاً ، ص 67

20- ایضاً ، ص 102

21- آواز شناسی کا یہ حصہ جس میں فونیمات کے مسائل و مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی کتاب " لسانی مباحث" (1991ء) میں ایک مقالے کی صورت میں شامل ہے۔ " آواز شناسی " میں یہ مقالہ چند ترامیم کے بعد شامل کیا گیا ہے، جس کا حوالہ پروفیسر خلیل صدیقی نے دیا ہے۔

22- ایچ ۔ اے۔ گلیسن (جونیر) ، توضیحی لسانیات،(مترجم عتیق صدیقی) (ایضاً) ص 281

23- ایضاً ، ص 307

24- ایضاً ، ص 310

25- ایضاً ، ص 65،62،61

26- ایضاً ، ص 472

27- ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ مضمون " اردو نظام اصوات و علامات " کے عنوان سے صحیفہ کے شمارہ ۔ 23، اپریل 1963ء میں شائع ہوا تھا۔

ساتواں باب

قواعد (صرف و نحو)

زبان کا ایک مخصوص لسانی مزاج ہوتا ہے جو اس کے لسانی نظام کا تعین کرتا ہے۔
کا لسانی نظام اس کے صوتی ، قواعدی (صرف و نحو) اور معنیاتی نظاموں سے تشکیل پاتا
زبان کے قواعدی نظام کا کلموں کی ساخت، ان کے مختلف زمروں اور حیثیتوں ، ان کی ترکیب
تالیف اور تصریف کے طریقوں ، جملے میں کلموں کی ترتیب، آپس کے تعلق اور رشتوں اور تف
حیثیتوں ، سے تعلق ہوتا ہے۔ ہر زبان کے کلموں کی مخصوص ساخت ہوتی ہے۔ ان کی ساخت
تفاعل کے اعتبار سے مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ترکیب و تالیف اور تصریف کے خاص ضابطے ہوتے
ہیں۔ ان کے آپس کے تعلق اور رشتوں کی مخصوص نوعیتیں ہوتی ہیں۔ جملے کی ساخت میں
کلموں کی ترتیب، باہمی تعلق اور عمل کے خاص ضابطے ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت ہر زبان میں
مختلف ہوتی ہے اور یہ کسی زبان سے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہم نسبی اور ہم
زبانوں میں مشترک بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں باہمی تعلق ہو سکتا ہے۔ ان لسانی عناصر کے
مختلف پہلوؤں ، مختلف نوعیت کی خصوصیات اور سطحوں کا مطالعہ، تجزیہ اور توضیح کی جا سک
ہے اور اصول و قواعد اور کلیات وضع کر کے ان کی توضیح و توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ گرامر یا
قواعد (صرف و نحو) کسی زبان کے (قواعدی نظام کے) یہ تمام مباحث سمیٹ لیتی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق ، زبان کے ترکیبی اجزاء و عناصر کی ساخت اور ان کے
میل ملاپ کے قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کا ٹھیک ٹھیک کھوج لگانا گرامر ہے۔ ان کا خیا
ہے کہ گرامر کا زبان سے وہی تعلق ہے جو لفظ کا معنی کے ساتھ ہے۔ لفظ معنی کے ساتھ وجو

میں آتا ہے۔ گرامر بھی زبان کے ساتھ ساتھ وجود میں آتی ہے۔ جب زبان میں استقرار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی مستقل اور مابہ الامتیاز حیثیت قائم ہو جاتی ہے تو گرامر کے اصولوں کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ گرامر نام ہے زبان کے عام اور مستقل اصول کا جو زبان کی تعمیر اور اس کے نشو و نما میں حصہ لیتے ہیں۔(1)

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ

" گرامر، کلام کی ساخت، اجزاء کے منصب اور تفاعل کے لحاظ سے محل وقوع اور ساخت کے اندر ان کے باہمی تعلق اور عمل سے بحث کرتی ہے۔ اجزائے کلام کی ترتیب، باہمی تعلق اور عمل کے مباحث " نحو" کے موضوعات ہیں اور ان کی اپنی ساخت اور مجموعی ساخت میں ان کے محل وقوع، تفاعلی حیثیت اور اس کے اعتبار سے ہئیت میں تحریف، تبدیلی یا اضافہ، تجرید یا اقسام اور زمروں میں درجہ بندی صرف یا تشکیلات کرے۔ " (2)

گرامر کے مسائل و مباحث کو دو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے، صرف اور نحو، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق،

" جس علم میں کلمات کے تغیر تبدل اور ان کے بنانے اور بننے کے طریقوں اور اصولوں کا بیان ہو اسے قواعد کی اصطلاح میں علم صرف کہتے ہیں۔ "(3)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ " نحو" کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" ہر زبان میں ادائے مطلب کے لیے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ ہے۔ یہ طریقے بعض مشترک ہوتے ہیں اور بعض غیر مشترک جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ انہی طریقوں کے جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام جزئیات کا استقصاء

کر کے ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے۔" (4)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق، صرف الفاظ کی تقسیم، گردان اور اشتقاق سے بحث کرتی ہے اور نحو، بات چیت یا جملے میں لفظوں کے ایک دوسرے سے اور جملوں کے باہمی تعلق اور جملوں کی ساخت سے بحث کرتی ہے۔(5)

جدید لسانیات میں زبان کے مطالعے کے دو طریقے ہیں، جنہیں زبان کے مطالعے کے دو شعبے بھی کہہ سکتے ہیں، 1۔ فونیمیات، 2۔ گریمر ۔ جدید لسانیات گریمر کے مسائل و مباحث کو دو زمروں میں تقسیم کرتی ہے، 1۔ مارفولوجی یا تشکیلیات یا صرف اور 2۔ نحو ۔ مارفولوجی (Morphology) کسی زبان کے چھوٹے سے چھوٹے بامعنی لسانی روپ کے مطالعے کو کہتے ہیں اور نحو (Syntox) ایسی تراکیب کے تجزیے اور مطالعے کو جن میں صرف آزاد روپ ہوں۔ " نحو" ان اصولوں کا مطالعہ ہے، جن کے مطابق ہم مختلف تراکیب کو زیادہ بڑی تراکیب میں ترتیب دیتے ہیں۔ یہ بڑی تراکیب دو الفاظ سے لے کر پورے جملے تک ہو سکتی ہیں۔(6)

گریمر یا قواعد کی کئی اقسام ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں۔(7)

1۔ <u>روایتی گریمر</u> : لسانیات کے فروغ سے پہلے گریمر کا جو انداز تھا اسے روایتی گریمر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ماہر لسانیات قواعد کے مطالعے کے اس انداز کو غیر سائنسی کہتے ہیں کیوں کہ روایتی گریمر میں قدیم یونانی اور لاطینی گریمروں کا تتبع کیا جاتا تھا ان میں زبان کی قواعد کا مطالعہ لاطینی کے حوالے سے کیا جاتا تھا اور لاطینی قواعد کے اصول و ضوابط کا دوسری زبانوں پر اطلاق کر دیا جاتا تھا۔ روایتی گریمر کا انداز ہدایتی ہوتا تھا۔

2۔ <u>تدریسی گریمر یا عملی گریمر</u> : زبان سیکھنے کے لیے جو قواعد ترتیب دی جاتی ان میں قواعدی زمروں، قسموں اور لوازم اور ان کی مثالیں یکجا کر دی جاتی ہیں۔ اس کا مقصد زبان سیکھنے اور سکھانے کے آسان طریقوں کو روشناس کرانا ہوتا ہے۔ ایسی گریمر کی

حیثیت تدریسی یا عملی ہوتی ہے۔

3۔ ٹکسالی گریمر : کسی معیاری زبان کو سامنے رکھ کر ٹھوس اور جامع اصول و ضوابط وضع کر کے ان کی پابندی کرانا ہدایتی فریضہ ہے، جو ٹکسالی گریمر انجام دیتی ہے۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ صحیح زبان کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے یہ روایتی گریمر ہی کا ایک رویّہ ہے۔ پانِنی نے ٹکسالی گریمر مرتب کی لیکن سنسکرت اس کی پابند نہ رہ سکی۔ ٹکسالی گریمر زبان کے بدلتے ہوئے معیار اور لسانی تغیرات کو قبول نہیں کرتی۔

4۔ تاریخی گریمر : زبان کے قواعدی نظام کا مطالعہ اس کے آغاز سے کرتی ہے اور اس کے ارتقائی ادوار میں رونما ہونے والی قواعدی تبدیلیوں کی تشریح و توضیح کرتی ہے۔ مختلف ادوار میں قواعدی تبدیلیوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور ہمسایہ زبانوں یا ہم نسبی زبانوں کے قواعدی نظام کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے تاریخی گریمر یا تقابلی گریمر بھی کہتے ہیں۔

5۔ توضیحی گریمر : زبان کے قواعدی نظام کا مطالعہ جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے اور زبان کی ساخت کی مختلف صورتیں، مارفالوجی اور نحو کی ہیئتوں کی توضیح و توجیہہ کی جاتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر ہدایتی ہرگز نہیں ہوتا بلکہ یہ زبان کا مطالعہ اور تجزیہ کر کے اصول دریافت کرتی ہے اور ان کی توضیح و توجیہہ کرتی ہے۔ وہ قانون نہیں بناتی بلکہ بول چال کی زبان کے مطالعے سے اصول دریافت کرتی ہے، اور کسی اصول سے انحراف کو بولنے والوں کی اکثریت کی تائید حاصل ہو تو اسے قبول کر کے اس کی تشریح کرتی ہے۔ جدید لسانیات میں توضیحی گریمر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

6۔ تبادلی گریمر :(8) سب سے پہلے چامسکی نے 1957ء میں تبادلی گریمر کا تصور پیش

کیا جس کے مطابق کسی زبان میں دو قسم کے جملے ہوتے ہیں، ایک بنیادی اور دوسرے باقی تمام جنہیں اس نے غیر بنیادی کہا۔ بنیادی جملے کسی زبان میں محدود ہوتے ہیں۔ یہ جملے سادے، معروف اور اعلانیہ ہوتے ہیں۔ باقی تمام جملے مخلوط یا مرکب ہوتے ہیں۔ ان بنیادی جملوں میں چند تبدیلیوں کے بعد بنائے اور بولے جاتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے مرحلوں کو ہی چامسکی تبادلی قواعد کہتا ہے۔ گرمر کے اس جدید ترین تصور نے جدید لسانیات میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔

زبان اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں سیال حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے قواعدی نظام کے اصول و ضوابط بھی تغیر پذیر ہوتے ہیں اور انہیں مستقل حیثیت دے کر ان کا معیار متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ اس حالت میں بھی زبان کے نظام میں کی تہہ میں کچھ اصول و ضوابط کارفرما ہوتے ہیں لیکن چوں کہ لسانی تغیرات کا سلسلہ تیزی سے جاری ہوتا ہے اس لئے اس کے قواعدی نظام کو استقرار نہیں ہوتا۔ زبان کے ارتقاء کی اس منزل پر گرامر کے اصول و قواعد کا استخراج ممکن تو ہوتا ہے لیکن ان کی حیثیت مستقل اور سند و معیار کی نہیں ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ زبان کا کینڈا متعین ہوتا جاتا ہے اور اس کا لسانی نظام بھی مستقل حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس کے قواعدی نظام کے اصول و ضوابط بھی متعین ہوتے جاتے ہیں اور ان کا استخراج کر کے انہیں معیار اور سند کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ زبان جب تک زندہ رہتی ہے، ارتقاء پذیر رہتی اور اس میں مختلف سطحوں پر لسانی تغیرات کا عمل جاری رہتا ہے۔ کبھی اس کی رفتار سست ہوتی ہے اور کبھی بعض عوامل اور محرکات کے زیر اثر لسانی تغیرات کا عمل قدرے تیز ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کے قواعدی نظام میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور انحرافات بھی ہوتی ہیں، جو زبان کے معین اصول و قواعد کے مطابق بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کے خلاف بھی۔ اگر انہیں قبول عام کی سند حاصل ہو جائے تو یہ گرمر کے نظام میں شامل ہو جاتے ہیں۔

زمانہ قدیم سے زبان کے قواعد کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے گو محرکات مختلف رہے ہیں۔ اہل زبان نے مذہبی محرکات کے زیر اثر زبان کے اصول و قواعد مرتب کئے اور سیاسی و تجارتی مقاصد کے تحت دوسری زبانیں سیکھنے کے لیے غیر قوموں کی زبانوں کے قواعد بھی مرتب کئے گئے۔ ان کی نوعیت تدریسی زیادہ اور علمی کم رہی۔ قدیم ہند، یونان اور عرب میں قواعد نویسی کے محرکات مذہبی نوعیت کے تھے۔ قدیم برہمنوں کی روایت سینہ بہ سینہ نسل در نسل چلی آ رہی تھی، اس لئے صحت زبان کے خیال سے ویدک زبان کی قواعدیں مرتب کی گئیں۔ قدیم ہند آریائی قواعد دانوں میں پاننی (پانچویں صدی قبل مسیح) سرفہرست ہے۔ وہ پہلا قواعد داں نہ تھا اس نے اپنے جونسٹھ پیش روؤں کے نام گنوائے ہیں۔ پاننی کی قواعد "پانینیم" جو "اشٹ ادھیائے" بھی کہلاتی ہے، 3996 سوتروں پر مشتمل ہے۔ پاننی کے مرتب کردہ قواعد بہت پیچیدہ ہیں۔ اس لئے اس کی شرحیں اور تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں۔ "اشٹ ادھیائے" کو عظیم ترین قواعد قرار دیا جاتا ہے۔ (9) کاتیائین کی قواعد "وارتک" میں "اشٹ ادھیائے" کی تفسیر بھی کی گئی ہے اور غلطیوں کی نشان دہی بھی۔ پتن جلی کی گرامر "مہا بھاشا" میں "وارتک" پر تنقید کی گئی اور نئے اصول و قواعد بھی مرتب کئے گئے ہیں۔ ان تین قواعد دانوں کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اس روایت میں یہ تین قواعد داں اہم ترین ہیں پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ قدیم ہند آریائی دور کی قواعدوں میں "اشٹ ادھیائے" ہی اہم اور مستند ترین سمجھی جاتی ہے اس میں سنسکرت الفاظ کی تشکیل، تصریفی نوعیتوں، گردانوں، مشتقات کی جو جزئیات اور تفصیل پیش کی گئی ہیں وہ کسی زبان کی گرامر میں نہیں ملتیں۔ (10) اس کے بعد کے دور کی گرامروں کی اساس "اشٹ ادھیائے" پر ہی رکھی گئی ہے۔

یونانی رواقئین (Stoics) نے ارسطو اور اس کے مقلدین سے استفادہ کر کے یونانی زبان کی گرامر کی بنیاد رکھی اور گرامر کے اجزاء اور اصول و قواعد کی توضیح و تشریح کی۔ اسکندریہ کے علماء میں ڈائنو سیس تھریکس (دوسری صدی قبل مسیح) نے یونانی زبان کے

بارے میں اپنے پیش رووں کے خیالات سے استفادہ کیا اور تدریسی نقطۂ نظر سے اپنے شاگردوں
لیے، جن میں رومی نواد بھی شامل تھے، یونانی زبان کی قواعد لکھی، یہ یونانی زبان کی پہ
باضابطہ قواعد ہے، جس کے اثرات بعد کی گرامروں پر بھی مرتب ہوئے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
خیال ہے کہ ڈائنو سیس کے رومی نواد شاگردوں ہی نے بعد میں لاطینی قواعد مرتب کی۔ لا
قواعد کا ڈھانچہ ایک مدت تک یورپ کے قواعد نویسوں کے لیے ایک معیار اور نمونہ ٹھہرا۔(
رومی شہنشاہوں نے عیسائی مذہب قبول کیا تو عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا، اور بائبل کے لاط
زبان میں ترجمے ہونے لگے۔ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے لاطینی زبان سیکھنے اور سکھانے پر توجہ د
گئی۔ ڈونیٹس (چوتھی صدی عیسوی) اور پرشین (چھٹی صدی عیسوی) نے لاطینی گرامر
مدوّن کیں۔ ان گرامروں پر یونانی گرامرنویسوں کے گہرے اثرات ہیں۔

عربی میں قواعد نویسی کے محرکات مذہبی تھے۔ ابوالاسود ظالم بن عمرو وئلی
جسے پہلا عربی قواعدداں تسلیم کیا جاتا ہے، مذہبی تقاضوں کے پیش نظر عربی قواعد
کی تدوین کی۔ اس کے شاگردوں میں یحییٰ بن عمر اور ابن ابی اسحاق نے عربی قواعد کی
تدوین کی۔ الخلیل بن احمد (719 - 790ء) کو عربی کا پہلا مستند قواعدداں قرار
دیا جاتا ہے۔ اس کی تصنیف " کتاب العین " ہے۔ عمر بن عثمان بن قنبر المعروف بہ
سیبویہ (وفات : 793ء) عربی صرف و نحو کا ممتاز ترین عالم ہے۔ اس کی تصنیف " الکتا
ہے۔ ابوالقاسم محمود بن عمر المعروف بہ الزمخشری (1075-1144ء) کی تصنیف " المفصل
عربی صرف و نحو کی اہم کتاب ہے۔ عربی قواعددانوں کے فارسی قواعد نویسوں پرگہرے اثرات
مرتب ہوئے۔ چناں چہ فارسی صرف و نحو بہت بڑی حد تک عربی صرف و نحو کی تقلید ہے،
بلکہ فارسی زبان کے تقریباً تمام تر اصول و ضوابط انہی سانچوں میں بیان کئے گئے ہیں، جو اص
صرف عربی کے لیے وضع کئے گئے تھے۔ اصطلاحات بھی عربی صرف و نحو سے لی گئی ہیں۔(12)
فارسی صرف و نحو کے اردو قواعد پر گہرے اثرات ہیں۔ در حقیقت یہ سلسلہ عربی صرف و نحو

تک پہنچتا ہے۔ روایتی اردو قواعد فارسی کے توسط سے عربی ہی سے ماخوذ ہیں۔

اردو قواعد نویسی :

یورپین مہم جوؤں کے ساتھ عیسائی مشنری بھی برصغیر میں آئے۔ انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے نقطہ نظر سے مقامی زبانوں پر توجہ دی ۔ اردو شمالی ہندوستان میں رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی اور بول چال کی زبان کا درجہ رکھتی تھی ۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر عیسائی مبلغین نے اردو کو بھی عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا اور اردو سیکھنے اور نئے آنے والے یورپین کو اردو سکھانے کے لیے اردو قواعد اور لغات کی تدوین کی۔ بعد میں مذہبی مقاصد کے ساتھ سیاسی و تجارتی مقاصد بھی شامل ہوتے گئے اور اردو کی طرف توجہ مزید بڑھ گئی۔ ابتداء میں ایسی ذو لسانی لغات مرتب کی گئیں جن کے آغاز میں اردو کے قواعد بھی بیان کر دئیے جاتے تھے۔ جیرو نیمو زاویر نے ایسی ہی ایک لغت مرتب کی جس میں اردو قواعد بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ 1599ء سے قبل کی تصنیف ہے۔ اٹھارویں صدی میں فادر کا سیانودی ماسیراتا (1708-1785ء) نے ہندوستانی زبان کی ایک قواعد مرتب کی۔(13) مولوی عبدالحق " جان جوشوا کیٹیلر" کو ہندوستانی زبان کا پہلا یورپین قواعد نویس قرار دیتے ہیں اور اس کا سن تصنیف 1715ء بتاتے ہیں۔(14) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی اس امر میں ان سے متفق ہیں اور اس کا سال اشاعت 1743ء قرار دیتے ہیں۔(15) کیٹیلر کے بعد ایک مشنری بنجمن شلز نے ہندوستانی زبان کی قواعد " ہندوستانی گرامر" 1741ء میں مرتب کی۔ یہ قواعد بھی لاطینی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق انگریزی میں اردو کی قدیم ترین قواعد کا مولف مسٹر گلشن ہے۔ اس کے بعد مسٹر ہیڈلے نے 1765ء میں اردو زبان کی قواعد لکھی۔(16) ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے 1796ء میں اردو کی قواعد مرتب کی۔ یہ بھی انگریزی زبان میں ہے اور خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

انیسویں صدی میں مرتب کردہ ہندوستانی (اردو) قواعد کی ایک فہرست مولوی عبدالحق

(قواعد اردو، مقدمہ) ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (جامع القواعد ، مقدمہ، اور ہندوستہ قواعد ، مقدمہ) اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے (کتابیات قواعد اردو، 1985ء) میں دی ہے۔ اس فہرست میں سے اہم قواعد کا ذکر اس مقالے کے پہلے باب میں کیا گیا ہے۔ ان قواعد کی تالیف کا مقصد اردو (ہندوستانی) زبان سیکھنا اور سکھانا تھا، اس لئے ان کی حیثیت علمی نہیں عملی ہے۔ چوں کہ یہ ہندوستان آنے والے یورپین عیسائی مشنریوں، تاجروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے مرتب کی گئی تھیں اس لئے یہ پرتگالی ، ولندیزی لاطینی ، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئیں۔ چوں کہ یہ قواعد یورپین نے مرتب کی تھیں اس لئے ان پر لاطینی گرامر کے اثرات غالب ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ اس وقت یورپ میں لاطینی کی علمی حیثیت اور اہمیت قائم تھی ۔ لاطینی قواعد اور اس کے اصول صرف و یورپ کی دوسری زبانوں کی قواعد کی تدوین کرتے ہوئے بطور نمونہ یا معیار کے اختیار کئے جاتے تھے۔ اس لئے اردو قواعد کی تدوین میں یورپین نے لاطینی گرامر ہی کی مثال کو سامنے رکھ اور اردو اصطلاحات کے بجائے لاطینی اصطلاحات استعمال کی گئیں اور اس کے اصول و قواعد کی پیروی کی گئی ۔(17) اردو کی یہ قواعد چوں کہ اردو زبان میں نہیں ہیں، اس لئے اردو داں طبقہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا ۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اہم علم کے لیے ان میں خاصا مواد مل سکتا ہے۔ اس عہد کی اردو (ہندوستانی) زبان کے محاورے، لغات اور قواعد زبان کے حوالے سے اردو کے لسانی مزاج کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو داں طبقے نے انیسویں صدی میں اردو قواعد نویسی پر توجہ دی۔ اس سلسلے میں انشاء اللہ خاں انشاء کی " دریائے لطافت" (1802ء) کو تقدم حاصل ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے 1935ء میں اس کا اردو ترجمہ کیا ۔ " دریائے لطافت" اپنے مباحث کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ قواعد زبان اردو کے مباحث میں انشاء نے صرف و نحو کے مسائل پر بحث کی ہے۔ انہوں نے اردو کے اصول و قواعد مرتب کرتے ہوئے عوام و

خواص کی زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے اردو کی ساخت اور ڈھانچے پر غور کیا اور اس کے لسانی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی صرف و نحو کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن فارسی قواعد کا ڈھانچہ ان کے پیش نظر رہا ہے لہذا عربی ، فارسی صرف و نحو کے اثرات ان کے یہاں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

روشن علی انصاری نے 1810ء میں " رسالہ صرف و نحو" کے نام سے قواعد کی ایک کتاب تصنیف کی ۔ اسی زمانے میں بہادر علی حسینی نے گلکرسٹ کے رسالے (قواعد اردو) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد ابراہیم نے 1833ء میں کتاب قواعد اردو لکھی ۔ سر سید نے 1840ء میں اردو صرف و نحو پر ایک رسالہ لکھا۔ مولوی احمد علی دہلوی نے " فیض کا چشمہ" کے نام سے اردو صرف و نحو کا ایک رسالہ لکھا جو 1845ء میں شائع ہوا۔ امام بخش صہبائی نے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب " رسالہ قواعد صرف و نحو اردو" (اے گرامر آف اردو لنگوئج ان اردو) لکھی ، جو 1845ء میں شائع ہوئی ۔ مولوی کریم الدین پانی پتی نے " قواعد الہندی " کے نام سے کتاب لکھی جو 1860ء میں شائع ہوئی ۔ راجہ شیو پرشاد کی قواعد "اردو صرف و نحو" 1875ء میں شائع ہوئی ۔(18) انیسویں صدی میں قواعد اردو پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں ، جن میں سے اکثر تدریسی ضرورت کے تحت تالیف ہوئیں۔ بیشتر صرف چند صفحات پر مشتمل ہیں ، بہت سی سوال و جواب کی صورت میں ہیں ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر کتابیں مختلف علاقوں کے محکمہ ہائے تعلیم کی ایماء پر لکھی گئیں۔ اس عہد میں قواعد نویسی کے رجحان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان تمام تالیفات میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سب نے فارسی قواعد کے نمونوں کو پیش نظر رکھا ہے اور کسی نے اردو زبان کے مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ان قواعد نویسی میں ایک رجحان مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ شعراء کے کلام سے سند دینے کا رواج ہے۔ (19)

بیسویں صدی کے آغاز سے اردو قواعد نویسی کی طرف علمی نقطۂ نظر سے توجہ دی

جانے لگی۔ اس سلسلے کی اہم کتاب " مصباح القواعد " ہے، جس کے مولف، مولوی فتح محمد خاں جالندھری ہیں، یہ کتاب 1896ء میں تالیف ہوئی اور 1904ء میں شائع ہوئی۔(20) " مصباح القواعد " میں شعبہ جاتی تقسیم اس طرح کی گئی ہے ،1۔ حروف تہجی ،2۔ علم صرف،3۔ علم نحو ۔ حروف تہجی کے مباحث کے بعد علم صرف کے مباحث میں لفظ کی قسمیں ، مصدر کے مباحث فعل کی قسمیں، گردانیں اور اسم کی قسمیں بیان کی گئی ہیں، علم نحو کے مباحث میں کلام کی قسمیں، مرکبات اور ان کی قسمیں، جملہ اور اقسام جملہ اور آخر میں حروف کا بیان ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا خیال ہے کہ مصباح القواعد عربی قواعد کے طریقے پر ہے لیکن عربی قواعد کی طرز پر اردو میں جتنی قواعد لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے بہتر ہے۔ اس کے حصہ نحو کی ترکیب ایک مستشرق سیل کی جامع القوانین کی ترتیب سے ملتی جلتی ہے۔ (21) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے " مصباح القواعد " کو اپنے عہد کی ممتاز ترین قواعد قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عصر حاضر کے اکثر و بیشتر قواعد نویسوں نے " مصباح القواعد " سے استفادہ کیا ہے۔(22)

مولوی عبدالحق اردو کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے اردو کے لسانی مزاج کو جانچتے ہوئے " قواعد اردو " (1916ء) تالیف کی۔ " قواعد اردو " کی شعبہ جاتی تقسیم اس طرح ہے،
1۔ ہجا ،2۔ صرف، جس میں اسم صفت، ضمیر، فعل اور تمیز کے مباحث شامل ہیں۔
3۔ مشتقات و مرکبات، 4۔ نحو، جس کے دو حصے ہیں، نحو تفصیلی اور نحو ترکیبی ۔ اور
5۔ عروض ، انہوں نے نحو کے مباحث کے آخر میں رموز اوقاف کے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔
مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ زندہ زبان کے قواعد نویس کو سب سے اوّل بول چال کا خیال رکھنا چاہیے اور اسی سے قاعدے بنانے چاہئیں۔(23) انہوں نے بول چال ہی کی زبان کا مطالعہ کر کے اصول و قواعد اخذ کئے ہیں، لیکن ادبی زبان کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے شعراء کے کلام سے سند دی ہے لیکن نثر پر زیادہ توجہ دی ہے اور بول چال کی زبان سے سند دی ہے۔ مولوی عبدالحق نے زبان کی مکتوبی صورت پر توجہ دینے کے بجائے عام بول چال کی

زبان سے اصول و قواعد اخذ کئے ہیں، ان کا یہ انداز انہیں قواعد نویسی کے لسانیاتی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ انہیں اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ ہر زبان کا اپنا مخصوص لسانی ڈھانچہ ہوتا ہے، اس لئے انہوں نے عربی و فارسی صرف و نحو کا تتبع کرنا پسند نہیں کیا۔ ان کا یہ نقطۂ نظر لسانیاتی ہے، جس کا اظہار انہوں نے " قواعد اردو " کے مقدمے میں کیا ہے۔

> " ہمارے ہاں اب تک جو کتابیں قواعد کی رائج ہیں، ان میں عربی صرف و نحو کا تتبع کیا گیا ہے۔ اردو خالص ہندی زبان ہے اور اس کا شمول آریاوی السنہ کی صرف و نحو میں ہے۔ بخلاف اس کے عربی زبان کا تعلق سامی السنہ سے ہے۔ لہٰذا اردو زبان کی صرف و نحو لکھنے میں عربی زبان کا تتبع کسی طرح جائز نہیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات بالکل الگ ہیں۔ جو غور کرنے سے صاف معلوم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگرچہ اردو ہندی نژاد ہے اور اس کی بنیاد قدیم ملکی زبان پر ہے، افعال جو زبان کا بہت بڑا جزو ہیں، نیز ضمائر اور اکثر حروف سب کے سب ہندی ہیں۔ صرف اسماء و صفات عربی فارسی کے داخل ہو گئے ہیں اور چند گنتی کے مصادر جو عربی فارسی الفاظ سے بن گئے ہیں۔ " (24)

مولوی عبدالحق اردو کے پہلے قواعد نویس ہیں، جنہوں نے عربی فارسی صرف و نحو کی نقالی ترک کر کے اردو زبان کے لسانی ڈھانچے اور ساخت پر غور کر کے اصول و قواعد کا استخراج کیا۔ اگرچہ انہوں نے " قواعد اردو " کی شعبہ جاتی تقسیم میں " ہجا " اور " عروض" کے مباحث شامل کئے ہیں اور اس طرح وہ عربی فارسی صرف و نحو کے سحر سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکے ہیں، لیکن ترتیب مباحث میں انہوں نے اردو کے مزاج کو ملحوظ رکھا ہے، البتہ اس

سلسلے میں انہوں نے مستشرقین سے بھی استفادہ کیا ہے۔ " قواعد اردو " کے حصہ نحو کی ترتیب دو حصوں، نحو تفصیلی اور نحو ترکیبی پر مشتمل ہے۔ کیلاگ نے ہندی کی قواعد میں حصہ نحو کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1- Analytic System (نحو تفصیلی) اور 2- Synthetic System (نحو ترکیبی) مولوی عبدالحق نے جدید مغربی اصول قواعد نویسی کے مطابق اردو کے مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے " قواعد اردو " مدوّن کی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں کا خیال ہے کہ

> " مولوی عبدالحق نے اپنی قواعد اردو میں ایک اور طرز اختیار کیا جس کو ان سے پہلے اردو کے کسی اہل زبان قواعد نویس نے اختیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مصباح القواعد سے بالکل جدا راہ اختیار کی اور عربی اصول پر قواعد کو مرتب نہیں کیا۔ ان کی قواعد اردو بڑی حد تک مستشرق قواعد نویسوں کے اصول پر لکھی گئی ہے، مگر چوں کہ وہ اردو کے بہترین مزاج شناس ہیں، اس لئے انہوں نے جدید مغربی اصول قواعد سے استفادے کے ساتھ اردو کی انفرادیت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک ترتیب مباحث کا تعلق ہے ان کی قواعد میں حصہ نحو کیلاگ کی ہندی گرامر کے حصہ نحو سے بہت کچھ مستفاد و مماثل ہے، مگر اہم نحوی مسائل پر دسترس اور اصابت رائے کے لحاظ سے مولوی صاحب بہت آگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ " قواعد اردو " مولوی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ " (25)

مولوی محمد زین العابدین فرجاد کوٹانوی نے " آئین اردو " کے نام سے اردو کی قواعد تالیف کی جو 1926ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ مولف کے مطابق سیّد سلیمان ندوی نے اس قواعد کی تصحیح کی اور ان کے نقطۂ نظر کی تصدیق و تائید کی۔ مولف آئین اردو کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ " مصباح القواعد " عربی صرف و نحو کے تتبع میں لکھی گئی ہے اور مولف نے اردو کے مزاج

اور خصوصیت کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اردو کا لگاؤ سامی زبان (عربی) سے نہیں ہے۔ مصباح القواعد خواہ ترتیب ہو خواہ ترکیب، عربی صرف و نحو کا تتبع ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مولوی عبدالحق کی قواعد اردو، انگریزی گرامر کے تتبع میں ہے اور ان کی سعی اردو کو بالکل انگریزی کے سانچے میں ڈھالنے کی معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی اور اردو، دونوں آریں زبانیں ہیں لیکن طرز ادا اور محاورے اور مثالیں بالکل ہی الگ الگ نہ ہوں، مگر یکساں ہرگز نہیں ہیں۔(26)

مولف آئین اردو نے اپنی کتاب کے صفحہ 3 تا 10 مصباح القواعد اور صفحہ 11 تا 18 مولف مصباح القواعد کے تسامحات کی نشان دھی کی ہے۔ " آئین " اردو " کے مباحث میں بھی مصباح القواعد اور قواعد اردو کے تسامحات کی نشان دھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا خیال ہے کہ مولف آئین اردو نے بڑی دقت نظر کے ساتھ مولوی صاحب کی متعدد لغزشوں کی نشان دھی کی ہے۔ ان میں بعض تو طرز نظر میں جدّت و قدامت کے فرق کی وجہ سے لغزش معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض مسائل میں صاحب آئین اردو کی گرفت درست ہے۔(27)

مولوی زین العابدین کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اردو کے قواعد لکھنے میں عربی اور انگریزی میں سے کسی ایک کی کورانہ تقلید سے کام نہیں لیا اور بلحاظ زبان اردو اس کے قواعد موسوم بہ آئین اردو لکھے۔ (28) مولف آئین اردو کا دعویٰ ایک حد تک درست ہے۔ انہوں نے اردو کے مزاج اور لسانی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اردو کے قواعد اخذ کئے ہیں اور " آئین اردو " مدوّن کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں، لیکن وہ " مصباح القواعد " کے اثرات سے بچ نہیں سکے ہیں۔ ان کی قواعد کی شعبہ جاتی تقسیم اور مباحث کی ترتیب " مصباح القواعد " سے بہت حد تک مماثل ہے، حتیٰ کہ مثالیں بھی ملتی جلتی ہیں، البتہ تعریف و تشریح میں اور ذیلی مباحث میں فرق ہے بلکہ کہیں کہیں مولف آئین اردو نے اردو قواعد کے مسائل کی اپنے پیش روؤں کی نسبت بہتر وضاحت کی ہے۔ آئین اردو کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی یہ رائے صائب ہے کہ مولف آئین اردو مولوی عبدالحق کی طرح اردو زبان کی انفرادیت

اور اس کے مزاج کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کے بعد منصۂ شہود پر آنے والی کتب قواعد میں آئین اردو بہت نمایاں ہے۔ جہاں تک اس کے (آئین اردو) کے حصہ نحو کی ترتیب کا سوال ہے، قدیم انداز کی ہے۔(29)

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے " کیفیہ" (1942ء) میں اردو قواعد کے مسائل پر بحث کی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں حروف تہجی ، لفظ، مرکبات، اسم، حرف ، تذکیر و تانیث، مصدر، فعل ، روزمرہ و محاورہ، کلام، اسلوب ، عروض اور املا کے مباحث " کیفیہ" میں شامل کئے ہیں۔ انہوں نے اردو کے مزاج اور لسانی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو قواعد کی توضیح و تشریح کی ہے۔ انہوں نے نحو کے مباحث میں اسلوب کے مسائل کو شامل کیا ہے۔ وہ قواعد نحو کو اسلوب کے تابع قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قواعد کلام کی صرف مادی حالت سے واسطہ رکھتی ہے۔ اسے حقیقت کے ادراک کی تسہیل اور واقعات کی صحیح تفہیم سے تعلق نہیں، اس لئے وہ قاعدے جو اسلوب کے نفسیاتی اصول اور ذوق سلیم سے سرکشی کریں ایک تصنیف یا کلام کو فصیح نہیں بنا سکتے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قواعد زبان سے بنتی ہے، زبان قواعد سے نہیں۔ قواعد یا فن کے اصول وہیں تک قابل قبول ہیں جہاں تک وہ زبان کی زندگی کے مزاحم نہ ہوں اور ترمیم اور آئندہ ترقی کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ اگر اسلوب سلاست اور تسلسل کے ساتھ خیالات کا اظہار کرتا ہے تو صرف و نحو کے قواعد میں اتنی وسعت ہونی چاہیئے کہ وہ اس اسلوب پر صاد کریں۔ اگر وہ قواعد یہ استعداد اور صلاحیت نہیں رکھتے تو ترمیم کے قابل ہیں۔(30) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کیفی کے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نحو کا کام جملے کے اجزاء کے مختلف استعمالات سے بحث کرنا ہے۔ بعض الفاظ مرکبات اور فقرے جملے میں آ کر تصریفی قواعد کے برخلاف معنی دے جاتے ہیں۔ نحو ان اختلافات سے بحث کرتی ہے۔ اس لئے نحویوں کو ایک حد تک اسلوب سے بحث کرنا چاہیے، جیسے حروف کے اغراض استعمالات کی بحث جو علم معانی سے تعلق رکھتی ہے، فتح محمد خاں جالندھری اور مولوی عبدالحق نے نحو میں شامل کر لی ہے۔(31)

" جامع القواعد " جس کا حصہ " صرف " ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مدوّن کیا ہے، 1971ء میں شائع ہوا، اور حصہ " نحو " جسے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے مدوّن کیا ہے، 1973ء میں شائع ہوا۔ " جامع القواعد " اردو کی معرکتہ الآراء قواعد ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی معروف ماہر لسانیات تھے۔ وہ جدید اصول قواعد نویسی پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ وہ اردو زبان کی ساخت کینڈے اور لسانی مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اردو کی قواعد نویسی کی روایت پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو کے قواعدی نظام کا غائر مطالعہ کر کے، اردو زبان کے اصول و قواعد کا استخراج کیا ہے اور " جامع القواعد " کے حصہ صرف میں ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اردو کی روایتی قواعد میں مباحث کا آغاز حروف تہجی یا علم ہجا سے ہوتا تھا۔ یہ قواعد نویس زبان کی بنیادی آوازوں یعنی فونیم اور ان کی تحریری شکلوں میں امتیاز نہیں کرتے تھے، جس سے مباحث میں ابہام پیدا ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس روش کو ترک کر کے، جامع القواعد (حصہ صرف) میں مباحث کا آغاز اردو کے صوتی نظام کے مسائل سے کیا ہے۔ انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا فونیمیاتی تجزیہ کر کے اردو فونیم کا تعین کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو املا یا ہجا کے مباحث میں اردو کی بنیادی آوازوں (فونیم) کی تحریری شکلوں کے حوالے سے بحث کی ہے۔ صرف کے مباحث میں انہوں نے اسم، نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے اس کی قسموں، فعل، اس کی اقسام اور مختلف صورتیں، فعل کی گردانیں، حرف اور اس کے مختلف زمرے اور اردو میں مشتق اور مرکب الفاظ، پر بحث کی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے عربی فارسی صرف و نحو کے اتباع میں روایتی اردو قواعد کے تسامحات کی نشان دہی بھی کی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب علم اور صاحب نظر محقق ہیں اور اردو زبان کے مزاج شناس بھی ہیں۔ اردو قواعد نویسی کی روایت کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، اور انہیں قواعد نویسی کے جدید اصول و قواعد پر دسترس بھی حاصل ہے۔ انہوں نے اردو کے لسانی مزاج کا

تجزیہ کر کے اردو زبان کے اصول و قواعد اخذ کئے اور " جامع القواعد " کا حصہ نحو مدوّن کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے اردو زبان کے مختلف النوع نحوی مسائل کا بہ نظر غائر جائزہ لے کر اردو نحو کی مابہ الامتیاز نحوی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے جملے کی ساخت کے اعتبار سے مختلف قسموں، جملے کے عناصر ترکیبی، فعل، اس کی قسموں اور فعل کے متعلقات کی ترتیب و ترکیب، مرکب جملے اور ان کی قسموں، مسند، اس کی قسموں اور مسند الیہ ہونے والے کلمات، مفعولی اور تکمیلی کلمات، صفت اور موصوف اور ان قسموں، حروف اور ان کے استعمال کے نو عیتوں، عطف اور اس کی مختلف صورتوں اور قسموں پر بحث کرتے ہوئے اردو زبان کے نحوی اصول و قواعد کی توضیح و تشریح کی ہے۔ ان مباحث میں انہوں نے اردو کے روایتی قواعدوں کے تسامحات کی نشان دھی بھی کی ہے۔ انہوں نے نحوی اصول و قواعد کی وضاحت کرتے ہوئے مستثنیات کی نشان کر کے ان کی تصریح بھی کی ہے۔ انہوں نے اردو کی نحوی خصوصیات پر دیگر زبانوں، عربی، فارسی اور ھندی کے نحوی اصولوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ نحو کے مباحث میں انہوں نے املا اور علامات وقف (رموز اوقاف) کے مسائل کو بھی شامل کیا ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے " کیفیہ " میں نحو کے مباحث میں اسلوب کے مسائل شامل کئے ھیں اور اسلوب کی اھمیت پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ پنڈت کیفی کے اس نقطۂ نظر سے متفق ھیں، اس لئے انہوں نے اردو کے نحوی مسائل میں ایک حد تک اسلوب کے مسائل کو شامل کیا ہے۔ ایسے الفاظ، فقرے اور مرکبات جو جملے میں استعمال ھو کر تصریفی قواعد کے برخلاف معنی دے جاتے ھیں، انہوں نے نحوی مسائل میں ان اختلافات سے بحث کی ھے اور جملے میں الفاظ اور حروف کے استعمال سے معنی میں رونما ہونے والے اختلافات اور تغیرات کی نشان دھی کی ہے۔

مولفین " جامع القواعد " نے اردو کی ساخت اور کینڈے کا دقت نظر سے مطالعہ کر کے، اردو کے مزاج اور لسانی خصوصیات کا تجزیہ کر کے اردو زبان کے قواعدی نظام کا تعین کیا ھے اور اصول و قواعد کا استخراج کر کے علمی انداز میں ان کی توضیح و تشریح کی ہے۔ ان کا

دسقطۂ نظر لسانیاتی ہے اور انہوں نے روایتی قواعد نویسی کا تتبع کرنے کے بجائے قواعد نویسی کے جدید اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس اعتبار سے " جامع القواعد " اردو قواعد نویسی کی روایت میں بلند تر مقام و مرتبے کی حامل ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے صاحب نظر ماہر لسانیات تھے۔ وہ اردو کے مزاج شناس بھی تھے اور ہند آریائی لسانیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اردو کی ساخت اور لسانی خصوصیت کا کامل شعور تھا۔ انہوں نے اردو قواعد کی تدوین کا کام شروع کیا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام نامکمل رہا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی کتاب " اردو قواعد " (۱۹۸۲ء) شائع ہوئی لیکن یہ نامکمل ہی ہے۔ اس کے مطبوعہ حصے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان کا یہ منصوبہ مکمل ہو جاتا تو یہ اردو قواعد نویسی کی روایت میں قابل قدر اضافہ ہوتا۔ اس کتاب میں اسم، اسم ماخوذ، اسم مرکب، تغیرات اسم، عدد، حالت، اسمائے مطلقہ اور جنس کے مباحث شامل ہیں۔

جدید لسانیات کی بنیادیں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) پر استوار ہیں۔ توضیحی لسانیات، گرامر کی تقسیم دو شعبوں میں، مارفالوجی (Morphology) (تشکیلیات یا صرف) اور نحو (Syntax) کرتی ہے۔ مارفالوجی، چھوٹی سے چھوٹی بامعنی لسانی اکائیوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ ان بامعنی اکائیوں کا مطالعہ لفظ کی سطح تک کیا جاتا ہے۔ لفظ کی ساخت اور اس میں استعمال شدہ بامعنی اکائیوں کا مطالعہ مارفالوجی ہے۔ اردو میں اسے تشکیلیات بھی کہتے ہیں اور اردو کی عام قواعدوں میں اس شاخ کو " صرف " کہا جاتا ہے لیکن لسانیات میں مارفالوجی ایک خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لئے اسے صرف کے روایتی معنوں سے الگ سمجھنا چاہیے۔ (32) مارفیم چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ آزاد مارفیم اور پابند مارفیم، ان کی مزید کئی قسمیں ہیں۔ مارفالوجی کسی زبان کے مارفیم اور ان کی ذیلی اقسام کا جائزہ لیتی ہے۔ " نحو " میں فقروں اور جملوں میں الفاظ کی ترتیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لفظ کے اوپر جملوں تک پہنچنے میں کئی سطحیں ہوتی ہیں۔

لفظ سے اوپر کی تمام سطحوں کے مطالعہ کو " نحو " کہتے ہیں۔(33) ایسی تراکیب کا تجزیہ اور مطالعہ جن میں صرف آزاد روپ شامل ہوں اس کو " نحو " کہتے ہیں۔ " نحو " میں ان اصولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جن کے مطابق مختلف تراکیب کو زیادہ بڑی تراکیب میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ بڑی تراکیب دو الفاظ سے لے کر پورے جملے تک ہو سکتی ہیں۔(34)

ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے جدید لسانیاتی نقطہ نظر سے اردو کی قواعد مدوّن کی ہے۔ وہ صاحب نظر ماہر لسانیات ہیں اردو کے لسانی مزاج، ساخت اور کینڈے کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی، بھارت کے شعبہ لسانیات سے وابستہ ہیں۔ انہیں جدید لسانیاتی نقطہ ہائے نظر سے کامل آگہی حاصل ہے۔ انہوں نے " اردو صرف و نحو " میں اردو کے قواعدی نظام کا تشکیلیاتی اور نحوی جائزہ لے کر اردو کی ساخت کا مطالعہ کیا ہے۔ " اردو صرف و نحو " میں انہوں نے مارفیموں کی شناخت کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اردو کے مارفیموں اور ان کی ذیلی اقسام کی نشان دہی کی ہے اور تصریف اور اشتقاق کے مسائل سے بحث کی ہے۔ اردو کے نحوی مسائل سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے جملے کے اجزاء کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو کے نحوی نظام کا جائزہ لیا ہے۔ کے آخر میں انہوں نے جدید لسانیاتی نقطہ نظر کے مطابق گرمر کے مقاصد کی وضاحت کی ہے اور زبان کے مطالعے کی ذیل میں قواعد کی مختلف قسموں اور ان کے مناہج مطالعہ کی وضاحت کی ہے۔ مغرب میں جدید لسانیات تبادلی قواعد کے تصور کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے تبادلی قواعد کی اس اہمیت کے پیش نظر اس کے مختلف تصورات اور مناہج مطالعہ کی توضیح کرتے ہوئے اردو کی تبادلی قواعد کا نمونہ پیش کیا ہے۔

" اردو صرف و نحو " جدید لسانیاتی نقطۂ نظر کے مطابق تالیف کی گئی اردو کی اہم قواعد ہے۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے قواعد نویسی کے جدید ترین اصولوں کے مطابق اردو کی یہ قواعد مدوّن کی ہے جو ان کا ایک اہم کارنامہ ہے اور اردو قواعد نویسی کی روایت میں قابل قدر اضافہ ہے۔

"نئی اردو قواعد" (1988ء) عصمت جاوید نے مدوّن کی ہے۔ ان کا تعلق بھارت سے ہے۔ ان کی اس کتاب کے مباحث کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے لسانی مزاج سے واقف ہیں اور جدید لسانیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے قواعد نویسی کے جدید ترین اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو کی قواعد مرتب کی ہے۔ اگرچہ انہوں نے روایتی قواعد کی شعبہ جاتی تقسیم کو ہی اختیار کیا ہے لیکن جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے اصول و قواعد کی توضیح و تشریح کی ہے۔ قواعد نویسی کے حوالے سے ان کا ایک خاص نقطہ نظر ہے کہ ان کا خیال ہے کہ روایتی قواعد میں قواعد کو منطق کے تابع قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اجزائے کلام کی درجہ بندی میں صرف معنوی اقسام کو معیار بنایا گیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ الفاظ جملوں کی شکل ہی میں خارجی دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جدید لسانیات جملے میں الفاظ کی ہیئت اور ان کے وظائف پر زور دیتی ہے۔ جو لسانی عادتوں اور لسانی روایات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لسانی تجزیے کی بنیاد صرف معنی پر رکھنے سے زبانوں کی ساخت کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ قواعد نویسی میں زبان کے دو اہم پہلوؤں یعنی "معنیت" اور "قواعدیت" میں حد فاصل قائم کرنا چاہیے اور تبادلی قواعد کے اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اصلی جملوں سے مختلف قسم کے جملے مشتق ہوتے ہیں البتہ اصلی جملے کی جگہ مفرد بیانیہ ایجابی جملے کو اساس بنایا جائے۔ (35)

عصمت جاوید نے "نئی اردو قواعد" میں شعبہ جاتی تقسیم اس طرح کی ہے۔ 1۔ صوت 2۔ صرف، 3۔ نحو، 4۔ مشتقات و مرکبات۔ "صوت" کے ذیل میں انہوں نے اردو کے صوتی نظام کا جائزہ لیا ہے اور اردو کی بنیادی آوازوں (فونیم) کا تعین کیا ہے۔ "صرف" کے مباحث میں اجزائے کلام اور جنس و تعداد زمانہ کے مسائل کو شامل کیا ہے۔ کلام کی ہیئت اور قواعدی وظائف کو اساس قرار دیتے ہوئے اجزائے کلام کا تعین کیا ہے اور ان کے صرف انہی معنوی پہلوؤں کو اہمیت دی ہے جن کا اظہار ان کی ہیئتوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو کے مارفیموں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی مختلف اقسام سے بحث کی ہے۔ مارفیم کے لیے انہوں نے "صرفیہ" کی اصطلاح استعمال

کی ہے۔ " نحو " کے مباحث میں انہوں نے جملہ، جملے کی ساخت، جملوں کی قسموں کی وضاحت کی
ہے۔ مشتقات و مرکبات کی ذیل میں تشکیل الفاظ کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ اشتقاق
" صرف " کا موضوع ہے اور مرکبات " نحو " کا، لیکن عصمت جاوید کے خیال میں تشکیل الفاظ کا
عمل جملے کے چوکھٹے سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں علیحدہ باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

" نئی اردو قواعد " کی شعبہ جاتی تقسیم اور ذیلی مباحث کی ترتیب روایتی قواعد
کے مطابق ہے لیکن اصول و قواعد کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے عصمت جاوید نے جدید لسانیات
نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے اور قواعد نویسی کے جدید اصولوں کی پیروی کی ہے۔ ان کی قواعد
اس اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اردو کے قواعدی نظام کا مطالعہ جدید لسانی
نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے اور اردو کی ساخت اور تشکیلیاتی اور نحوی مسائل کا گرامر کے جدید
اصولوں کی روشنی میں جائزہ لے کر اردو زبان کے قواعد کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ اس ا
سے " نئی اردو قواعد " اردو قواعد نویسی کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اردو قواعد نویسی کا آغاز مستشرقین کی اردو زبان کی گرامروں/ تدریسی نوعیت کی
سے ہوا جو مختلف یورپی زبانوں میں لکھی گئی تھیں یہ گرامریں
تھیں اور ان پر لاطینی گرامر کی چھاپ تھی کیوں کہ مستشرقین کی گرامر نویسی کا رجحان
مدرسانہ تھا اور ان کے سامنے یوروپی زبانوں کی گرامروں کی مثال تھی، جو لاطینی گرامر
کے انداز میں لکھی گئی تھیں۔ اردو داں طبقے نے اردو قواعد نویسی پر توجہ دی تو ان کا
انداز بھی مدرسانہ اور ہدایتی تھا کیوں کہ یہ تدریسی مقاصد کے تحت لکھی گئی تھیں۔
رفتہ رفتہ اردو داں طبقے نے علمی انداز میں اردو قواعد مرتب کرنے پر توجہ دی لیکن ان پ
عربی فارسی صرف و نحو کے اثرات غالب رہے۔ " مصباح القواعد " علمی انداز میں لکھی گئی
لیکن مولف نے عربی فارسی صرف و نحو کی تقلید کی۔ مولوی عبدالحق نے پہلی بار اردو کے
لسانی مزاج اور ساخت کو ملحوظ رکھ کر " قواعد اردو " مدون کی۔ انہوں نے قواعد نویسی
جدید مغربی اصولوں سے استفادہ کیا۔ مولف " آئین اردو " نے بھی اردو کے لسانی مزاج کو

سمجھتے ہوئے اردو کے اصول و قواعد مدوّن کئے۔ عصر حاضر میں " جامع القواعد " نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مولفین نے جدید اصول قواعد نویسی کو ملحوظ رکھ کر لسانیاتی نقطہ نظر اور علمی انداز اختیار کیا ہے۔ قواعد نویسی کے جدید ترین لسانیاتی نقطۂ نظر کے تحت " اردو صرف و نحو" اور " نئی اردو قواعد " مدوّن کی گئی ہیں۔ ان کے مولفین کا تعلق بھارت سے ہے۔ پاکستان میں اس انداز میں قواعد اردو کی تدوین نہیں کی گئی ہے۔

حواشی و حوالہ جات : ساتواں باب : قواعد (صرف و نحو)

1- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، " اردو قواعد کی ترتیب نو" مشمولہ : لسانی مسائل ، (کر
مکتبہ اسلوب، 1962ء) ص 17 تا 20

2- پروفیسر خلیل صدیقی ، " گریمر" مشمولہ : لسانی مباحث(کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز،
ص 204

3- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ، 171

4- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (لاہور، مرکزی اردو بورڈ
1973ء) ص ۵

5- مولوی عبدالحق ، قواعد اردو (لاہور، اردو اکیڈمی ، س ن) ، ص 30، 31

6- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، اردو صرف و نحو، (نئی دہلی ، ترقی اردو بیورو، 85
ص 9 اور 70

7- پروفیسر خلیل صدیقی " گریمر" مشمولہ : لسانی مباحث، (ایضاً) ص 202 تا 04

8- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، اردو صرف و نحو، (ایضاً) ص 114

9- پاننی کی " اشٹ ادھیائے" کے بارے میں تفصیلی جائزہ اس مقالے کے پہلے باب
پیش کیا گیا ہے۔

10- پروفیسر خلیل صدیقی ، " ہند آریائی لسانیات" مشمولہ لسانی مباحث، (ایضاً) ص 3

11- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (حصہ صرف) (ایضاً) ص 139

12- ایضاً ، ص 147

13- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، ہندوستانی گرامر، مقدمہ (لاہور، مجلس ترقی ادب، 7
ص 3، 4

14- مولوی عبدالحق ، قواعد اردو (ایضاً) ص 16

15- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد (ایضاً) ص 154

16- ایضاً ، ص 156

17- ایضاً ، ص 155، 156

18- ایضاً ، ص 174، 175، 179

19- ایضاً ، ص 176، 177

20- " مصباح القواعد " کے دیباچے سے پہلے درج شدہ تاریخی قطعے میں سن 1896ء درج ہے۔

21- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ، 1973ء) ص ی ، ک

22- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، جامع القواعد ، (حصہ صرف) (ایضاً) ص 180

23- مولوی عبدالحق ، قواعد اردو (ایضاً) ص 30

24- ایضاً ، ص 24

25- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (ایضاً) ص ک

26- مولوی زین العابدین فرجاد کوتانوی ، آئین اردو (دیباچہ) (میرٹھ، نامی بک ڈپو، 1926ء) ص 1

27- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ، جامع القواعد (حصہ نحو) (ایضاً) ص ل

28- مولوی زین العابدین فرجاد کوتانوی ، آئین اردو (دیباچہ) (ایضاً) ص 1

29- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ جامع القواعد (حصہ نحو) (ایضاً) ص ل

30- پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ، کیفیہ، (لاہور، مکتبہ معین الادب، 1950ء) ص 280، 281

31- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ، مقدمہ، جامع القواعد (ایضاً) ص ن

32- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، لسانیات کے بنیادی اصول (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1985ء) ص 67

33- ایضاً ، ص 89

34- ڈاکٹر اقتدار حسین خاں، اردو صرف و نحو (نئی دہلی ،ترقی اردو بیورو، 1985ء) ص 70

35- عصمت جاوید ، نئی اردو قواعد (لاہور، کمبائنڈ پبلشرز، 1988ء) ص 15 تا 17

آٹھواں باب

لغت نویسی

=·=·=·=·=·=·=·=

لفظ اور معنی کے تعلق پر زمانہ قدیم سے اہل علم اور فلسفی غور و فکر کرتے رہے
لسانی مطالعے کی قدیم ترین روایت میں مذہبی دستاویزات کی تفہیم کے لیے مشکل الفاظ کے
معنوں کی تشریح و تفسیر کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ قدیم ہند میں " نگھنٹو" پہلی دست
لغت ہے۔ جس میں منیوں نے " وید " کی تفہیم میں سہولت پیدا کرنے کے لیے مشکل الفاظ کے
معنوں کی وضاحت کی تھی۔ یاسک منی نے " نراکت " میں اس لغت کی تشریح کی اور اس میں اضا
کئے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں بھی لغت نویسی کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔
یونانی دانش ور ھومر اور دیگر کلاسیکی شاعروں کے کلام سے مشکل الفاظ کی فہرست مرتب کر کے ا
کی تشریح و تفسیر کر دیتے تھے۔ یورپ میں آٹھویں صدی میں لاطینی بائبل کے مشکل الفاظ کی
تشریح کی گئی اور ان کی ایک فہرست تیار کر دی گئی۔ اس طرح لاطینی اینگلو سیکسن لغت تیار
ہو گئی۔(۱) ان لغات کو لغت نویسی کی روایت کے ابتدائی نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔

انسانی زبان کے معنی کے مطالعے کو " معنیات" سے موسوم کیا جاتا ہے، کلمے جو نطقی
آوازوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، کسی شے پر دلالت کرتے ہیں۔ کلام جن علاماتی آوازوں پر مشتمل ہ
ہے وہ مقصود بالذات نہیں ہوتیں بلکہ ان میں اور ان کے مجموعے یعنی کلموں کے سماجی استعمال
میں دلالت کا رشتہ ہوتا ہے۔ اس کا سائنسی مطالعہ " معنیات" ہے۔ بلوم فیلڈ نے زبان کے بیان
اور اس کی توضیح کے دو مرحلے بتائے ہیں، ایک فونولوجی اور دوسرا معنیات ۔ اور معنیات کو
دو حصوں ، گریمر اور لغت میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ " لغت" کسی زبان کے

مجموعی مارفیموں کا مجموعہ ھی نہیں بلکہ لسانیات کا ایک شعبہ بھی ھے۔(2) پروفیسر خلیل صدیقی " لغت " کو لسانیات کی ایسی شاخ قرار دیتے ھیں جس میں ھر لسانی مد کا خصوصی توضیحی بیان ھوتا ھے۔ ان کا خیال ھے کہ جن لسانی مدوں کے مختصات " لغت " میں توجہ کا مرکز بنتے ھیں، وھی صوتیات ، فونولوجی ، گریمر وغیرہ میں بھی زیر بحث ھوتے ھیں، لیکن تعمیم شدہ صورت میں۔ گریمر میں تلفظ، املا وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جاتا ھے جو " لغت " سے مختص ھیں۔ لغت نویسی کا تعلق اجزائے زبان یا صوتی مرکبات کی تخصیصی تجرید یا معنیات سے ھے۔(3)

زبان کے مطالعے میں معانی کی دو شقیں زیر بحث آتی ھیں، لغوی اور قواعدی۔ دونوں میں گہرا اور قریبی تعلق ھے۔ لغوی معنی کلمے کی انفرادی سطح پر توضیح کرتے ھیں اور قواعدی معنی کلمے کی دوسرے کلموں سے تعلق کے حوالے سے توضیح کرتے ھیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی کلمے کی لغوی اور قواعدی حیثیتوں کی وضاحت کرتے ھوئے لکھتے ھیں،

" لغت کے ھر رکن کی اپنی تعریف و توضیح ھوتی ھے، دوسرے ارکان کے صراحت سے ممیز۔ ھر کلمے کے مدلول پر توجہ مرکوز کی جاتی ھے۔ گرامر میں اس کلمے کی تجرید اور تعمیم پر نظر ھوتی ھے جو دوسرے کلمے میں مشترک حیثیت رکھتی ھو اور اصول اور قاعدے کی تدوین میں ممدو معاون ھو سکے۔ ھر کلمہ (لغوی ھیئت) قواعدی ھیئتوں سے دو طرح نسبت رکھتا ھے۔ تجریدی حیثیت میں بامعنی قواعدی ساخت کا مظہر بھی ھو سکتا ھے۔ متصرف یا ترمیم شدہ مارفیم کی حیثیت میں تصریفی یا تشکیلیاتی خصوصیات کا آئینہ دار ھوتا ھے۔" (4)

پروفیسر خلیل صدیقی بلوم فیلڈ کے حوالے سے لکھتے ھیں کہ بلوم فیلڈ لغت کو گریمر کا ضمیمہ بھی قرار دیتا ھے۔ اس کی یہ رائے ھے کہ کسی زبان کی لغت اس کے تمام مارفیموں کی دستاویز ھے اور ھر مارفیم کا جو بھی مفہوم ھوتا ھے، اختیاری روایت ھی کی بدولت ھوتا ھے اور وہ کسی

قواعدی زمرے سے منسوب ہو جاتا ہے۔ لغت اس کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس میں مخصوص الفاظ او
کی متعلقہ ہیتوں سے متعلق وہ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں جو گریمر کا تجزیہ فراہم کرتا

مالک رام لغت نویسی کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر لغت
مجموعہ ہے کسی زبان کے الفاظ کا اور لغت کی بنیادی غرض الفاظ کے معانی پیش کرنا ہے۔ (6)
پروفیسر نذیر احمد لغت نویسی کے اصول و قواعد کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لغت نویسو
کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ اصیل اور غیر اصیل کا فرق بتائے، محرف اور متروک کا تعین کرے، ش
اور قلیل الاستعمال کا امتیاز بھی۔ الفاظ کی املائی صورت کا تعین کرے، ضبط تلفظ بھی لغ
نویس کا اہم فریضہ ہے اور لفظ کے ماخذ کا تعین کرنا بھی۔ لغت نگار کا سب سے اہم اور بنیاد
کام لفظ کے معنی کی ایسی تشریح کرنا ہے جس سے اس کا پورا پورا مفہوم واضح ہو جائے۔ (7)

مولوی عبدالحق نے لغت نویسی کے اصول و قواعد کی اچھی توضیح و تشریح کی ہے۔ " ل
کبیر" کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ

" ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہو گا کہ وہ کب کس
طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا، اور اس کے بعد سے اور اس
وقت سے تاحال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے۔
اس کے کون کون سے معانی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی
ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معانی پیدا ہوئے۔ ان تمام
امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے
ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہو گی، یعنی یہ بتانا ہو
گا یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی
یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں
اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ کی تاریخی

حالت معلوم کرنے کے لیے اصل یا اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری

ہے۔" (8)

مولوی عبدالحق نے لغت نویسی کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ارد
لغات میں اکثر ہر لفظ کے سامنے کئی کئی مترادفات لکھ دئیے جاتے ہیں جب کہ سیاق و سباق کے
مطابق ان کے معانی کی تشریح و توضیح بھی کرنی چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ لغت نویس کا یہ
حق نہیں ہے کہ وہ لفظ کے مستند اور فصیح اور غیر فصیح ہونے کا فیصلہ کرے بلکہ لغت میں وہ سد
لفظ ہونے چاہئیں خواہ وہ رائج ہوں یا متروک اور ان کے تمام معانی اور استعمال درج کرنے لاز
ہیں۔ پیشہ وروں اور صناعوں کے الفاظ اور اصطلاحیں ہی نہیں بلکہ عام بول چال میں مروّج الفاظ
بھی لغت میں شامل ہونے چاہئیں۔ ان کا خیال ہے کہ لغت نویس ہر محاورے اور لفظ کے لیے سند
پیش کرے۔ لغت میں الفاظ کے صحیح تلفظ اور املا کی وضاحت بھی ہونا چاہیے۔

لغت نویسی کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے اردو کے بیشتر محققین نے لغت کے کسی ایک منص
پر ہی توجہ دی ہے۔ لغت کا منصب محض الفاظ کے مترادفات کی نشان دہی کرنا یا الفاظ کے معنی
درج کر دینا نہیں ہے یا محض اصیل اور غیر اصیل کا فرق بتانا اور محرف اور متروک کی نشان دہ
کرنا بھی نہیں ہے۔ الفاظ کے تلفظ اور املا کی توضیح اور لفظ کے ماخذ کا تعین لغت نگار کے
فرائض میں شامل تو ہے لیکن لغت نویسی کا فن محض انہی دائروں تک محدود نہیں ہے۔ مولوی
عبدالحق ایک صاحب نظر محقق تھے، انہوں نے اردو لغت نویسی کے تسامحات کو جانچ لیا اور لغت
نویسی کے جامع اصول وضع کئے۔ لیکن وہ ماہر لسانیات نہیں تھے اس لئے فن لغت نویسی کا لسانیاتی
نقطۂ نظر سے جائزہ نہیں لیا۔ اس کے باوجود انہوں نے لغت نویسی کے اصول و قواعد کا تعین
کر کے فن لغت نویسی کی عالمانہ توضیح و تشریح کی ہے۔

لغت کی تدوین و تالیف کے فن کو " Lexicography " کہتے ہیں۔ یہ لسانیا
کا ایک اہم شعبہ ہے اس لئے اسے بھی سائنس کا درجہ حاصل ہے۔ لغت ... کا ...

تصریح اور جامعیت و قطعیت کا متقاضی ہے۔ لغت کسی زبان کے تمام مارفیموں کا سرمایہ ہوتی ہے
جس میں ان کے تمام پہلوؤں کی صراحت کے ساتھ وضاحت ہونا چاہیے۔ پروفیسر خلیل صدیقی فن لغت
نویسی کی لسانیاتی نقطۂ نظر سے توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> " کسی زبان کی لغت کو اس زبان کے تمام مارفیموں ، ساقوں ، الفاظ، بنیادی
> تصریفات، مشتقات، مرکبات، محاوروں ، کہاوتوں ، نیز الفاظ کے مستند
> املا، تلفظ، مروّجہ لہجوں یا تلفظ کے انحرافات، معنی و مفہوم
> کے ساتھ ساتھ ان کی اصل صوتی و معنیاتی تغیرات اور روپ ، درجے،
> جنس (تذکیر و تانیث، اگر غیر حقیقی مستعمل ہیں) وغیرہ کا
> سرمایہ ہونا چاہیے۔ " (9)

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ کسی زبان کی لغت میں اس زبان کے آغاز سے زمانہ
اندراج تک کے تمام کلموں ، محاوروں ، کہاوتوں وغیرہ کو سمیٹ لینا عملاً ممکن نہیں ، تاہم کسی
قدیم دور کا تعین کر کے اس کے بعد کے سرمایہ الفاظ کی فہرست اور وضاحت کی جا سکتی ہے۔
ان کے صوتی و معنیاتی تغیرات اور متروکات کے ادوار کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ دخیل الفاظ
کے اصل سرچشموں اور ان الفاظ کے صوتی معنیاتی سفر کی روداد کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اور
ما قبل ادوار کی زبان کی الگ لغت مرتب کی جا سکتی ہے۔ حیات و کائنات کے مختلف مظاہر ---
جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کے انواع و اقسام --- درختوں ، پودوں ، پھولوں ، پھلوں ، سبزیوں
وغیرہ کے نام بھی زبان کا حصہ ہوتے ہیں ، انہیں بھی لغت میں جگہ ملنی چاہیے۔(10)

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ لغت نویسی کا تقاضا ہے کہ الفاظ کی تشریح نگاری
کے ساتھ ساتھ اشتقاق نگاری کو ملحوظ رکھا جائے۔ لفظ کی اصل کا کھوج لگانا، لغت نویس کا
اہم فرض ہے۔ اسے یہ بتانا چاہیے کہ لفظ، زبان کا اپنا ہے یا دخیل ۔ دخیل ہے تو کس زبان سے
لیا گیا ہے، اس نے کون کون سے صوتی و معنیاتی مراحل طے کئے ہیں۔ زبان نے جن زبانوں سے

استفادہ کیا ہے، لغت نویس کو ان زبانوں پر دسترس اور اپنی زبان کی قدیم دستاویزوں تک رسائی حاصل ہونا چاہیے۔ لغت میں ادبی اور علمی و فنی اصطلاحات کی توضیح و تشریح ہونا چاہیے۔ لغت نویس کو لفظ کی تشریح کرتے ہوئے، اس کے لطیف و باریک معنی و مفہوم کے بھرپور بیان اور معین تصورات کو سامنے لانے کے لیے محل استعمال اور سیاق و سباق کی مدد سے اخذ و استنباط کی صلاحیت سے کام لینا چاہیے۔ اسے زبان پر قدرت حاصل ہو اور اس کا مطالعہ وسیع ہو۔ لفظ کی تشریح و توضیح کرنے کے ساتھ تلفظ اور املا کی معیاری اور مروّجہ عوامی صورتیں بھی بتائی جائیں اور تلفظ کے انحرافات کی نشان دہی بھی کی جائے۔ تلفظ کی وضاحت کے لیے ارکان یا سلیبل کے حدود کا تعین کیا جا سکتا ہے اور صوت نگاری سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔(11)

پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ لغت کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ لفظ اسی زبان کا ہے یا دوسری زبان کا۔ معیاری ہے یا غیر فصیح۔ عامیانہ ہے یا رکیک، اور سوسائٹی کے کس طبقے یا شعبہ علم سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا لفظ پر اسلوبیاتی اور شعبہ جاتی ٹھپہ ہونا چاہیے۔ ایک لفظ سے کئی لفظ مشتق ہوتے ہیں۔ لہذا مشتقات کی کئی نوعیتیں اور صورتیں ہوتی ہیں۔ لغت میں ان کی تفصیل اور توضیح بھی ضروری ہے۔ لفظ کے روپ حتمے اور قواعدی زمرے کی نشان دہی بھی کی جانی چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ فصحا اور خواص کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے روزمرہ محاوروں، کہاوتوں، پھبتیوں، بھیری والوں کے کلموں، عورتوں کے مخصوص روزمرہ محاوروں، کوسنوں، ٹوٹکوں، لوریوں وغیرہ کو لغت میں شمولیت کا حق ہے۔(12)

لغت کی کئی قسمیں ہیں۔ عام لغت، جس میں کسی زبان کے معنی کے مترادفات دئیے جاتے ہیں اور معانی کی توضیح کر دی جاتی ہے۔ تاریخی و اشتقاقیاتی لغت میں لفظ کے معنی کی تشریح و توضیح کرنے کے ساتھ، اس کے ماخذ، دور بہ دور ارتقاء کی صورتوں اور صوتی، صوری اور معنوی تغیرات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ تقابلی لغت میں دو یا زیادہ ہم خاندان زبانوں کے الفاظ میں تقابل کر کے ان کے ماخذ اور ارتقائی ادوار کی صورتوں کی توضیح کی جاتی ہے۔ اس میں مختلف زبانوں کے مترادف الفاظ نہیں دئیے جاتے بلکہ متحد الاصل زبانوں

کے متحد الماخذ الفاظ جو ہم رشتہ زبانوں میں الگ الگ لسانی ماحول میں ارتقاء پذیر رہے، کا تاریخی و تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ آر۔ ایل۔ ٹرنر کی " ہند آریائی زبانوں کی تقابلی لغت" (1966ء) ہند آریائی زبانوں کی عظیم تقابلی لغت ہے۔ ذو لسانی لغت میں دو زبانوں کے الفاظ کے مترادفات درج کر کے معنوں کی تشریح کی جاتی ہے اور کثیر لسانی لغات میں دو سے زائد زبانوں کے الفاظ کے مترادفات دیے دئیے جاتے ہیں اور ان کے معانی کی تشریح کردی جاتی ہے۔ روزمرہ اور محاورات کی لغت میں روزمرہ اور محاورات کی فہرست دینے کے ساتھ ان کے معانی کی وضاحت بھی کر دی جاتی ہے۔ ضرب الامثال کی لغت میں ضرب الامثال کی فہرست درج کرنے کے ساتھ ان کے پس منظر اور معانی کی تشریح کی جاتی ہے۔ تذکیر و تانیث کی لغت، اور عورتوں کی زبان کی لغت بھی اسی زمرے میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ علمی و فنی اصطلاحات کی لغت میں مختلف علوم و فنون سے متعلق اصطلاحات کی توضیح و تشریح کی جاتی ہے۔ یہ لغات ہر علم و فن کے لیے علیحدہ علیحدہ حیثیتوں میں ہوتی ہیں، جیسے طبیعات کی اصطلاحات کی لغت، میڈیکل کی اصطلاحات کی لغت، لسانیات کی اصطلاحات کی لغت۔ ان لغات کی اپنی اپنی حیثیت میں اہمیت و افادیت ہے لیکن کسی زبان کے حوالے سے لسانیاتی نقطۂ نظر سے تاریخی و اشتقاقیاتی لغت اور تقابلی لغت کی اہمیت زیادہ ہے۔

اردو میں لغت نویسی کی روایت:

اردو میں لغت کی تالیف و تدوین کی روایت کے ابتدائی نقوش ان فارسی لغات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں، جو ہندوستان میں چودھویں صدی عیسوی تا سولہویں صدی عیسوی میں مدوّن کی گئیں۔ ان لغات میں کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے قدیم اردو (ہندی) مترادف بھی دئیے گئے ہیں۔ یہ اردو کی لغات کہلائے جانے کی مستحق تو نہیں ہیں البتہ ان میں سے اردو الفاظ کے معنی، تلفظ اور املا کی فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ ان فارسی لغات میں " فرہنگ نامہ" (1315ء) " دستورالافاضل" (1371ء)

" ادات الفضلا " (1428ء) (مولف : قاضی خاں ملا بدر دھلوی) " بحرالفضائل فی منافع الافاضل " (1433ء) (مولف : مولانا فضل الدین محمد قوام) ، " شرف نامہ منیری " (1459ء) ، " تحفتہ السعادت " (1510ء) ، " مویدالفضلا " (1519ء) ، اھم ھیں۔ مولوی عبدالحق انہیں اردو لغات تسلیم نہیں کرتے۔ (13) بلاشبہ ان کا موقف صحیح ھے، یہ اردو لغات نہیں ھیں لیکن ان میں اردو لغت کا ابتدائی خاکہ ضرور نظر آتا ھے۔ یورپ میں بھی لاطینی بائبل اور ھومر اور دوسرے کلاسیکل شاعروں کے مشکل الفاظ کی تفہیم کے لیے معنی کی تشریح کی جاتی تھی، جسے انگریزی لغت کے ابتدائی نقوش قرار دیا گیا ھے۔

ان فارسی لغات کے علاوہ مغلیہ عہد کے آغاز سے ھندی (قدیم اردو) کے ذریعے فارسی اور عربی کے ابتدائی ذخیرہ الفاظ پر عبور حاصل کرنے کے لیے ان ابتدائی تعلیمی کتابوں کا رواج ھوا جنہیں نصاب کہا جاتا تھا۔ نصابوں میں اردو فارسی یا اردو عربی مترادفات، عموماً فارسی مصرعوں میں پیش کئے جاتے تھے۔ خالق باری ۔ رازق باری ۔ حامد باری۔ ایزد باری ۔ واحد باری۔ صمد باری ۔ بارک باری ۔ اللہ باری۔ قادر نامہ وغیرہ اسی طرح کے نصاب ھیں۔(14) مولوی عبدالحق انہیں بھی اردو لغات تسلیم نہیں کرتے۔ یہ اردو لغات ھیں بھی نہیں، لیکن پروفیسر خلیل صدیقی کی یہ رائے صائب ھے کہ انہیں محدود معنی میں " لغات " سے تعبیر کیا جا سکتا ھے۔ (15) اس عہد میں ایسی کوئی سیاسی اور سماجی ضرورت نہیں تھی کہ اردو لغت مدوّن کی جاتی البتہ جس قدر ضرورت تھی اس کے پیش نظر اردو الفاظ کی فارسی لغات یا نصابوں میں وضاحت کی گئی ھے۔ اس عہد میں سماجی و تہذیبی میل جول کے نتیجے میں قدیم ھندی (اردو) الفاظ و مفردات اور محاورات فارسی تصانیف کا جزو بنتے گئے، اور فارسی لغات میں علمی ضرورت کے تحت فارسی تشریحوں کے ساتھ ھندی (اردو) الفاظ بھی شامل کئے جانے لگے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا خیال ھے کہ تاریخ ھندوستان کے عہد اسلامی میں فارسی کی تحصیل و تدریس معاشی اور وقار کے اعتبار سے بڑی اھم چیز تھی۔ ھندوستانی بچوں کے لیے قدرتی طور پر یہ ضروری تھا کہ وہ

فارسی و عربی کو اپنی مادری زبان کے ذریعے سیکھیں چناں چہ اس غرض کے لیے ابتدائی تعلیمی
کتابوں کا رواج ہوا جن کو نصاب کہا جاتا تھا۔ ان نصابوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی
بچے ہندی کی مدد سے فارسی یا عربی کے ابتدائی ذخیرۂ الفاظ پر عبور حاصل کر لیں۔ اورنگ
زیب کے زمانے میں اور اس کے بعد نصابوں کی کثرت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس زمانے میں اردو،
ہندی، تعلیمی ضرورتوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگی تھی اور دیسی زبان کی ضرورت و
اہمیت کا عموماً اعتراف کر لیا گیا تھا۔(16)

شاہ جہانی عہد میں مخصوص سماجی رجحانات کے زیر اثر اردو کو فروغ حاصل ہوا اور
رفتہ رفتہ یہ علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل کرنے لگی۔ ہندوستان کے عام اہل علم فارسی کے سا
اردو پر بھی توجہ دینے لگے اور رفتہ رفتہ اسے تعلیمی زبان کی حیثیت حاصل ہونے لگی۔ ڈاکٹر
سیّد عبداللہ نے عہد شاہ جہانی میں ایک ادبی تحریک کی نشان دہی کی ہے، جو دہلی سے
کچھ دور ہریانہ کے علاقے میں پیدا ہوئی اور ہریانہ کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کو بھی متاثر کیا۔
ان کے مطابق

"شمال میں دہلی سے پہلے اسی علاقے میں اردو کی تصنیفی تحریک
کا آغاز ہوتا ہے۔ چناں چہ منظومات کے علاوہ اردو کا پہلا فرہنگ بھی
اسی علاقے کی پیداوار ہے۔ میری مراد "غرائب اللغات" سے ہے جو
اگرچہ غایت اور مقصد کے اعتبار سے اردو کا لغت نہیں مگر اسلوب
اور فائدے کے لحاظ سے ہم اس کو یقیناً اردو کا پہلا فرہنگ قرار دے
سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غرائب اللغات کو اس کی لسانی اہمیت
کے پیش نظر اردو زبان کا کوئی محقق اور طالب علم نظر انداز نہیں
کر سکتا۔" (17)

میر عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات" تدریسی ضرورت کے تحت تالیف کی اور یہ

اردو کی ابتدائی لغت ہے، اس لئے اس میں وہ تمام خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں، جو تدریسی ضرورت کے تحت تالیف کی گئی اولین لغات میں ہوتی ہیں۔ اس میں الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں لیکن اس میں بے قاعدگی بھی نظر آتی ہے۔ اردو الفاظ کے معنی کی تشریح عربی یا فارسی الفاظ کے مترادفات دے کر کی گئی ہے لیکن ان میں لطیف فرق کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مولف نے اردو الفاظ کے ہریانی تلفظ اور لہجے کو ملحوظ رکھا ہے، جسے ان کا قصباتی پن قرار دے کر تنقید بھی کی گئی ہے لیکن یہی اس لغت کی لسانی خصوصیت بھی ہے کہ اس سے اس عہد کی عام بول چال کی اردو کے الفاظ بلکہ ان کے عام تلفظ اور لہجے کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ " غرائب اللغات " اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر ایک خاص امتیاز کی مالک ہے کیوں کہ یہ کتاب اس وقت کی مروجہ اردو زبان سے روشناس کراتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غرائب اللغات اپنی خامیوں کے باوجود تاریخ زبان اردو کے محقق کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔(8 اس لغت میں عوامی زبان کو جو اہمیت دی گئی ہے، اس سے مولف کے لسانی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ یہ بات فاضل مولف کے صحیح ذوق پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے صرف وہی الفاظ نہیں لکھے جو لغت کی کتابوں میں ملتے ہیں بلکہ عام بول چال کی زبان کے الفاظ بھی شامل کئے ہیں اور ان کے عوامی تلفظ اور لہجے کی نشان دہی بھی کی ہے۔ گو وہ اصل کی رو سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ (19) پروفیسر خلیل صدیقی نے غرائب اللغات کو تحقیق و صحت کے لحاظ سے بہت اچھی لغت قرار نہیں دیا لیکن اس کے باوجود ان کا خیال ہے کہ اردو لغت کا یہ نقش اول تقدم زمانی ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی لسانی خصوصیات کی بدولت بھی، قابل قدر ہے۔(20)

سراج الدین علی خاں آرزو کی " نوادر الالفاظ " (1125ھ) بمطابق 1751ء) ایک معیاری اور بلند پایہ لغت ہے۔ اس میں آرزو نے " غرائب اللغات " کی غلطیوں کی تصحیح و ترمیم بھی کی ہے اور عالمانہ اضافے بھی۔ اردو لغت نویسی کی روایت میں " نوادر الالفاظ " کی اپنی ایک

مستقل حیثیت ہے۔ آرزو نے " غرائب اللغات" میں لفظی ترتیب کی بے قاعدگی کے سقم کو د
انہوں نے اردو الفاظ کے محض عربی ، فارسی مترادفات نہیں دئیے بلکہ ان میں معنی کے لحا
امتیاز کی نشان دہی بھی کی ، اور اردو الفاظ کے معنوں کی تشریح بھی کی ۔ " غرائب الل
دخیل الفاظ کو عربی فارسی قرار دیا گیا تھا جب کہ آرزو نے انہیں اردو الفاظ کی حیثیت
لغت میں شامل کیا۔ عبدالواسع ہانسوی نے قصباتی تلفظ کو بھی معیاری اور جہلا اور عوام
کو مستند قرار دیا تھا لیکن آرزو نے اپنے عہد کی معیاری اور ٹکسالی زبان سے فصاحت کی
لی ، انہوں نے مترادف الفاظ کے معنیاتی فرق کی لطافتوں کی وضاحت کی اور لفظوں کی ع
سے تشریح کر کے ان کے مفاہیم کا صحیح تعین کیا۔ ان کی تشریح میں ابہام نہیں صراحت
اس سلسلے میں ان کی توضیحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دیگر لغات اور فرہنگوں کا
نہیں کیا بلکہ خود تحقیق کی اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے مدد بھی لی ۔ دخیل الفاظ
ذیل میں انہوں نے ان کی اصل کو نہیں بلکہ مروّجہ صورت کو سند ٹھہرایا۔ اس سلسلے میر
خیال ہے کہ دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا م
اختیار کی جائے جو اہل زبان (عوام و خواص دونوں) میں رواج پذیر ہو چکی ہو۔ ایسے ل
کے لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں ، البتہ یہ ضرور ہے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت
رہنی چاہیے جو محض عوام ہی میں مروّج نہ ہو بلکہ عام و خاص کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہ
آرزو نے اردو الفاظ کے تلفظ کے لیے برج اور گوالیار کی اردو سے سند لی ہے ، جو ان کے
نزدیک فصیح ترین ہے۔ وہ زبان دہلی پر اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے الفا
پنجابی ، ہریانی اور راجستھانی تلفظ بھی بتایا ہے۔ عبدالواسع ہانسوی نے ہریانوی زبان ک
معیاری تسلیم کر کے تلفظ کی سند لی تھی ۔ آرزو نے اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اس ت
کو قصباتی اور گنوارو قرار دیا لیکن خود برج اور گوالیار کی زبان کو معیار تسلیم کر کے تلفظ
فصاحت کی سند قرار دیا۔ جب کہ بعد میں اہل اردو نے اسے بھی قصباتی اور گنوارو قرار د

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ غرائب اللغات اور نوادرالالفاظ دونوں ایک ہی زبان کے مختلف رنگوں کا اظہار کرتی ہیں۔ غرائب اور نوادر کی زبان اور الفاظ کا فرق نہ صرف قصباتی اور شہری محاورے کا ہے بلکہ اس سے اورنگ زیب اور محمد شاہ اور احمد شاہ کے ادوار کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ غرائب اور نوادر کے مطالعہ سے اردو زبان کی تاریخ کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس پہلو کا تعلق دخیل الفاظ سے ہے۔ یعنی عربی فارسی اور ترکی کے ان الفاظ سے جو ھانسوی اور آرزو کے زمانے تک جزو زبان بن چکے تھے۔ (22)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے غرائب کے برعکس نوادر کو ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس لغت کے ناقدانہ حواشی فارسی اور اردو لغات میں اس کتاب کو بلند مقام اور رتبہ بخشتے ہیں۔ انہوں نے آرزو کو اردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار تسلیم کیا ہے۔ (23)

پروفیسر خلیل صدیقی نے "نوادرالالفاظ" کی ایک اور خصوصیت کی نشان دہی بھی کی ہے ان کا خیال ہے کہ "نوادر" کی ایک خصوصیت انسائیکلو پیڈیائی معلومات کی فراہمی بھی ہے۔ مجلسی زندگی، رسم و رواج، درختوں، پودوں، پھلوں، عام استعمال کی چیزوں سے متعلق تفصیلی اور معلوماتی بیانات ملتے ہیں۔ کچھ مسلمات کی تکذیب بھی ہوتی ہے۔ (24)

سراج الدین علی خاں آرزو ایک صاحب نظر محقق تھے، ان کے لسانیاتی شعور کا اندازہ "نوادرالالفاظ" سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں لغت نویسی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے سنسکرت اور فارسی الفاظ کے ماخذ کی تحقیق کرتے ہوئے ان میں مماثلت کی نشان دہی کی ہے، جو ان کی عمیق نظر اور لسانیاتی شعور کی مظہر ہے۔ "نوادرالالفاظ" اردو لغت نویسی کی روایت میں ایک اہم حیثیت اور مقام کی حامل ہے۔

ھندوستان کے مقامی اہل علم طبقے کے علاوہ باہر سے آنے والوں نے بھی اپنے مخصوص

مقاصد کے تحت اردو لغات مرتب کیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپی مہم جوؤں کے
ساتھ آنے والے عیسائی مبلغین نے عیسائیت کی تبلیغ کے مقصد سے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں۔
انہیں اردو کی اہمیت کا احساس ہوا تو اس کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ اردو (قدیم ہندی)
رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس لئے اردو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے اردو
لغت کی ضرورت اور اہمیت کا احساس یورپی عیسائی مبلغین کو اور بعد ازاں انگریزی حکومت کے اہل
کاروں کو ہوا، تو اردو لغت کی تدوین کی طرف توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق
کے مطابق سولہویں صدی میں تالیف کی گئی سہ لسانی اردو لغت جیرونیمو زاویر (Jeronimo
Kavier) نے مدوّن کی۔ اس لغت کا نام Vocabularium Portugalico
Hindustano - Persicum ہے۔ اور اسے اردو کی قدیم ترین لغت قرار دیا جا سکتا ہے۔
اسی دور میں انتونیو دی سلدانھا (Antonio de Saldhana) نے کونکنی کے لغات
کا ایک رسالہ مرتب کیا۔ سترھویں صدی ہی میں اگناسیو آرکامو نے (Ignacio Arcamono
نے کونکنی اور دکھنی (قدیم اردو) کا ایک لغت لکھا، جس میں لاطینی مترادفات بھی دئیے۔
اٹھارویں صدی کے آغاز میں گیساپے ماریا دی برنینی داکا گنانو (Guṡsapple Maria de Bermini
نے دو لغات: ہندی، لاطینی، اطالوی لغت اور اطالوی ہندی لغت مرتب کیں۔ اسی دور میں
فرانسس ماری دا تورس (Francois Marie de Tours) نے مترادفات زبان ہندوستانی
مرتب کی۔ اٹھارویں صدی میں یو جینو تری گوئیٹس (Eugino Trigueritous) نے دو
لغات: " پرتگالی ہندوستانی فارسی لغت" اور دوسری لغت " زبان ہندوستانی " مدوّن کیں۔
اسٹیفانس پیٹرو (Stophamus a.s. Petro) نے اطالوی ہندوستانی، ہندوستانی۔
اطالوی " لغت مرتب کی۔" مولوی عبدالحق نے ان کے علاوہ اٹھارویں صدی کے چند لغت نویس
کا ذکر کیا ہے۔ جان جیشوا کیٹلر (Jhon Joshua Ketelaer) کی LINGUA
HINDUSTANICA جو 1715ء میں شائع ہوئی۔ جارج ہیڈلے (George Hadley)
کی کتاب " صرف و نحو مع فرہنگ انگریزی و ہور (یعنی ہندوستانی) " 1772ء میں شائع ہوئی۔

اور جے فرگوسن (J. Furguson) کی لغت " انگریزی ھندوستانی اور ھندوستانی انگریزی " جو 1773ء میں شائع ھوئی ۔ جان گلکرسٹ کی انگریزی ھندوستانی لغت 1787ء سے 1790ء میں شائع ھوئی ۔ گلکرسٹ نے اپنی دوسری کتابوں میں اردو انگریزی فرھنگیں دی ھیں ۔ ھنری ھیرس کی (H. HARRIS) کی " انگریزی ھندوستانی لغت " 1790ء میں شائع ھوئی ۔ اس میں دکنی الفاظ خاص طور پر شامل کئے گئے ھیں ۔(25)

انیسویں صدی میں لغت نویسی کا یہ سلسلہ جاری رھا ۔ اٹھارویں صدی میں ھندوستان میں یوروپین کے تبلیغی ، تجارتی اور سیاسی مفادات بڑھتے گئے ۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک انگریزوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرلیا تھا ۔ اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے انہیں ایسے انگریز افسروں کی ضرورت تھی ، جو یہاں کی زبانوں اور تہذیب و تمدن کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتے ھوں ، چناں چہ دیگر علاقائی زبانوں کے علاوہ رابطے کی زبان اردو میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی ۔ ان اغراض و مقاصد کے تحت انیسویں صدی میں بہت سی لغات ترتیب دی گئیں ۔

یہ لغات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو سکھانے کے لیے مرتب کی گئیں تھیں ۔ ان کی تدوین کا اولین مقصد تدریسی تھا علمی نہ تھا ۔ ان میں اکثر فن لغت نویسی کے اصول و قواعد کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ۔ الفاظ کے انگریزی یا لاطینی مترادف دے دئیے گئے اور معنی کی تشریح نہیں کی گئی ۔ اکثر لغات میں کتابی زبان سے ذخیرہ الفاظ کا انتخاب کیا گیا ھے اور بول چال کی زبان کو نظر انداز کر دیا گیا ھے ۔ اردو الفاظ کا رومن رسم الخط میں تلفظ دیا گیا ھے تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین ان لغات سے استفادہ کر سکیں ۔ اس سلسلے کی ابتدائی لغات میں جو نقائص تھے وہ بعد کی لغات میں بھی نظر آتے ھیں ۔ اس لئے کہ مولفین نے خود تحقیق و جستجو کرنے کے بجائے اپنے پیش روؤں کی کورانہ تقلید ھی کی ، البتہ الفاظ میں اضافہ ھوتا رھا ۔ ڈبلیو ییٹس ، ایم ۔ ٹی ۔ آدم ، جے ۔ ٹی ۔ ٹامسن ، رابرٹ شیکسپیئر ڈولی ، این براش ، ڈبلیو کیمگان ، جے ۔ ڈی ۔ بیٹ کی لغات میں مذکورہ نقائص نظر آتے ھیں ۔

کیپٹن جوزف شیلر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے " ڈکشنری ۔ ہندوستانی اینڈ انگلش" 1905ء میں مرتب کی ، جسے ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے اضافے اور نظرثانی کے بعد 1808ء میں شائع کرایا۔ کارل میکال سمتھ کی " اردو انگریزی لغت" 1820ء میں شائع ہوئی ۔ یہ جوزف شیلر کی لغت پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ٹی آدم کی لغت " ہندی انگلش ڈکشنری" 1838ء میں کلکتے سے شائع ہوئی ۔ جے۔ ٹی ۔ تھامسن (جوزف) کی " اردو انگریزی لغات 1838ء میں شائع ہوئی ، جو مستند حوالوں سے حروف تہجی کے مطابق ترتیب دی گئی ۔ پرانسس ناتھے کی " ہندوستانی انگریزی لغات" 1847ء میں شائع ہوئی ۔ یہ لغت رومن حروف میں ہے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ای۔ جی ۔ لیزی رس نے نظرثانی کے بعد 1880ء میں بنارس سے شائع کیا۔ ڈبلیو ییٹس نے " ڈکشنری ہندوستانی اینڈ انگلش" مرتب کی ، جو 1847ء میں شائع ہوئی ۔ جی ۔ بنی ۔ ہنرل گردو کی " انگلش، ہندوستانی ڈکشنری 1865ء میں بمبئی سے شائع ہوئی ۔ کیپٹن جی ۔ ای ۔ بورڈیلے کی " اے ووکیبلری انگلش اینڈ ہندوستانی " 1868ء میں شائع ہوئی ۔ یہ صوبہ مدراس کے ملٹری کے طلباء کے لیے مرتب کی گئی اور اسے آسمانی ، زمینی ، آبی انسانی ، حیوانی نیز مختلف علمی ، فنی اور معاشرتی موضوعات کے تحت مرتب کیا گیا۔ جے۔ ڈی۔ بیٹ نے " ہندی زبان کی لغت" مرتب کی ، جو 1875ء میں شائع ہوئی چارلس جیمز لائل کی " نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری" 1879ء میں شائع ہوئی ۔ جارج کلینڈ واٹ ورتھ کی " اینگلو انڈین ڈکشنری" 1885ء میں شائع ہوئی ۔ اس میں ہندوستانی الفاظ رومن رسم الخط میں اور معنی انگریزی زبان میں ہیں۔ ڈی۔ سی۔ فلوٹ نے اعلیٰ طلبہ کی قابلیت کے لیے ایک لغت " انگریزی ، ہندی ذخیرہ الفاظ" مرتب کی ، جو 1911ء میں شائع ہوئی ۔ اس میں اردو معنی کی وضاحت رومن رسم الخط میں کی گئی ہے۔ (اس فہرست کی تیاری کے لیے ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری کی کتاب " کتابیات لغات اردو" (1986ء) سے مدد لی گئی ہے۔) اس فہرست میں ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن ، جان شیکسپئر، ڈنکن فوربس اور جان ٹی پلیٹس کی لغات شامل نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر آئندہ صفحات میں ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اس عہد کی چند لغات ایسی بھی ہیں جن میں علمی انداز اختیار کیا گیا ہے اور تحقیق و جستجو سے ان کے معیار کو بلند کیا گیا ہے۔ جان گلکرسٹ، جان شیکسپیئر، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن اور جان ٹی۔ پلیٹس کی لغات میں فن لغت نویسی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس لئے ان کی اردو لغت نویسی کی روایت میں خاص اہمیت ہے۔ جان گلکرسٹ کی "اے ڈکشنری۔ انگلش اینڈ ہندوستانی" (1790ء) نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی زبان کے ساتھ بول چال کی زبان کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ گلکرسٹ نے اس لغت کی تدوین میں دیسی منشیوں سے بھی مدد لی۔ اس نے الفاظ کے محل استعمال اور سیاق و سباق سے معنی و مفہوم کی توضیح کرنے کی کوشش کی۔ اردو الفاظ کے انگریزی مترادفات دئیے ہیں، لیکن پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ وہ اس معاملے میں افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔ اس نے بعض اوقات لفظ کی اصل اور معنی کے تعین کے سلسلے میں قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے گلکرسٹ کی فروگذاشتوں اور تسامحات کی نشان دہی کرنے کے بعد اس کی لغت نویسی کی ان خصوصیات کا جائزہ بھی لیا ہے، جو اسے اس کے دیگر ہم عصر لغت نویسوں میں ممتاز کر دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بول چال کی زبان اور عام مروّجہ الفاظ پر توجہ دینا، معنی و مفہوم کے تعین میں سمعی تجربوں، محل استعمال، سیاق و سباق کا سہارا، اہل زبان کی توثیق اور اساتذہ کے کلام سے رہنمائی حاصل کرنا لغت نویسی کا بنیادی فریضہ ہے، جسے گلکرسٹ نے ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ٹکسالی اور معیاری زبان تک خود کو محدود نہیں کیا بلکہ عام اور غیر معیاری زبان کو بھی درخور اعتنا سمجھا۔ تلفظ کے انحرافات بھی بتائے اور معیاری اور غیر معیاری کی نشان دہی بھی کی۔ الفاظ کے استعمال کی وضاحت کے لیے فقرے، کہاوتیں اور اساتذہ کے اشعار بھی پیش کئے اور اپنی تحقیق کی تنقیح، ترمیم و اصلاح بھی کرتا رہا۔(26) گلکرسٹ کی اس لغت نے دور رس اثرات مرتب کئے اور بعد کے یورپی لغت نویسوں نے اس کی تقلید بھی کی۔ گلکرسٹ کی دیگر کتب میں اردو انگریزی فرہنگیں شامل ہیں لیکن اصل اہمیت اس کی اسی لغت کو حاصل ہے جو بعد میں اصلاح و ترمیم کے ساتھ

" ہندوستانی فلالوجی مع انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت" 1810ء میں شائع ہوئی ۔

جان شیکسپیئر " ہندوستانی (اردو) انگریزی اور انگریزی ہندوستانی لغت" (1817ء) ہے اس میں اردو الفاظ اردو حروف تہجی کی ترتیب سے دئیے گئے ہیں اور دیوناگری اور رومن رسم الخط میں تلفظ کی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں انگریزی مترادفات دینے کے ساتھ معنی کی تشریح انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اس کے برعکس ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ شیکسپیئر نے جوزف ٹیلر کی لغت سے استفادہ کیا ہے۔ اور ترمیم و اضافہ سے اسے ایک مستقل اور معیاری لغت کی حیثیت دے دی ہے۔ اس نے قواعدی زمروں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا۔ گویا اس نے جدید لغت نویسی کے کچھ اصول پیش نظر رکھ کر لغت کی تدوین کی ہے۔(27) اس لغت کا دوسرا ایڈیشن 1820ء تیسرا ایڈیشن 1834ء اور چوتھا ایڈیشن 1849ء میں شائع ہوا۔ ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافے کئے گئے لیکن چوتھے ایڈیشن میں جو اضافے ہوئے اس سے اس کی حیثیت جامع ہو گئی ۔ چوتھے ایڈیشن میں دکنی زبان کے الفاظ بھی شامل کئے گئے جن کا ماخذ مولوی عبدالحق کے مطابق ڈاکٹر ہیرس کی لغت اور بعض دکنی کتابیں تھیں۔(28) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام اردو کی چند قدیم لغات کا تحقیقی و لسانی مطالعہ کیا گیا ہے جو " کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" کے عنوان سے متعدد جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے کی تیسری جلد میں وارث سرہندی نے شیکسپیئر کی لغت کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔

ڈنکن فاربس کی لغت" ہندوستانی انگریزی، انگریزی ہندوستانی ڈکشنری " 1848ء میں شائع ہوئی ۔ یہ معیاری لغت نہیں ہے۔ فاربس نے شیکسپیئر کی لغت کے خطوط پر یہ لغت مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی حیثیت کو نہ پہنچ سکا۔ اس نے ہم صوت، مختلف المعنی اور اشتقاقیاتی اعتبار سے بے تعلق الفاظ کو بھی الگ الگ الفاظ کی حیثیت نہیں دی۔ تلفظ اور قواعدی زمروں

سے بھی کچھ بے اعتنائی برتی ہے۔(۲۹) فاربس نے البتہ اپنے پیش روؤں کی نسبت زیادہ الفاظ اپنی لغت میں شامل کئے۔

ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن کی پہلی لغت "انگریزی اردو قانونی و تجارتی لغات" 1858ء میں شائع ہوئی۔ اس کی ایک لغت "اردو، لاطینی اور انگریزی ذخیرۂ الفاظ" 1882ء میں شائع ہوئی اس نے لالہ فقیر چند کی اعانت سے "نیو انگریزی ہندوستانی ڈکشنری" مرتب کی۔ لیکن اس کی مشہور و معروف لغت دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس کا پہلا حصہ "نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری" 1879ء میں شائع ہوا اور دوسرا حصہ "نیو انگلش، ہندوستانی ڈکشنری" 1883ء میں شائع ہوا۔ اس لغت کی تدوین میں مولوی سید احمد دہلوی (مولف : فرہنگ آصفیہ) نے اس کے معاون کے طور پر کام کیا۔ (30) ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری کی تحقیق کے مطابق اس لغت کی تکمیل سے قبل فیلن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کی تکمیل اس کے معاونین ، لالہ فقیر چند ، لالہ چرنجی لال ، لالہ ٹھاکر داس ، لالہ جگن ناتھ اور مسٹر والٹنگ نے کی۔(31)

فیلن کی اس لغت میں اردو لفظ اردو رسم الخط میں ، حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے دئیے گئے ہیں اور ان کا املا دیوناگری میں بھی دیا گیا۔ تلفظ کی وضاحت رومن میں کی گئی ہے۔ اردو الفاظ کے انگریزی مترادفات دئیے گئے ہیں اور کہیں کہیں معنی کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اس نے ہر لفظ کی اصل کی نشان دہی تو کی ہے لیکن اس کی تاریخ یا اشتقاق کی تحقیق نہیں کی ہے۔ فیلن نے اپنی لغت میں ادبی زبان کے الفاظ کو شامل نہیں کیا بلکہ صرف بول چال کی زبان پر توجہ مرکوز کی ہے وہ ادبی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کو لغت کا حصہ نہیں سمجھتا۔ اس کی وضاحت اس نے اس لغت کے دیباچے میں کی ہے، اس کا خیال ہے کہ زبان کا اصل سرمایہ تو عوامی بول چال ہے۔ جب کہ برصغیر کی لغات میں عام طور پر بول چال کی زبان نہیں ملتی۔ اس کا خیال ہے کہ عربی ، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ اردو زبان و ادب میں عام طور پر مروّج ہیں لیکن یہ الفاظ محض علمی فضیلت ثابت کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں لہٰذا ہندوستانی

لغت میں بول چال کی عوامی زبان ، عامیانہ کلموں ، عوامی طبقوں کے روزمرہ، محاوروں اور کہ

کو شامل کرنا چاهیے اور کلموں کے تلفظ کے انحرافات اور مختلف صورتوں کی وضاحت هونا چاهیے

مثالیں بھی عام بول چال کی زبان سے لی جانی چاهئیں۔ خواہ تحریر یا ادب میں ان کی حر

کچھ بھی نہ هو۔ اس نقطۂ نظر سے فیلن نے اپنی لغت میں اردو کے بول چال کے الفاظ،عو

کی خاص زبان ، محاوروں ، کہاوتوں ، پہلیوں ، ان کے ماخذ اور صراحت پر توجہ دی هے۔(32) ا

کے نقطۂ نظر سے مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ادبی زبان بھی زبان کا حصہ هوتی

اور ان الفاظ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جو ادب میں استعمال هوتے هیں۔ اس لئے پرو

خلیل صدیقی کی یہ رائے صائب هے کہ " اگر وہ ادبی زبان کو مصنوعی قرار دے کر " لغت

نہ کرتا تو اس کی لغت کامل اور جامع لغت هوتی ۔ تاهم وہ پلیٹس کے سوا تمام لغت نویسوں کے

مقابلے پر ممتاز نظر آتا هے اور اس کی لغت، دوسروں کی لغات سے زیادہ مکمل لغت هے۔ پلیٹس

کے نقطۂ نظر پر اعتراض کرنے کے باوجود اس کے لغت کو قابل قدر قرار دیتا هے۔" (33) وارث

سرهندی کا خیال هے کہ فیلن نے اردو کے تحریری سرمائے پر انحصار کرنے کے بجائے بول چال کی

زبانوں کے الفاظ و تراکیب اور محاورات و اصطلاحات فراهم کیں اور لوک کہانیوں اور لوک گیتوں

سند پیش کی ، جس سے اس کی لغت کی قدر و قیمت میں اضافہ هوا ، لیکن اس کی لغت میں

ناهمواریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی هیں۔ وارث سرهندی نے فیلن کی لغت کا تفصیل سے

ناقدانہ جائزہ لیتے هوئے اس کی فروگذاشتوں کی نشان دهی کی هے۔ /" کتب لغات کا تحقیقی (یہ تحقیقی مطالعہ)

لسانی جائزہ" (1987ء) کے سلسلے کی جلد دوم کی صورت میں شائع هوا هے۔

اردو لغت نویسی کی اس روایت میں یوریشین لغت نگاروں میں پلیٹس نمایاں ترین حیثیت

رکھتا هے۔ جان۔ ٹی۔ پلیٹس کی " اے ڈکشنری آف اردو، کلاسیکل هندی اینڈ انگلش"(1884

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک جامع لغت کہلائے جانے کی مستحق هے۔ پلیٹس نے هر لفظ اوررس

الخط اور دیوناگری میں درج کر کے رومن رسم الخط میں اس کے تلفظ کی وضاحت کی هے۔ معنی و

مفہوم کی تشریح انگریزی میں کی ہے، اس لئے اردو لفظ کے تلفظ اور اس کے معنی و مفہوم کو
انگریزی جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ پلیٹس کی لغت ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے زیادہ وسیع ہے۔
اس میں اردو کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی کے وہ الفاظ بھی شامل کئے ہیں جو
اردو زبان و ادب میں مستعمل تھے، البتہ کہیں کہیں معنی اور استعمال کے لحاظ سے سند نہیں
دی۔ اس نے الفاظ کے ماخذ اور اصل کی نشان دھی بھی کی ہے اور کسی حد تک اشتقاقیاتی
تحقیق بھی کی ہے۔ اس ذیل میں اس نے معنیاتی تغیرات کی وضاحت بھی کی ہے۔ پلیٹس نے اپنے
پیش رووں سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن اسے محض تقلید یا خوشہ چینی قرار نہیں دیا جا سکتا
ہے۔ اس نے ان فروگذاشتوں اور کوتاہیوں سے بچنے کی کوشش کی جو اس سے پہلے کی لغات میں پائی
جاتی تھیں اور اپنی لغت کو ان خامیوں اور عیبوں سے محفوظ رکھا جوکورانہ تقلید کے نتیجے میں
بیشتر لغات میں نظر آتی ہیں۔ اس نے اپنی تحقیق، مشاہدے اور تجربے پر بھروسہ کیا اور بول
چال کی زبان کے ساتھ ادبی زبان کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس کی لغت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ
تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پلیٹس نے لغت نویسی کے جدید اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک جامع
لغت مدوّن کی ۔ مولوی عبدالحق نے پلیٹس کی لغت کو جامع قرار دیتے ہوئے اس کے فن کی تحسین کی
ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کا خیال ہے کہ پلیٹس نے اپنی لغت کی تدوین کے سلسلے میں جدید لغت
نویسی کے لوازم کو ایسا ملحوظ رکھا ہے اور تحقیق و تدقیق، توثیق و تصدیق کے مراحل اس
طرح طے کئے ہیں کہ لغت، پرانی لغات کے مواد و متن کی تالیف نہیں سمجھی جا سکتی۔ متن اور
ہیئت کے اعتبار سے اس میں جدّت اور اپج نظر آتی ہے۔ اس کی لغت حقیقی معنوں میں نیا کارنامہ
کہلا سکتی ہے۔ اس نے مختلف المعانی ہم صوت کلموں کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے، انہیں
اشتقاقیات کی کسوٹی پر پرکھ کر مختلف الماخذ ہونے کی بنیاد پر الگ الگ حیثیت سے اندراج کیا
ہے اور معنی و مفہوم بتائے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے صوتی و معنیاتی تغیرات کی بھی نشان دھی
کی ہے۔ پلیٹس کی لغت اپنی خصوصیات کی وجہ سے زیادہ بااصول، کامل، جامع اور منفرد نظر آتی
ہے۔(34) " کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" (1984ء) کے سلسلے کی جلد اوّل میں جابر

علی سیّد نے پلیٹس کی لغت کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور اس کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی ہے۔

یورپین لغت نگاروں کے اردو لغت نویسی کی روایت پر دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان کے اردو داں طبقے نے لغت نویسی پر توجہ دینا شروع کی اور یورپین لغت نگاروں کی لغات سے استفادہ بھی کیا۔ اگرچہ اکثر لغت نویس ان کے اصول لغت نگاری، "فیلڈ ورک" کے طریقۂ کار، تدبیر کاری اور منصوبہ بندی کو پوری طرح برت نہ سکے، تاہم ان کے اثرات قبول بھی کئے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ ڈاکٹر فیلن کی تربیت کا یہ کچھ کم فیض نہیں ہے کہ ان کے ساتھ جس قدر اصحاب بطور مددگار کام کرتے تھے، ان سب نے کوئی نہ کوئی کتاب لغت یا زبان پر لکھ ڈالی ہے۔(35) اس سلسلے میں سب سے اہم نام سید احمد دہلوی کا ہے، جنہوں نے بلاشبہ فن لغت نویسی کے سلسلے میں فیلن سے فیض حاصل کیا۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے لغت نویسی کے حوالے سے اردو داں طبقے کے رحجان کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو دنیا میں ایک عرصے تک اردو لغت نویسی پر توجہ اس لئے نہ دی گئی کہ اردو داں طبقے کا یہ خیال تھا کہ اردو کے دخیل الفاظ کی تفہیم میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں، اس لئے فارسی، عربی لغات کی ضرورت تو ہو سکتی ہے، خالص اردو یا ہندی الفاظ کے لیے لغت کی ضرورت نہیں۔ اس خیال کا اظہار علی گڑھ اخبار مورخہ 5 فروری 1869ء میں بھی کیا گیا تھا۔(36) اس لئے اردو لغت نویسی کی طرف توجہ دینے کے بجائے، ہندوستان کے اہل علم نے ذو لسانی لغات مدوّن کیں۔ ان کے سامنے لغت نویسی کے دو نمونے تھے۔ اردو فارسی لغت نویسی (غرائب اللغات اور نوادرالالفاظ) اور یورپین کی اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغات۔ برصغیر کے اکثر لغت نویسوں پر ان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

مولوی محمد مہدی واصف نے ہندی سنسکرت کے الفاظ کی لغت "دلیل ساطع" 1833ء میں مدوّن کی۔ مولف کے دیباچے کے مطابق ایک انگریزی لغت سے یہ الفاظ لے کر جمع کر دئیے ہیں۔(37) مولوی اوحدالدین بلگرامی کی "نفائس اللغات" اردو فارسی لغت ہے۔ مولوی عبدالحق

کے مطابق یہ لغت 1837ء میں تالیف ہوئی اور 1869ء میں شائع ہوئی ۔(38) ڈاکٹر شاہجہانپوری کے مطابق 1884ء میں شائع ہوئی ۔(39) پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق 1844ء میں مرتب ہوئی ۔(40)

اس لغت میں ہر اردو لفظ کا فارسی اور عربی مترادف دیا گیا ہے اور فارسی میں معنی کی تشریح کی گئی ہے۔ محبوب علی رام پوری نے اس میں اضافے اور ترمیم کر کے " منتخب النفائس" مرتب کی ۔ اس میں اردو الفاظ کے فارسی ، عربی مترادفات ہیں اور حواشی میں اعراب ، تشریح اور سند کے اشعار ہیں۔ یہ لغت 1846ء میں مرتب ہوئی اور 1870ء میں شائع ہوئی ۔ سید احمد دہلوی کی " مفتاح اللغات" 1851ء میں دہلی سے شائع ہوئی ۔(41) ناسخ کے شاگرد میر اوسط علی رشک لکھنوی نے " نفس اللغۃ" مرتب کی ۔ مولوی عبدالحق کے مطابق 1256ھ مطابق 1844ء تالیف ہوئی ۔(42) ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے مطابق 1256ھ مطابق 1841ء تالیف ہوئی ۔(43) پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق 1848ء میں تالیف ہوئی ۔ وہ اسے ایک جامع لغت قرار دیتے ہیں ، جس میں اردو اور ہندی الفاظ اور محاورات کی صحت کی تحقیق کی گئی ہے۔(44) مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اس لغت کا مولف لغت نویسی کے اصول سے مطلق واقف نہیں ہے۔ یہ لغت کے بجائے محض فرہنگ ہے۔ اردو لفظ کے فارسی معنی دئیے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں معنی کی تشریح کی گئی ہے جو ناقص ہے۔ " لغات کشوری " (1892ء) سید تصدق حسین رضوی کی تالیف ہے اور " فرہنگ عامرہ" (1937ء) محمد عبداللہ خاں خویشگی کی تالیف ہے۔ یہ دونوں لغات عربی ، فارسی اور ترکی لغات ہیں۔ الفاظ کے معنی اردو میں دئیے گئے ہیں۔ یہ اردو میں مروّج عربی ، فارسی اور ترکی کے دخیل الفاظ کی لغات ہیں۔ ان لغات میں لغت نویسی کے اصول و قواعد کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں اردو لغت نویسی کی طرف توجہ دی گئی ۔ اور اردو لغات مدوّن کی گئیں لیکن ابتداء میں اس کے محرک یورپین لغت نویس تھے یا وہ اہل علم جنہوں نے یورپین لغت نویسوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ سورج مل کی " ہندوستانی لغات" 1874ء میں شائع

ہوئی ۔ یہ لغت ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی ۔ اردو الفاظ کے معنی اردو ہی میں بیان کئے گئے ہیں۔ بعض موقعوں پر ان کے ماخذ بھی بتائے گئے ہیں۔ مصنفوں اور شاعروں کے کلام سے نظائر بھی پیش کئے گئے ہیں۔(46) حکیم سید ضامن علی جلال کی "سرمایہ زبان اردو" 1889ء میں شائع ہوئی ۔ مولف کے مطابق چوں کہ اردو میں کوئی ایسا جامع لغت جس میں لغات و محاورات و کنایات و ملصطلحات و مثلہائیے زبان اردو نہیں لکھا گیا ہے اس لئے انہوں نے یہ لغت ترتیب دیا ہے۔ اس لغت میں اردو الفاظ، محاوروں، اصطلاحات اور امثال کے معنی بیان کئے گئے ہیں اور شاعروں کے کلام سے سند دی گئی ہے۔ مولف کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس لغت میں اردو کے تمام محاورے درج کر دئیے ہیں لیکن اثر لکھنوی کو اس دعویٰ سے اختلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ " سرمایہ زبان اردو" میں مندرج اردو کے اکثر الفاظ و محاورات کے معنوں کی درست وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اثر لکھنوی نے " فرہنگ اثر" (1961ء) کے پہلے حصے میں " سرمایہ زبان اردو" کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے جلال کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔(47)

اردو لغت نویسی کے اسی دور میں محاورات اور ضرب الامثال کی فرہنگیں بھی مرتب کی گئیں۔ " مخزن فوائد " (1886ء) نیاز علی بیگ نگہت کی تالیف ہے۔ یہ اردو محاورات اور اصطلاحات کی لغت ہے جو مسٹر بولوس پرنسپل قدیم دہلی کالج کی فرمائش پر مرتب کی گئی ۔ مولوی عبدالحق کے مطابق یہ خاصی ضخیم لغت ہےاور مولف نےمحاورات بہت تلاش سے جمع کئے ہیں اور ہر محاورے کی سند میں کسی استاد کا شعر پیش کیا ہے۔ اگرچہ ترتیب بہ حروف تہجی ہے لیکن ہر حرف کے تحت جو محاورے درج ہیں ان میں کوئی ترتیب نہیں رکھی ۔ مولف کو محاورے، اصطلاح اور لفظ کے فرق کی تمیز نہیں ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر بہت اچھی ہے۔(48) منشی چرن جی لال نے ڈاکٹر فیلن کی معاونت میں کام کیا تھا۔ فن لغت نویسی کا شعور انہیں ڈاکٹر فیلن کی صحبت میں حاصل ہوا۔ ان کی تالیف " مخزن المحاورات" (1886ء) ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اردو محاورات میں اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب میں بڑی ہے۔ کم و بیش دس ہزار

محاورے اس میں آ گئے ہیں۔ اس میں ایسے محاورے بھی ہیں جو خاص ہندوؤں کی زبان پر ہیں یا قصبات و دیہات میں بولے جاتے ہیں۔ پیشہ وروں کی بھی بعض اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ معروف امثال بھی کہیں کہیں درج ہیں۔ معانی کی تصریح میں وضاحت سے کام لیا ہے اور روزمرہ کے جملے یا اساتذہ کے اشعار سند کے طور پر لکھے ہیں۔(49)

اس عہد کی چند لغات ایسی بھی ہیں جن کی تکمیل نہ ہو سکی یا جو طبع ہونے سے رہ گئیں۔ سرسید کی "لغت زبان اردو" نامکمل رہ گئی۔ اس کے کچھ اجزاء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے۔ مولانا احسن مارہروی کی لغت "فصیح اللغات" بھی تشنۂ تکمیل رہی۔ مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی کی لغت "بہار ہند" کی تدوین مکمل نہ ہو سکی۔ حکیم غلام مولیٰ قلق کی لغت کے کچھ حصے شائع ہوئے لیکن یہ مکمل نہ ہو سکی۔(50) قدر بلگرامی کی لغت طبع نہ ہو سکی۔ مولوی عبدالحق کے مطابق اس لغت میں لفظ کے معنی مختصر طور پر دئیے گئے۔ اس لغت کی خاص اہمیت نہیں ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی ناکافی ہے۔ شمس الدین فیض کی لغت "خزائن الفاظ" بھی شائع نہ ہو سکی۔ اس لغت میں زیادہ تر محاورے اور امثال شامل ہیں لیکن اس کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔(51)

انیسویں صدی کا نصف آخر اردو لغت نویسی کے حوالے سے اہم ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کے مقامی اہل علم نے اردو لغت نویسی کی طرف توجہ مبذول کی۔ گو ابتداء میں اردو فارسی لغات مدون کی گئیں لیکن رفتہ رفتہ اردو اردو لغات کی تدوین بھی کی گئی اگرچہ اس کے محرک یورپین لغت نگار ہی تھے لیکن اردو دان طبقے کو بھی اردو لغت کی اہمیت و ضرورت کا احساس ہو چلا تھا۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں مدون کی گئیں لغات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو لغت نویسی ایک اہم علمی سرگرمی کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اسی عہد میں اردو کے معتبر اور مستند لغات مدون کی گئیں اور "فیلڈ ورک" کی بدولت اردو لغت نویسی کی روایت میں گراں قدر اضافے ہوئے۔ مسعود ہاشمی کا خیال ہے کہ فرہنگ آصفیہ کی تدوین سے قبل اردو لغت نویسی ایک

متعین نہج اختیار کر چکی تھی ۔ اردو زبان و ادب کی آبیاری شعری ماحول میں ہونے کی وجہ سے اردو لغت نویسی پر بھی شعری تسلط قائم رہا ، اس لئے اردو لغات کو ایک حد تک شعری لغات کہا جائے۔ تو غلط نہ ہو گا ۔ کیوں کہ اولاً ان لغات میں سند یا فصاحت کے لیے صرف شعراء/ہی کے کلام کو معیار بنایا گیا ہے اور اکثر اندراجات کے زیادہ تر شعری مترادفات ہی دئیے گئے ہیں ، دوسرے یہ کہ دیگر ترکیبات کے مقابل شعری ترکیبات سے زیادہ سے زیادہ شامل کی گئی ہیں اور ممکنہ حد تک اس بات کا بھی التزام رکھا گیا ہے کہ معاملہ بندی سے متعلق تمام محاورات ضرور شامل لغت کر دئیے جائیں۔ غالباً یہ نتیجہ اس شعری غلبے کا ہی تھا جو ان مولفین لغت کو تحقیق لغت کے میدان سے نکال کر تنقید لغت کے میدان میں لے آیا اور لغت نویسی سے متعلق تمام معاملات اور مسائل کو تحقیق کی بجائے ذاتی صلاحیت نقد ، فصاحت اور علاقائی بنیاد پر طے کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ (52) مسعود ہاشمی کے اس تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو لغت نویسی میں شعری غلبے اور علاقائی بنیاد پر علمی برتیری ثابت کرنے کا رجحان غالب رہا۔ فرہنگ آصفیہ کے بعد امیر اللغات، نوراللغات، جامع اللغات اور لغات کشوری میں یہ رجحان غالب نظر آتا ہے۔

سید احمد دہلوی ، اردو لغت نویسی کی روایت میں ایک اہم لغت نگار کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ لغت نویسی کے سلسلے میں " فیلڈ ورک " کی اہمیت سے خوب واقف تھے اور تحقیق کا ذوق و شوق بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے 1968ء سے اردو زبان کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کی زبان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور محاوروں ، کہاوتوں ، ضرب الامثال ، پہلیوں ، ٹوٹکوں اور رسوم و توہمات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے گئے۔ 1973ء میں ڈاکٹر فیلن نے انہیں اپنی لغت کی تدوین میں معاون بنا لیا۔ انہوں نے سات سال تک فیلن کی لغت کی تدوین میں معاونت کی ۔ مسعود ہاشمی کا یہ خیال صحیح ہے کہ فرہنگ آصفیہ کی تدوین اردو لغت نویسی کے پختہ ماحول میں اس لئے بھی ہوئی کہ مولف لغت کو متعدد لغاتی رسائل کی تدوین

لاوہ ماہر لغت نویس مسٹر فیلن کے ساتھ کام کرنے کا سات سالہ لغت نویس کا بیش قیمت تجربہ
حاصل ہو چکا تھا۔ (53)

" فرہنگ آصفیہ " کی ترتیب کا کام 1868ء میں شروع ہوا۔ " ارمغان دہلی " کے نام سے
18ء میں اس کا نمونہ شائع ہوا۔ 1887ء میں اس کی پہلی جلد " ہندوستانی اردو لغت " کے
سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں نظام حیدرآباد، دکن، میر سر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ ہفتم
سرپرستی کی بدولت " فرہنگ آصفیہ " کے نام سے موسوم ہوئی اور 1888ء میں پہلی دو جلدیں،
18ء میں تیسری اور 1901ء میں چوتھی جلد طبع ہوئی۔ جب کہ اس کی تدوین 1891ء کے
ر یا 1892ء کے اوائل میں مکمل ہو چکی تھی۔ (54)

سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں اردو کا بیشتر لسانی سرمایہ شامل کر دیا ہے۔
ہ مسعود ہاشمی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق بہت سے لفظ اور بعض محاورے
ٹ بھی گئے ہیں۔ مولوی سید احمد دہلوی نے معاشرے کے مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق
ے والے الفاظ، اصطلاحات، عورتوں کے محاوروں، کہاوتوں، پہیلیوں کو لغت میں شامل کیا ہے۔
ظ کی وضاحت مختلف طریقوں سے کی ہے۔ لفظوں کے مترادفات دیے ہیں اور ان کی مختلف صورتوں،
ں، مشتقات کے لغوی اور مجازی معنوں کی توضیح کی ہے۔ اگرچہ ان توضیحات میں کہیں کہیں
ح بھی ہوا ہے جس کی نشان دہی مسعود ہاشمی نے کی ہے۔ جابر علی سیّد نے فرہنگ
ہ کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے " کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ " (1984ء) جلد اوّل میں
احمد دہلوی کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے لفظ کی معنوی
بیان نہیں کی ہے اور لفظ کی قواعدی حیثیت کی نشان دہی کرتے ہوئے بھی ان سے تسامح
ہے۔ مسعود ہاشمی اور مولوی عبدالحق نے " فرہنگ آصفیہ " میں بعض الفاظ کے ماخذ کی
ق کے سلسلے میں سید احمد دہلوی کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔ ان فروگذاشتوں کے
ید " فرہنگ آصفیہ " اردو کی جامع لغت ہے اور سید احمد دہلوی کی عالمانہ تحقیق کی مظہر

ہے۔پروفیسر خلیل صدیقی نے اسے اردو کی پہلی مبسوط، کامل اور جامع لغت قرار دیا ہے، جس میں نہ صرف اردو کے بیشتر لسانی سرمائے کو سمیٹ لیا گیا ہے بلکہ اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیائی معلومات بھی فراہم کر دی گئی ہیں۔(55) جابر علی سید نے " فرہنگ آصفیہ" کو اردو داں طبقے کے لیے نایاب علمی خزانہ اور نعمت عظمیٰ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرہنگ آصفیہ" کی بڑی خوبی اس کی صحت اور جامعیت اور استناد پسندی ہے جو کسی لفظ کی صحت کو کھٹاک سے روشن کر دیتی ہے۔(56)

سید احمد دہلوی نے ڈاکٹر فیلن کی لغت کی تدوین میں معاونت کی تھی۔ اس لئے وارث سرہندی کو یہ اشتباہ ہوا کہ " فرہنگ آصفیہ" فیلن کی لغت ہی پر مبنی ہے اور فیلن کی لغت اور " فرہنگ آصفیہ" کے اندراجات و شمولات ہی میں نہیں بلکہ اغلاط و تسامحات میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔(57) جابر علی سید کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے کہ مولف فرہنگ آصفیہ پر مستشرقین کا اثر ہے اور جان پلیٹس اور ڈاکٹر فیلن سے خاص طور پر مولف نے استفادہ کیا ہے یہ استفادہ دو طرفہ ہے۔(58) جابر علی سید کی رائے صائب ہے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سید احمد دہلوی نے " فرہنگ آصفیہ" کی ترتیب کا کام 1868ء میں شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر فیلن نے انہیں 1873ء میں اپنا معاون مقرر کیا۔(59) دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ دونوں نے ایک عرصے تک ایک ساتھ لغت نویسی کے سلسلے میں تحقیقی کام کیا۔ ڈاکٹر فیلن نے ایک خط میں دونوں لغات میں مشترک و مماثل فقروں اور مثالوں کی نشان دہی کرتے ہوئے دو طرفہ استفادے کی حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور " فرہنگ آصفیہ" کی الگ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے سید احمد دہلوی کے تجربے، علم اور تحقیقی کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔(60) مولوی عبدالحق نے بھی " فرہنگ آصفیہ" کی ممتاز اور الگ حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قابل مولف " فرہنگ آصفیہ" کے سامنے ڈاکٹر فیلن کی لغت کا نمونہ موجود تھا اور وہ خود بھی اس کی ترتیب میں شریک تھے لیکن ان کی لغت بالکل جدا چیز ہے، اگرچہ مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر فیلن کے اثرات کی نشان دہی بھی کی ہے۔(61)

سید احمد دہلوی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے " فرہنگ آصفیہ" میں اردو کے بیشتر لسانی سرمائے کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بول چال کی زبان کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ادبی سرمائے کو بھی کھنگالا ہے اور " فیلڈ ورک" کی مدد سے اپنی لغت کی علمی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے محض مترادفات ہی نہیں دئیے بلکہ ان کی مختلف صورتوں اور معانی کے لطیف فرق کی وضاحت بھی کی ہے۔ اس اعتبار سے " فرہنگ آصفیہ" اردو لغت نویسی کی روایت میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔

امیر احمد مینائی نے " امیر اللغات" کی تدوین کا آغاز 1884ء میں کیا، لیکن یہ لغت تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور اس کی دو جلدیں ہی شائع ہو سکیں۔ پہلی جلد 1891ء میں شائع ہوئی جو الف ممدودہ پر مشتمل ہے اور دوسری جلد 1892ء میں شائع ہوئی جو الف مقصورہ پر مشتمل ہے۔ اس لغت کی تالیف کا محرک سر الفرڈ لائل گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ تھا۔ (62) پروفیسر خلیل صدیقی کی تحقیق کے مطابق اس لغت کی مطبوعہ جلدوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر مینائی نے اپنی معلومات کے علاوہ مستند تصانیف کو بھی بنیاد بنایا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے مروجہ الفاظ، محاورے، مرکبات، کہاوتیں، اصطلاحات، قانون کچہری اور اہل دفتر کے خاص الفاظ اور محاورے، پیشہ وروں کی اصطلاحیں، عورتوں کے خاص خاص الفاظ اور محاورے، قسمیں، دعائیں، کوسنے وغیرہ، شادی بیاہ کی رسمیں --- ان سب کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔ مطبوعہ لغت میں الفاظ کے حقیقی و مجازی معنی، محل استعمال کی مثالیں، فارسی مترادفات، متعلقہ الفاظ، واحد جمع کی حالت میں معنی اور محل استعمال کا فرق۔ متروکات کی نشان دہی اشتقاق، املا کا بیان، عربی و فارسی کے جو الفاظ بول چال میں ملتے ہیں، شاعری میں نہیں، ان کا اندراج دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر لغت انہی خطوط پر مکمل ہوتی تو خاصی وقیع ہوتی۔ (63)

" امیر اللغات" اس حوالے سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے مولف کا تعلق لکھنو سے ہے

جو دبستان لکھنو کے نمائندہ اور صاحب علم شاعر تھے۔ انھوں نے لکھنو کی اردو کے لسانی سرمایے کو اس لغت میں سمیٹنے کی کوشش کی ۔ اور دھلی کی زبان کو/بھی پیش نظر رکھا۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو جامع ہوتی ۔ اس کی مطبوعہ جلدوں کا جائزہ لیتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس میں مولف نے حتی الامکان بڑی محنت اور تلاش سے کام لیا ہے۔ ہر لفظ پر اعراب لگائے ہیں اس کی تذکیر و تانیث کی نشان دھی کی ہے اور خال خال کسی لفظ کی اصل بھی بتائی ہے۔(64)

" نوراللغات" مولوی نورالحسن نیر کاکوروی کی تالیف ہے۔ انھوں نے اس کام کا آغاز 1914ء میں کیا اور دس سال کے عرصے میں اس لغت کی پہلی جلد 1924ء میں شائع ہوئی ۔ دوسری جلد 1927ء میں، تیسری جلد 1929ء میں اور چوتھی جلد 1931ء میں شائع ہوئی ۔(65) پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق اس کی آخری جلد 1924ء میں شائع ہوئی ۔(66)

" نوراللغات" میں اردو الفاظ کے اردو مترادفات دینے کے ساتھ حسب ضرورت معنی کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے اور سند کے لیے شعراء کے شعروں کا حوالہ دیا ہے۔ تلفظ کی وضاحت اعراب کی مدد سے یا هم وزن الفاظ کی مثالوں سے کی ہے۔ لفظوں اور محاوروں میں معنیاتی تبدیلی کی نشان دھی کی گئی ہے جو اس لغت کی اہم خوبی ہے۔ اردو میں دخیل الفاظ کے اصل اور مروجہ دونوں معنی بتائے ہیں۔ تذکیر و تانیث کی وضاحت کرتے ہوئے دھلی اورلکھنو کے اختلافات کی نشان دھی کی ہے۔ مترادفات میں معنی کے لطیف فرق کی وضاحت خال خال کی گئی ہے۔ الفاظ کے ماخذ کی نشان دھی کی ہے اور قواعدی حیثیت بھی واضح کی ہے۔ فصیح اور غیر فصیح الفاظ کی نشان دھی کی گئی ہے لیکن اس سلسلے میں مولف نےلکھنوی نقطۂ نظر سے الفاظ کی وضاحت کو پرکھا ہے، جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لغت میں مختلف طبقوں میں مستعمل الفاظ، محاوروں، کہاوتوں، اصطلاحوں کو شامل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ الفاظ اور محاورات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ متروکات کے سلسلے میں بھی مولف سے فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے " نوراللغات" کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے

اس لغت کی کوتاھیوں کی نشان دھی کی اور " فرھنگ اثر" (1961ء) مرتب کی ، جس میں " نور اللغات" کے متروکات سے بحث کی گئی ھے اور جو الفاظ و محاورات اس میں شامل نہیں ھیں (یا شامل ھیں لیکن اثر لکھنوی نے ان کی کسی حیثیت سے اختلاف کیا ھے) ان کی لغت مدوّن کی گئی ھے۔ " فرھنگ اثر" کا دائرہ بہیں تک محدود ھے۔ اس لئے اثر لکھنوی نے اپنی اس تحقیقی کاوش کو " نوراللغات" کا ضمیمہ قرار دیا ھے۔(67) وارث سرھندی نے بھی " نور اللغات" کا تحقیقی جائزہ لیا ھے اور " فرھنگ اثر" کا ناقدانہ جائزہ لے کر دونوں کے تسامحات کی نشان دھی کی ھے۔ وہ " نور اللغات" کو لکھنو کے لسانی دبستان کا نمائندہ اور " فرھنگ آصفیہ" کو دھلی کے لسانی دبستان کا نمائندہ قرار دیتے ھیں۔(68) " نور اللغات" کی کوئی بھی حیثیت ھو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو لغت نویسی کی روایت میں " فرھنگ آصفیہ" کے بعد اس کا مقام و مرتبہ نمایاں ترین ھے۔

" فیروز اللغات" (1921ء) مولوی فیروزالدین ڈسکوی کی تالیف ھے۔ اس لغت میں الفاظ کے مترادفات دئیے گئے۔ خال خال معنی کی تشریح کی گئی ھے۔ لفظ کے ماخذ کی نشان دھی بھی کی گئی ھے۔ تلفظ کی وضاحت ھجائی تقسیم کے تحت کی گئی ھے۔ کچھ قدیم و متروک الفاظ اور کچھ الفاظ کے قدیم و متروک معنی کو بھی شامل کیا گیا ھے۔ خواجہ عبدالحمید کی " جامع اللغات" (1933ء) چار جلدوں پر مشتمل ھے۔ مولوی عبدالحق نے اس لغت کو اردو، ھندی، سنسکرت، عربی فارسی ، زبانوں کا ملغوبہ قرار دیا ھے۔ ان کا خیال ھے کہ اس لغت کی تالیف میں بہت محنت کی گئی ھے لیکن یہ مستند حیثیت کی حامل نہیں ھے۔ (69) وارث سرھندی کا خیال ھے کہ اردو کا ھر لفظ خواہ اس کا تعلق کسی زبان سے ھے اور وہ کسی بھی طبقے یا پیشے سے تعلق رکھنے والوں میں کسی بھی صورت میں مستعمل ھو " جامع اللغات" میں شامل کیا گیا ھے۔ مولف نے عوام اور اھل علم دونوں کی زبان پر توجہ دی ھے اور لفظ کی تمام مروجہ صورتوں کو لغت میں شامل کیا ھے۔ اس میں عام الفاظ، محاورات، اقوال اور اصطلاحات کے علاوہ مشہور شخصیتوں ، شہروں ، ملکوں ،

ندی نالوں اور دریاؤں تک کے نام شامل کئے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی حیثیت انسائیکلو پیڈیائی بھی ہے۔ ان کے خیال میں ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے یہ اردو کی جامع ترین لغت ہے، مولف نے الفاظ کی مختلف صورتوں کی وضاحت نہیں کی اور سند نہیں دی ہے۔ تلفظ کی وضاحت اور ماخذ کی نشان دہی بھی نہیں کی ہے۔ وارث سرہندی نے " جامع اللغات " کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے ان تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔(70)

مولوی عبدالحق فن لغت نویسی کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں اردو کی کامل اور جامع لغت کی اہمیت اور افادیت کا احساس بھی تھا۔ 1930ء میں انہیں حکومت حیدرآباد دکن نے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کا صدر مقرر کیا تاکہ وہ اردو زبان کی جدید، کامل تر لغت تالیف کریں۔(71) انہوں نے اس منصوبے کا آغاز کیا اور دس بارہ برس کی سخت محنت سے لغت کا سرمایہ فراہم کیا لیکن ان کا یہ کام ابھی زیر تکمیل تھا کہ آزادئ ہند کی تحریک اور تقسیم ہند کے واقعات میں اس کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔(72) جو حصہ بچا وہ مولوی صاحب پاکستان لے آئے اور انجمن ترقی اردو، پاکستان کی تنظیم کرتے ہی دوبارہ کام شروع کیا لیکن موت نے مہلت نہ دی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اس لغت کا جتنا حصہ تکمیل کو پہنچا تھا وہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دو جلدوں میں شائع ہوا، جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو اردو کی عظیم الشان لغت کی صورت میں سامنے آتا۔

مولوی عبدالحق کی " لغت کبیر " کی ان جلدوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کا جامع، مکمل اور مبسوط لغت تالیف کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اردو کے ان تمام الفاظ، مفرد یا مرکب اور ان سے مشتق صورتوں کو لغت میں شامل کیا ہے۔ عام بول چال کی زبان، پیشہ وروں کی زبان، ان کی مخصوص اصطلاحات، مختلف طبقوں کی زبان، عورتوں کی زبان، رسوم و رواج سے متعلق الفاظ، محاورے، ضرب الامثال، لغت میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے الفاظ کے محض مترادفات نہیں دئیے بلکہ ہر لفظ کے معنی کی وضاحت کی ہے۔ ان کی قواعدی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ اکثر

الفاظ کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ بیشتر الفاظ کے تلفظ کی ہجائی تقسیم اور اعرابی طریقے سے توضیح کی گئی ہے۔ مختلف ادوار میں لفظ کی رائج شکلوں اور ان کے معنی کی وضاحت کی گئی ہے۔ سند کے لیے محض اشعار پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ نثر سے بھی مثالیں دی ہیں۔ جو الفاظ ادب میں رائج نہیں ہیں اور ان کا تعلق بول چال کی زبان سے ہے ان کے معنوں کی وضاحت کے لیے مثالیں دی گئی ہیں۔ ان خصوصیات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو اردو کی عظیم لغت ہوتی۔ " لغت کبیر " کی مطبوعہ جلدوں سے اردو لغت کی تالیف و تدوین کے لیے آج بھی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے اردو لغات میں الفاظ کے معنی کی وضاحت کے لیے ان کے مترادفات دینے کا رجحان نظر آتا ہے۔ " فرہنگ آصفیہ " اور " نور اللغات " میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں معنی کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ " لغت کبیر " میں مولوی عبدالحق نے مترادفات دینے کے بجائے معنی کی تشریح پر زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ اس لغت کی اہم خوبی ہے۔

اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ ، کراچی) نے " اردو لغت " (تاریخی اصول پر) ، کی تدوین کا منصوبہ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کی طرز پر شروع کیا تھا۔ اس بورڈ کے صدر ، محمد ہادی حسین ، مدیر اعلیٰ ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مدیر ، ڈاکٹر شوکت سبزواری تھے۔ اس لغت کی پہلی جلد 1977ء میں شائع ہوئی اور 1992ء تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اس لغت کو مولوی عبدالحق کی " لغت کبیر " کے منصوبے کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔

" اردو لغت " میں اردو زبان کے شروع سے موجودہ دور تک قدیم و جدید ، متروک و متداول تمام الفاظ کو درج کیا جا رہا ہے۔ ہر لفظ کے معنی ، اس کی ضمنی شقوں کی مثالوں کے ساتھ وضاحت اور اس سے مشتق الفاظ کے معنوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ہر لفظ کی قدامت کی نشان دہی کر کے، عہد بہ عہد اس کے استعمال اور ترک و اختیار کی صورتوں کی توضیح کی گئی ہے۔ لفظ کے ماخذ یا اصل کی نشان دہی کر کے اس کا ابتدائی روپ بھی دیا گیا ہے۔ معانی

کے اعتبار سے ہر لفظ کے استعمال کی سند دی گئی ہے اور مختلف ادوار میں معنیاتی تغیرات کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے کہ کسی دور میں کوئی لفظ جن معنوں میں مستعمل تھا اس کی وضاحت کر کے، استعمال کی سند دی گئی ہے اور جس شاعر یا نثر نگار کی تصنیف سے حوالہ دیا گیا ہے، اس کا سن وفات یا سن تصنیف دیا گیا ہے، جس سے معنیاتی تغیر کے مختلف ادوار کی نشان دہی ہوتی ہے۔ معانی کی تشریح منطقی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے اور ہر لفظ کے معنی کی تشریح کرتے ہوئے مترادفات میں معنی کے لطیف فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لئے تشریح و تعریف جامع ہے۔ الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ ہر لفظ کی قواعدی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ الفاظ کی قدیم و جدید املائی صورتیں درج کی ہیں اور تلفظ کی وضاحت، ہجائی تقسیم سے یا ملفوظی حیثیت کی توضیح کر کے اور اعراب لگا کر، کی گئی ہے۔

" اردو لغت " میں عام بول چال کی زبان اور علمی و ادبی زبان پر توجہ دی گئی ہے۔ الفاظ ، محاورے، مرکبات، کہاوتیں، اصطلاحات ، علمی و فنی اصطلاحات ، پیشہ وروں اور فن کاروں کی اصطلاحات، عورتوں کی زبان ، ان کے مخصوص الفاظ اور محاورے، دعائیں ، کوسنے، اور ضرب الامثال ، معاشرتی رسوم و رواج سے متعلق مخصوص الفاظ، سب کو جگہ دی گئی ہے۔ اردو میں دیگر زبانوں کے دخیل الفاظ اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے دخیل الفاظ کے بارے میں دقت نظر اور احتیاط سے تحقیق کی گئی ہے۔ اور ان مفرد و مرکب دخیل الفاظ کو شامل کیا ہے جو اردو میں مروّج ہیں یا مروّج تھے اور کم از کم دو مصنفین نے اپنی تصانیف میں استعمال کئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک طویل مقالے میں " فرہنگ آصفیہ "، " نور اللغات " اور " اردو لغت " کا تنقیدی اور تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ان کا مقالہ " اردو لغت اور لغت نگاری " جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو ہندی لغت نویسی پر ایک سیمنار میں پڑھا گیا اور " لغت نویسی کے مسائل " (1985ء) مرتبہ گوپی چند نارنگ میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں انہوں نے " اردو لغت " کی پہلی دو جلدوں کو سامنے رکھ کر چند فروگذاشتوں پر گرفت کی ہے۔ ان کا خیال ہے

کہ " اردو لغت" میں غیر ضروری الفاظ کی بھرمار کر دی گئی ہے۔ حروف تہجی کی فہرست میں غیر ضروری حروف مثلاً لھ، مھ، نھ وغیرہ کو شامل کر کے اس فہرست کو غیر ضروری طور پر طویل کر دیا ہے۔ تعین لغت میں بے اصولے پن سے کام لیا ہے۔ معنی کی تشریح کے سلسلے میں بے احتیاطی برتی ہے۔ لفظ کی تعریف کا تعین نہیں کیا، جس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سنین کے سلسلے میں بھی " اردو لغت" میں کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی ماہر لسانیات نہیں ہیں اور لسانیات ہی کے شعبے " لغت نویسی " میں بھی مخصص نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالے میں لغت نویسی کے مسائل و مباحث کا علمی سرگرمی کے طور پر جائزہ لیا ہے، جس کا اعتراف انہوں نے مقالے کے آغاز میں کیا ہے۔ " اردو لغت" کے سلسلے میں بہ ظاہر ان کے اعتراضات میں وزن نظر آتا ہے لیکن فن لغت نویسی اور اردو لغت نویسی کی روایت کے پس منظر میں ان کے اعتراضات کچھ زیادہ معقول نہیں ہیں۔ " اردو لغت" کی صرف دو جلدیں ان کے سامنے ہیں۔ محض دو جلدوں کے مطالعے سے مکمل لغت، جو ابھی زیر تالیف ہے اور جس کی کل جلدیں پندرہ سے بیس ہو سکتی ہیں، کو ناقص قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی لغات ایک طویل عرصے کی تحقیق و تدوین کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ نئے حقائق سامنے آتے رہتے ہیں جن کی روشنی میں ترامیم و اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) بھی سالہا سال کی تحقیقی کاوش، ترمیم و اضافے کا نتیجہ ہے اور یہ عمل ابھی جاری ہے۔ " اردو لغت " بھی تحقیق و تدوین کے عمل سے گزر رہی ہے۔ نظرثانی کا کام بھی ہو رہا ہے۔ جب یہ عظیم الشان منصوبہ تکمیل کو پہنچے گا تو اس کی عظمت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

" اردو لغت " جیسی کسی بھی زبان کی لغات میں زبان میں موجود تمام الفاظ شامل کئے جاتے ہیں اس لئے " اردو لغت " پر غیر ضروری الفاظ کی بھرمار کا الزام مناسب نہیں ہے۔ / ضروری اور غیر ضروری کا فیصلہ صادر کرنا لغت نویس کا منصب بھی نہیں ہے۔ جو لفظ زبان میں رائج ہے یا رائج رہا ہے، لغت میں درج ہونا چاہیے۔

لھ، مھ، نھ اور دیگر ہائیہ آوازیں اردو کی بنیادی آوازیں ہیں اور اردو کے صوتی نظام کا جزو ہیں۔ حروف تہجی فونیم یا زبان کی بنیادی آوازوں کی تحریری شکلیں ہوتی ہیں۔ محض اس خیال سے کہ حروف تہجی کی فہرست طویل نہ ہو جائے اردو کی ہائیہ آوازوں کی تحریری شکلوں کو حروف تہجی کی فہرست سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو " اردو لغت " کے سلسلے میں جن تسامحات کا اشتباہ ہوا ہے وہ جزوی طور پر ہی درست ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی ایسے عظیم منصوبے کی ابتدائی مراحل میں معمولی غلطیوں کا احتمال ہوتا ہے۔ " اردو لغت " کی تدوین میں دقت نظر اور احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے اور گذشتہ دس، پندرہ برسوں میں اس سلسلے کی جتنی جلدیں شائع ہوئی ہیں وہ نہایت وقیع اور ہر لحاظ سے جامع ہیں اور ان کی تدوین کے مراحل میں فن لغت نویسی کے جدید اصول و قواعد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ " اردو لغت " کی تدوین کا کام ایک ادارے کے زیر انتظام ہو رہا ہے، جس میں ہر سطح پر ماہرین کے زیر نگرانی تلاش و جستجو اور تحقیق و ترتیب کے مراحل بڑی احتیاط اور ذمہ داری سے انجام دئیے جا رہے ہیں۔ اردو لغت بورڈ کے موجودہ سربراہ اردو کے معروف اور تجربہ کار محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہیں، جو " اردو لغت " کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ " اردو لغت " کی طبع شدہ جلدوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اردو کی پہلی لغت ہے جو لغت نویسی کے جدید معیار پر پورا اترتی ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی کی یہ رائے صائب ہے کہ

> " لغت کی تدوین کا کام ایک علمی ادارہ کر رہا ہے۔ تحقیق و تدوین تلاش و جستجو، پاکستانی زبانوں کے جو الفاظ اردو میں دخیل ہیں، ان کی چھان پھٹک، معانی و مفاہیم کے تعین، لطیف و نازک امتیازات کی صراحت، انسائیکلو پیڈیائی معلومات، زیادہ سے زیادہ لسانی سرمائے کا احاطہ وغیرہ تقسیم کار کے مرہون منت ہیں۔ جدید لغت نویسی کے تقاضے جس جس احسن طریقے سے پورے کئے جا رہے ہیں، ان کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ تکمیل کے بعد اردو کی عظیم الشان کامل

اور جامع ترین لغت ہو گی۔" (73)

" اردو لغت" تاریخی اصول پر مدوّن کی جا رہی ہے۔ اس کی حیثیت اشتقاقی لغت کی نہیں ہے۔ اشتقاقی لغت میں لفظ کی تمام سطحوں، معنیاتی، قواعدی (صرفی و نحوی)، صوری اور صوتیاتی، میں دور بہ دور تغیرات کی نشان دہی کی جاتی ہے، جب کہ " اردو لغت" میں لفظ کے معنیاتی تغیرات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور عہد بہ عہد معنیاتی تبدیلیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لفظ کے ماخذ کی نشان دہی کر کے اس کی ابتدائی صورت بھی دی گئی ہے لیکن ارتقائی ادوار کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس لئے ایک حد تک اس کی حیثیت اشتقاقی ہے۔ " اردو لغت" اپنی خصوصیات کے حوالے سے اردو لغت نویسی کی روایت میں نمایاں ترین مقام کی حامل ہے۔

اردو لغت نویسی کی روایت کا آغاز ذو لسانی لغات ہوتا ہے۔ ابتداء میں اردو فارسی لغات مدوّن کی گئیں۔ یورپین کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ اردو انگریزی اور انگریزی اردو ذو لسانی لغات کی تالیف کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن یورپین کی ضرورت محض اردو زبان سے واقفیت حاصل کرنا تھی۔ اس لئے اردو انگریزی لغات میں اردو لفظ کے مترادفات کے ذریعے معنی کی تفہیم پر توجہ دی گئی اور علمی سطح پر لغت کی تدوین کی کوشش نہ ہوئی۔ شیکسپیئر، ڈاکٹر فیلن اور پلیٹس کی لغات کسی حد تک علمی سطح کو چھو لیتی ہیں ۔ اردو فارسی لغات کی تدوین کا سلسلہ جاری رہا اور یورپین لغت نویسوں سے استفادے کے نتیجے میں اردو لغت نویسی کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ سید احمد دہلوی کی " فرہنگ آصفیہ" اس عہد کی اہم ترین لغت ہے۔ اس لغت پر یورپین لغت نویسوں کے اثرات غالب ہیں۔

نورالحسن نیر کاکوروی کی " نور اللغات" بھی اس دور کی اہم لغت ہے لیکن اس لغت پر " فرہنگ آصفیہ" کے اثرات نمایاں ہیں۔ پہلی دہلی کے لسانی دبستان کی نمائندہ ہے اور دوسری لکھنو کے لسانی دبستان کی۔ نورالحسن نیر کاکوروی نے " فرہنگ آصفیہ" سے استفادہ کیا ہے۔ دونوں میں لفظ کے معنی کی وضاحت کے لیے مترادفات کا سہارا لیا گیا ہے اور کہیں کہیں معنی کی [illegible]

کی گئی ہے۔ لفظ کے ماخذ کی محض نشان دہی کی گئی ہے، وضاحت نہیں کی ہے۔ دونوں میں الفاظ کے استعمال اور معنوں کی سند کے لیے اشعار پر بھروسہ کیا ہے۔ یہ اس عہد کے لغت نویسوں کا خاص رجحان ہے۔ " جامع اللغات " اچھی لغت ہو سکتی تھی اگر اس کی ترتیب و تنظیم اور تدوین پر توجہ دی جاتی۔

مولوی عبدالحق کی " لغت کبیر " تشنۂ تکمیل رہی۔ اگر یہ مکمل ہو جاتی تو اردو لغت نویسی کی روایت میں اہم اضافہ ہوتا۔ مولوی صاحب نے لغت کی تدوین کا کام صحیح خطوط پر آگے بڑھایا تھا اور معنی کی توضیح کے لیے مترادفات کا سہارا لینے کے بجائے لفظ کے معنی کی تشریح پر توجہ دی اور سند کے لیے اشعار کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی معیار بنایا۔ لغت نویسی فرد واحد کا کام نہیں ہے اس کے لیے " ٹیم ورک " اور گروپ ریسرچ " کی ضرورت ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ادارے کی صورت میں " لغت کبیر " کی تالیف کا کام شروع کیا تھا لیکن وہ تشنۂ تکمیل رہا۔ اردو لغت بورڈ، کراچی کے زیر انتظام " اردو لغت " کی تدوین کا کام مولوی عبدالحق کے منصوبے ہی کی توسیع نظر آتا ہے۔ پاکستان میں " اردو لغت " کی تدوین کا کام جاری ہے جب کہ بھارت میں جامع اردو لغت کی تدوین کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اردو لغت بورڈ کے زیر انتظام لغت نویسی کے جدید اصولوں اور لسانیاتی نقطۂ نظر کے مطابق " اردو لغت " مدوّن کی جا رہی ہے۔ جس کی طبع شدہ جلدوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لغت اردو کی کامل اور جامع ترین لغت ہو گی اور یہ ان تمام خصوصیات کی حامل ہو گی، جو ایسی عظیم الشان لغات ہی سے مخصوص ہیں۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ " اردو لغت " اردو لغت نویسی کی روایت کا عظیم سرمایہ ثابت ہو گی۔

حواشی و حوالہ جات : آٹھواں باب : لغت نویسی

-1 پروفیسر خلیل صدیقی ، " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث، (کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز، 1991ء) ، ص 314، 315

-2 بلوم فیلڈ ، زبان ۔ ص 138 ، بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ " لسانی مباحث" (ایضاً) ص 312، 313

-3 پروفیسر خلیل صدیقی ، " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث، (ایضاً) ص 313

-4 ایضاً ، ص 314

-5 ایضاً ، ص 314

-6 مالک رام، "لغت نویسی کے مسائل " مشمولہ لغت نویسی کے مسائل مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ (نئی دھلی ، کتاب نما ، 1985ء) ص 13، 14

-7 پروفیسر نذیر احمد ، " اردو لغت نگاری کے مسائل " مشمولہ لغت نویسی کے مسائل " (ایضاً) ص 21 تا 26

-8 مولوی عبد الحق ، مقدمہ لغت کبیر اردو ۔ جلد دوم (حصہ اوّل) (کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، 1977ء) ص 45، 46

-9 پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 318

-10 ایضاً ، ص 320

-11 ایضاً ، ص 323، 324

-12 ایضاً ، ص 324، 325

-13 مولوی عبد الحق ، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 33

-14 پروفیسر خلیل صدیقی ، " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 327

16- ڈاکٹر سید عبداللہ، مقدمہ نوادرالالفاظ، (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1951ء) ص 32

17- ایضاً، ص 3

18- ایضاً، ص 11

19- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 34

20- پروفیسر خلیل صدیقی، "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 328، 329

21- ڈاکٹر سید عبداللہ، مقدمہ نوادرالالفاظ، (ایضاً) ص 37

22- ایضاً، ص 30-35

23- ایضاً، ص 16، 17

24- پروفیسر خلیل صدیقی "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 330

25- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 16 تا 20

26- پروفیسر خلیل صدیقی "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 331، 332

27- ایضاً، ص 334

28- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر، (ایضاً) ص 21

29- پروفیسر خلیل صدیقی، "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 335

30- ایضاً، ص 335

31- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات لغات اردو (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 55

32- پروفیسر خلیل صدیقی "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 336

33- ایضاً، ص 336

34- ایضاً، ص 337، 338

35- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر، (ایضاً) ص 26

36- پروفیسر خلیل صدیقی، "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 338

37- مولوی عبدالحق ، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 36

38- ایضاً ، ص 37

39- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ، کتابیات لغات اردو (ایضاً) ص 12

40- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 339

41- ایضاً ، ص 339

42- مولوی عبدالحق ، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 37

43- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ، کتابیات لغات اردو (ایضاً) ص 16

44- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 339

45- مولوی عبدالحق ، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 37

46- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 340

47- فرھنگ اثر کے دونوں حصے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام " کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ " (1987ء) جلدچہارم میں شامل ھیں۔

48- مولوی عبدالحق ، مقدمہ، لغت کبیر، (ایضاً) ص 38

49- ایضاً ، ص 38

50- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 340

51- مولوی عبدالحق ، مقدمہ، لغت کبیر، (ایضاً) ص

52- مسعود هاشمی " اردو لغات کا تنقیدی جائزہ " لغت نویسی کے مسائل ، (نئی دھلی ، ماھنامہ کتاب نما ، 1985ء) ص 151، 152

53- ایضاً ، ص 152

54- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 341

55- ایضاً ، ص 340، 333

56- جابر علی سیّد " کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ " (جلداوّل) (اسلام آباد ، مقتدرہ

57- وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 19

58- جامی علی سعد، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" (جلد اوّل) (ایضاً) ص 115

59- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 341

60- خط، ڈاکٹر فیلن، مورخہ 23 اپریل 1878ء بجواب استفسار انسپکٹر جنرل ممالک مغربی و شمالی و اودھ، مورخہ 23 فروری 1878ء، بحوالہ " فرہنگ آصفیہ " جلد چہارم ص 841، بحوالہ پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی (" مشمولہ لسانی مباحث، (ایضاً) ص 342

61- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 39، 40، 41

62- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث، (ایضاً) ص 343

63- ایضاً، ص 344

64- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر (ایضاً) ص 41

65- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کتابیات لغات اردو، (ایضاً) ص

66- پروفیسر خلیل صدیقی " لغت نویسی " مشمولہ لسانی مباحث (ایضاً) ص 344

67- مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی " نوراللغات کا ناقدانہ جائزہ" مشمولہ " فرہنگ اثر" مشمولہ کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد چہارم) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان) ص 98

68- وارث سرہندی، مقدمہ، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" (جلد ششم) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1987ء) ص 11

69- مولوی عبدالحق، مقدمہ لغت کبیر، (ایضاً) ص 43، 44

70- وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم) (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1986ء) ص 335 تا 338

71- مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم، " تاریخ تدوین پر خلاصہ بیان " مشمولہ لغت کبیر، (جلد دوم حصہ اوّل) (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1977ء) ص 5

72- ایضاً، ص 7

73- پروفیسر خلیل صدیقی "لغت نویسی" مشمولہ لسانی مباحث، (ایضاً) ص 346

کتابیات

1- آرزو لکھنوی، سید انور حسین — نظام اردو — یونائیٹڈ پریس، لکھنو 1979ء

2- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر — جامع القواعد (حصہ صرف) — مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1971ء

3- // — ادب و لسانیات — اردو اکیڈمی، کراچی 1972ء

4- ابو سلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر — کتابیات لغات اردو — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1986ء

5- // — کتابیات قواعد اردو — ایضاً، 1985ء

6- // — کتابیات اردو رسم الخط و دیگر مسائل — ایضاً، 1986ء

7- ابو محمد سحر، ڈاکٹر — زبان اور لغت — مکتبہ ادب، بھوپال 1983ء

8- اثر لکھنوی، جعفر علی خاں، مرزا — کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد چہارم) — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1987ء

9- احتشام حسین — ادب اور سماج — کتب پبلشرز، بمبئی 1948ء

10- // — افکار و مسائل — نسیم بک ڈپو، لکھنو 1963ء

11- احمد دین، بی - اے — سرگذشت الفاظ — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س - ن -

12-	اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	کتابستان، الہ آباد 1960ء
13-	اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر	لسانیات کے بنیادی اصول	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1985ء
14-	//	اردو صرف و نحو	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1985ء
15-	انشا اللہ خاں (مترجم دتاتریہ کیفی)	دریائے لطافت (مرتبہ: مولوی عبد الحق)	انجمن ترقی اردو، کراچی 1988ء
16-	برجموہن دتاتریہ کیفی	کیفیہ	مکتبہ معین الادب، لاہور 1942ء
17-	//	منشورات	ایضاً، ص 1950ء
18-	بنجمن شلزے (مترجم: ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر)	ہندوستانی گرامر	مجلس ترقی ادب، لاہور 1977ء
19-	جابر علی سیّد	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1984ء
20-	جان بیمز (مترجم: احتشام حسین)	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	ادبی دانش محل، لکھنو 1948ء
21-	حبیب اللہ خاں غضنفر	زبان و ادب	غضنفر اکیڈمی، کراچی 1983ء
22-	حکم چند نیر	اردو کے مسائل	ہندو یونیورسٹی، بنارس 1977ء
23-	خلیل بیگ، مرزا، ڈاکٹر	اردو کی لسانی تشکیل	فیصل ولا، سرسید نگر، علی گڑھ 1985ء
24-	//	زبان، اسلوب، اسلوبیات	ادارہ زبان و اسلوب، علی گڑھ 1983ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
25-	خلیل صدیقی ، پروفیسر	زبان کا مطالعہ	قلات پبلشرز ، مستونگ 1964ء
26-	//	زبان کا ارتقاء	ایضاً ، 1977ء
27-	//	زبان کیا ہے	بیکن بکس ، ملتان 1989ء
28-	//	لسانی مباحث	زمرد پبلی کیشنز ، کوئٹہ 1991ء
29-	//	آواز شناسی	بیکن بکس ، ملتان 1993ء
30-	ڈیوڈ کرسٹل (مترجم : ڈاکٹر نصیر احمد خاں)	لسانیات کیا ہے	ترقی اردو بیورو ، نئی دہلی 1988ء
31-	رشید حسن خاں	اردو املا	فکشن ہاؤس ، لاہور 1994ء
32-	سدھیشور ورما	آریائی زبانیں	مکتبہ معین الادب ، لاہور 1960ء
33-	سراج الدین علی خاں آرزو	نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات (مرتبہ : ڈاکٹر سید عبداللہ)	انجمن ترقی اردو پاکستان لاہور 1951ء
34-	سلطان احمد ، مرزا	زبان	مرغوب ایجنسی ، لاہور 1923ء
35-	سہیل بخاری ، ڈاکٹر	اردو کی کہانی	مکتبہ عالیہ ، لاہور 1975ء
36-	//	اردو کا روپ	آزاد بک ڈپو ، لاہور 1971ء
37-	//	معنویات	آزاد بک ڈپو ، سرگودھا 1986ء
38-	//	اردو رسم الخط کے بنیادی مسائل	مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد 1988ء

39- سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1991ء
40- سید سلیمان ندوی	نقوش سلیمانی	مکتبۃ الشرق، کراچی 1951ء
41- سید سلیمان اشرف بہاری	المبین	مکتبہ قادریہ، لاہور 1978ء
42- سید احمد دہلوی	علم اللسان (طبع دوم)	دارالاشاعت، لاہور 1900ء
43- سید احمد دہلوی	فرہنگ آصفیہ	مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1970ء
44- سیدہ جعفر، پروفیسر	ڈاکٹر زور	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی 1990ء
45- شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر	اردو سندھی کے لسانی روابط	نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، 1976ء
46- شکیل الرحمٰن	زبان اور کلچر	شاہین بک اسٹال، سری نگر 1958ء
47- شمس اللہ قادری، سید	اردوئے قدیم	نول کشور، لکھنو 1967ء
48- شوکت سبزواری، ڈاکٹر	اردو زبان کا ارتقاء	پاک کتاب گھر، ڈھاکہ 1956ء
49- //	داستان زبان اردو	انجمن ترقی اردو، کراچی 1960ء
50- //	لسانی مسائل	مکتبہ اسلوب، کراچی 1962ء
51- //	اردو لسانیات	مکتبہ تخلیق ادب، کراچی 1966ء
52- //	اردو قواعد	مکتبہ اسلوب، کراچی 1982ء
53- عبدالحمید خواجہ	جامع اللغات	اردو سائنس بورڈ، لاہور 1989ء

مصنف	کتاب	ناشر
54- عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر	قواعد اردو	انجمن ترقی اردو، کراچی 1951ء
55- //	لغت کبیر	ایضاً، 1977ء
56- عصمت جاوید	نئی اردو قواعد	کمبائنڈ پبلشرز، لاہور 1988ء
57- عین الحق فرید کوٹی	اردو زبان کی قدیم تاریخ	ارسلان پبلی کیشنز، لاہور 1972ء
58- غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر	جامع القواعد (حصہ نحو)	مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1973ء
59- فتح محمد خاں جالندھری	مصباح القواعد	داوش شمپنی اینڈ کمپنی، علی گڑھ 1933ء
60- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اردو املا اور رسم الخط	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1977ء
61- فیلن۔ ایس۔ ڈبلیو۔	نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری	اردو سائنس بورڈ، لاہور (1986)
62- فیروز الدین	فیروز اللغات	فیروز سنز، لاہور 1975ء
63- کے۔ ایس۔ بیدی، ڈاکٹر	تین ہندوستانی زبانیں	انجمن ترقی اردو، دہلی س۔ ن۔
64- گلیسن (جونئر) ایچ۔ اے (مترجم: عتیق صدیقی)	توضیحی لسانیات	
65- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	ادبی تنقید اور اسلوبیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1989ء
66- //	ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1994ء
67- // (مرتبہ)	لغت نویسی کے مسائل	کتاب نما، دہلی 1985ء

مصنف	کتاب	ناشر
68- گیان چند جین، ڈاکٹر	لسانی مطالعے	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1991ء
69- محمد آفتاب احمد ثاقب	اردو قواعد و املا کے بنیادی اصول	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگوئج، اسلام آباد 1994ء
70- محمد حسین آزاد	سخندان فارس	شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور 1950ء
71- //	آب حیات	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س-ن-
72- محمد زین العابدین فرجاد کوتانوی	آئین اردو	نامی بک ڈپو، میرٹھ 1926ء
73- محمد سلیم سعید، پروفیسر	اردو رسم الخط	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1981ء
74- محمد معین الدین دردائی	لسانی مطالعے	مجلس دانش وران، لاہور 1970ء
75- محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی	اردو زبان اور اسالیب	آل پاکستان اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی 1961ء
76- محمود شیرانی، حافظ (مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی)	پنجاب میں اردو	کتب نما، لاہور 1972ء
77- محمود شیرانی، حافظ	مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اوّل، دوم	مجلس ترقی ادب، لاہور 1966ء
78- مسعود حسن رضوی ادیب، سید	اردو زبان اور اس کا رسم الخط	کتاب نگر، لکھنو 1961ء
79- محی الدین قادری زور، ڈاکٹر	ہندوستانی لسانیات	مکتبہ معین الادب، لاہور 1961ء

-80	مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	مقدمہ تاریخ زبان اردو	آزاد کتاب گھر، دہلی 1954ء
-81	//	اردو زبان اور ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1983ء
-82	//	مقالات مسعود	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1989ء
-83	// (مترجم : ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ)	اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 1986ء
-84	مہر عبدالحق، ڈاکٹر	ملتانی زبان اور اردو سے اس کا تعلق	اردو اکادمی، بہاول پور 1967ء
-85	میر امن دہلوی	باغ و بہار	مکتبہ خیابان ادب، لاہور 1982ء
-86	نصیر احمد خاں، ڈاکٹر	اردو لسانیات	اردو محل پبلی کیشنز، دہلی 1990ء
-87	نورالحسن نیر کاکوروی	نور اللغات	نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، 1976ء
-88	نصیرالدین ہاشمی، ڈاکٹر	دکن میں اردو	اردو مرکز، لاہور 1960ء
-89	وحید الدین سلیم، مولوی	وضع اصطلاحات	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، 19[illegible]1ء
-90	ہادی حسین	زبان اور شاعری	مجلس ترقی ادب، لاہور 1984ء
-91	یوسف بخاری، ڈاکٹر	کشمیری زبان اور اردو سے	مرکزی اردو بورڈ، لاہور 1982ء

92- اردو لغت (تاریخی اصول پر) اردو لغت بورڈ

93. Duncon Forbes _ A Grammar of the Hindustani Language _ 1859.

94. Jhon Beams _ Comp_arative Grammar of Modern Indo_Aryan Language _ Dehli _ 1966.

95. Grierson, G.A. 1919. Linguistic Survey of India Vol. viii _ I

جرائد و رسائل

1- ادب لطیف ـ سالنامہ ـ 1953ء

// شمارہ -5 ـ دسمبر 1955ء

2- ادبی دنیا ـ شمارہ -17 ـ نومبر 1965ء

// شمارہ - 21 ـ ستمبر و اکتوبر 1966ء

3- اردو - جولائی 1949ء

// اکتوبر 1949ء

// اپریل 1951ء

// جنوری 1952ء

// اکتوبر 1952ء

// جولائی تا ستمبر 1982ء

4- اخبار اردو - جنوری ، فروری 1994ء

// مارچ ، اپریل 1994ء

5- اردو نامہ - شمارہ - 2 - نومبر 1960ء
// شمارہ - 4 - اپریل تا جون 1961ء
// شمارہ - 5 - جولائی تا ستمبر 1961ء
// شمارہ - 6 - اکتوبر تا دسمبر 1961ء
// شمارہ - 8 - اپریل تا جون 1962ء
// شمارہ-10 - اکتوبر تا دسمبر 1962ء
// شمارہ - 11 - جنوری تا مارچ 1963ء
// شمارہ - 12 - اپریل تا جون 1963ء
// شمارہ - 13 - جولائی تا ستمبر 1963ء
// شمارہ - 14 - اکتوبر تا دسمبر 1963ء
// شمارہ - 15 - جنوری تا مارچ 1964ء
// شمارہ - 16 - اپریل تا جون 1964ء
// شمارہ - 17 - جولائی تا ستمبر 1964ء
// شمارہ - 18 - اکتوبر تا دسمبر 1964ء
// شمارہ - 19 - جنوری تا مارچ 1965ء
// شمارہ - 20 - اپریل تا جون 1965ء
// شمارہ - 21 - جولائی تا ستمبر 1965ء
// شمارہ - 22 - دسمبر 1965ء
// شمارہ - 23 - مارچ 1966ء
// شمارہ - 25 - ستمبر 1966ء
// شمارہ - 26 - دسمبر 1966ء
// شمارہ - 27 - مارچ 1967ء

اردو نامہ - شمارہ - 28 - جون 1967ء

// شمارہ - 29 - اکتوبر 1967ء

// شمارہ - 30 - جنوری 1968ء

// شمارہ - 31 - اپریل تا جون 1968ء

// شمارہ - 32 - جولائی تا ستمبر 1968ء

// شمارہ - 34،33 - جون 1969ء

// شمارہ - 35 - جنوری 1970ء

// شمارہ - 37 - جولائی تا ستمبر 1970ء

// شمارہ - 39 - مئی 1971ء

// شمارہ - 43 - جولائی 1972ء

// شمارہ - 44 - مارچ 1973ء

// شمارہ - 48 - اپریل 1974ء

// شمارہ - 50 - مارچ 1975ء

// شمارہ - 52،51 - دسمبر 1975ء

// شمارہ - 53 - جون 1976ء

6- صحیفہ - شمارہ - 23 - اپریل 1963ء

// شمارہ - 44 - جولائی 1968ء

// شمارہ - 45 - اکتوبر 1968ء

// شمارہ - 51 - اپریل 1970ء

// شمارہ - 52 - جولائی 1970ء

7- نگار - اپریل 1952ء

// جولائی 1952ء

// جون 1953ء تا نومبر 1953ء کے شمارے

// جولائی 1954ء تا دسمبر 1954ء کے شمارے

// مارچ 1955ء تا دسمبر 1955ء کے شمارے

8- نقوش - شمارہ - 98 - جون 1963ء

// شمارہ - 101 - نومبر 1964ء

// شمارہ - 108 - ستمبر 1967ء